وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین

سیرۃ النبی

صلی اللہ علیہ وسلم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے زیادہ مکمل اور مستند و مقبول عام سوانح حیات

علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

مکتبہ مدنیہ

۱۸- اردو بازار - لاہور

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی مکمل اور مستند و مقبول عام سوانح حیات

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

جلد دوم

علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ
علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

نام کتاب ——— سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم
مصنف ——— علامہ شبلی نعمانی و سید سلیمان ندوی
تاریخ طباعت ——— صفر المظفر ۱۴۰۸ھ
تعداد ——— ایک ہزار
پریس ——— آر۔ زیڈ پیکجز، لاہور

فہرست مضامین

سیرت النبیؐ حصہ دوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم مجلّد دوم

سیرت نبوی مجلّد اول ۱۳۳۶ھ (۱۹۱۸ء) میں شائع ہوئی۔ اب مجلّد دوم ۱۳۳۸ھ (۱۹۲۰ء) کے اوسط میں شائع ہوتی ہے۔ شائقین کا تقاضا ہے کہ جلد سے جلد اس کی جلدیں شائع ہوتی رہیں، لیکن شاید اُن مشکلات کا اُن کو علم نہیں جو عالمگیر جنگ نے زندگی کے ہر شعبہ میں پیدا کر دی ہیں۔ گو ایک سال سے زیادہ ہوا کہ جنگ کا عملاً خاتمہ ہو گیا، لیکن باایں ہمہ حقیقت یہ ہے کہ صلح کا آغاز نہیں ہوا اور اس خاتمہ جنگ سے زندگی کے مشکلات میں ذرا کمی نہیں ہوئی۔ جلد اول کے تکلیف دہ تجربہ کے بعد یہ طے کر لیا گیا تھا کہ دوسری جلد خود مطبع معارف میں چھپے گی، لیکن مشکل یہ تھی کہ ہمارے پاس مشین نہ تھی۔ بڑی تلاش و جستجو سے مشین ہاتھ آئی تو کاغذ کا قحط نظر آیا۔ جلد اول میں جن اصناف کے کاغذ لگ چکے تھے ان کا ملنا دشوار ہو گیا۔ دیسی کاغذ کے ۲۰۰ رم بھی بیک وقت نہ مل سکے۔ یہ دقت کسی طرح ختم ہوئی تو لوح (ٹائیٹل پیج) کے کاغذ کی مشکل پڑی۔ لکھنؤ سے لے کر کلکتہ اور بمبئی تک کے کارخانے چھان مارے گئے، مگر خاطر خواہ کاغذ دستیاب نہ ہوا۔ آخر جو بھی مل سکا اور جس طرح بھی بنا یہ جلد اختتام کو پہنچی۔ والحمدُ للہ علیٰ ذالک۔

پہلی جلد نبوت کے پرآشوب عہد غزوات پر مشتمل تھی اور دوسری جلد نبوت کی سہ سالہ امن کی زندگی کی تاریخ ہے۔ نبوت کی بست و سہ سالہ زندگی میں پہلی جلد بیس سال کے کارناموں کا مجموعہ تھی اور یہ جلد بقیہ آخری تین سال کے واقعات کا ذخیرہ ہے اور اس کے بعد اخلاق و شمائل شریفہ اور ازواج مطہرات و اولاد کرام کا تذکرہ ہے۔

مصنف مرحوم کی وفات کے بعد جب اس جلد کا تمام قلمی سرمایہ میرے ہاتھ میں آیا تو مجھے اس میں بہت سے ابواب کی کمی محسوس ہوئی جن کے اضافہ کے بغیر یہ جلد ناتمام نظر آتی تھی، لیکن مصنف کے مسودہ میں اضافہ کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ آخر کار مدت کے حیص بیص کے بعد میں نے طے کر لیا کہ اُن کو لکھنا ہی چاہیئے۔ چند روز کے بعد مجھے اتفاقاً مولانا کے ہاتھ کی ایک یادداشت ملی جو وفات سے پانچ ماہ پیشتر ایک سفینہ میں لکھی تھی۔ اس کا عنوان

یادداشت اخیر تھا۔ اس یادداشت کو پڑھ کر میری مسرت کی انتہا نہ رہی، جب میں نے یہ دیکھا کہ جن ابواب کو میں ضروری سمجھتا تھا مصنف مرحوم نے بھی اپنی آخری یادداشت میں ان کا اضافہ ضروری قرار دیا تھا اور گویا وہ ایک وصیت نامہ تھا جس کو فرشتۂ غیب نے اُن کے دست و قلم سے میری تسلی کے لئے پہلے ہی لکھوا دیا تھا۔

ع حل این عقدہ ہم از روئے نگار آخر شد

اخلاق کے باب کو مصنف مرحوم نے تکمیل کو نہیں پہنچایا تھا، بہت سے عنوانات سادہ تھے۔ بہت سے عنوانات کو شروع کر کے آئندہ اضافہ کے لئے ناتمام بصورت بیاض چھوڑ دیا تھا۔ جامع نے ان کو لکھ کر بطور تکملہ کتاب میں شامل کر دیا۔ بہت سے ضروری حواشی بھی جا بجا بڑھائے گئے ہیں۔ چنانچہ جیسا کہ جلد اول کے دیباچہ میں ذکر کیا گیا ہے اضافہ اور تکملہ اور حواشی کی تمام عبارتیں ہلالین کے اندر کر دی گئی ہیں، تاکہ مصنف اور جامع کی عبارتیں باہم مختلط نہ ہونے پائیں۔

جامع

سید سلیمان ندوی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اسلام کی امن کی زندگی

۹ھ، ۱۰ھ اور ۱۱ھ

قیامِ امن، اشاعتِ اسلام، تاسیسِ خلافت، تکمیلِ شریعت

قیامِ امن[1]

گزشتہ ابواب پڑھ لینے کے بعد یہ حقیقت محتاجِ بیان نہیں رہتی کہ اس وقت گو فطری صلاحیت و استعداد کی رُو سے عرب کا ذرہ ذرہ ستارہ تھا لیکن وہ کسی ایک نظامِ شمسی کے تابع نہ تھا۔ یوں تو تمام جزیرۂ عرب ایک واحد ملک اور ایک متحد قوم تھا تاہم نہ تو کبھی تاریخ نے اس کے مُلکی و قومی اتحاد کا نشان دیا اور نہ سیاسی حیثیت سے کسی زمانہ میں تمام عرب ایک پرچم کے نیچے جمع ہوا، جس طرح گھر گھر کا الگ الگ خدا تھا، اسی طرح قبیلہ قبیلہ کے جدا رئیس تھے، جنوبی عرب میں حمیری اذواء اور اقیال کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں، شمالی عرب میں بکرؔ، تغلبؔ، شیبانؔ، ازدؔ، قضاعہ، کندہؔ، لخمؔ، جذامؔ، بنو حنیفہ، طےؔ، اسدؔ، ہوازنؔ، غطفانؔ، اوسؔ، خزرجؔ، ثقیفؔ اور قریشؔ وغیرہ کی الگ الگ ٹولیاں تھیں، جو دن رات خانہ جنگیوں میں مبتلا رہتی تھیں، بکرؔ و تغلبؔ کی چہل سالہ جنگ کا ابھی ابھی خاتمہ ہوا تھا کندہ اور حضر موت کے قبائل کٹ کٹ کر فنا ہو چکے تھے، اوس و خزرج لڑ لڑ کر اپنے ایک ایک سردار کو کھو چکے تھے خاص حرم اور اشہر حرم میں بنو قیس اور قریش کے درمیان حربِ فجار کا سلسلہ جاری تھا اور اس طرح تمام ملک معرکہ کارزار بنا ہوا تھا، پہاڑوں اور صحراؤں میں خود مختار جرائم پیشہ قبائل آباد تھے، تمام ملک قتل و غارت گری، سفاکی، خونریزی کے خطرات میں گھرا تھا، تمام قبائل غیر مختتم سلسلۂ جنگ کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے، انتقام، ثار، اور خون بہا کی پیاس سینکڑوں اور ہزاروں اشخاص کے قتل کے بعد بھی نہیں بجھتی تھی، مُلک کا ذریعہ معاش غارت گری کے بعد فقط تجارت تھی، لیکن تجارت کے قافلوں کا ایک جگہ سے دوسری جگہ تک گزرنا محال تھا، حیرہ کے عرب بادشاہ اگرچہ شمالی عربستان میں اثر اور اقتدار رکھتے تھے تاہم ان کا تجارتی سامان بھی عکاظ کے بازاروں میں بآسانی پہنچ سکتا تھا، شہورِ حج عملاً عرب کے مقدس مہینے تھے، بایں ہمہ لڑائیوں کے جواز کے لئے وہ کبھی بڑھا اور کبھی گھٹا دیئے

---

[1] پورا باب اضافہ از صفحہ ۱ تا ۱۰۱

جاتے تھے، ابو علی قالی نے کتاب الامالی میں لکھا ہے،

وذالک لانهم كانوا يكرهون ان تتوالى عليهم ثلاثة اشهر لا تمكنهم الاغارة فيها لان معاشهم كان من الاغارة (جلد ا ص ۲)

یہ اس لئے کہ وہ پسند نہیں کرتے تھے کہ تین مہینے متصل ان پر غارت گری کے بغیر گزر جائیں، کیونکہ غارت گری ہی ان کا ذریعہ معاش تھا۔

بہت سے جرائم پیشہ قبائل کے ذریعۂ معاش کے لئے یہی موسم بہار تھا، مکہ کے آس پاس اسلم و غفار وغیرہ قبائل آباد تھے، جو حاجیوں کا اسباب چرانے میں بدنام تھے،[1] طے نہایت ممتاز اور نامور قبیلہ تھا، لیکن دزدان طے بھی اپنی شہرت میں اُن سے کم نہ تھے، سلیک ابن السلکہ اور تابط شراعرب کے مشہور شاعر تھے، لیکن ان کی شاعری کا تمام تر سرمایہ صرف اپنی چوری اور حیلہ گری کے پُرفخر کارنامے تھے۔

ملک میں اضطراب اور بدامنی کا یہ حال تھا کہ عبد القیس جو بحرین کا ایک طاقتور قبیلہ تھا، مُضری قبائل کے ڈر سے اشہرِ حرم کے سوا اور مہینوں میں حجاز کا رُخ نہیں کر سکتا تھا۔[3] فتح مکہ کے بعد بھی جب مُلک میں سکون شروع ہو چکا تھا، مدینہ سے مکہ تک سفر خطرناک تھا اور اب بھی لوگ ڈاکے ڈالتے رہتے تھے۔[4] ہجرت کے پانچ چھ برس کے بعد بھی شام کے تجارتی قافلے دن دہاڑے لُوٹ لئے جاتے تھے۔[5] یہاں تک کہ کبھی کبھی خود دارالاسلام کے چراگاہوں میں بھی چھاپے مارتے جاتے تھے۔[6] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب لوگوں کو مُلک کے امن و امان کی بشارت دیتے تھے کہ ایک زمانہ آئے گا جب حیرہ سے ایک خاتون محمل نشین تنہا سفر کرے گی اور خدا کے سوا کسی کا اُس کو خوف نہ ہو گا تو لوگوں کو تعجب آتا تھا، ۸ھ میں ایک شخص نے آ کر شکایت کی کہ میرا مال ڈاکوؤں نے لوٹ لیا، آپ نے فرمایا کہ "عنقریب وہ زمانہ آئے گا جب مکہ کو قافلہ بے نگہبان جایا کرے گا"[8] اتنے بڑے ملک میں صرف حرم کی سرزمین ایسی تھی جہاں لوگوں کو اطمینان میسر آ سکتا تھا، خدا نے قرآن مجید میں اہل مکہ پر اپنا سب سے بڑا احسان یہی جتایا ہے۔

فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ (ایلاف)

ان کو چاہیئے کہ اُس گھر کے اس مالک کو پوجیں جس نے ان کو بھوک میں کھانا دیا اور بدامنی کو دور کر کے ان کو امن بخشا۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ (عنکبوت)

کیا یہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے ایک امن والا حرم ان کیلئے بنایا اسکے باہر بدامنی کا یہ عالم ہے کہ انکے چاروں طرف سے آدمی اچک لے جاتے ہیں

خود اسلام کا کیا حال تھا؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عام الحزن کے بعد تین برس تک متصل تمام قبائل کے سامنے اپنے آپ کو پیش کرتے رہے کہ مجھے امان میں لے کر صرف اتنا موقع دلا دو کہ خدا کی آواز لوگوں تک پہنچا سکوں لیکن کوئی حامی نہیں بھرتا تھا، تمام مسلمان عرب کی فضا میں سانس تک نہیں لے سکتے تھے، تلاشِ امن کے لئے افریقہ و حبش کے ریگستانوں میں مارے مارے پھرتے تھے جو عرب میں رہ گئے تھے وہ ہدفِ مظالم گوناگوں تھے، قرآن مجید

---

[1] صحیح بخاری ذکر اسلم و غفار [2] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ [3] صحیح بخاری کتاب الایمان [4] ابو داؤد کتاب الادب باب الحذر [5] طبقات ابن سعد جزء مغازی ص ۶۳، ۶۴، ۶۵ [6] دیکھو غزوۂ سویق و غزوۂ غابہ [7] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ [8] بخاری ص ۱۹۰

مسلمانوں کی اسی حالت کا ذکر ان آیتوں میں کرتا ہے

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِى الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ (انفال)

یاد کرو جب تم ملک میں تھوڑے اور کمزور تھے، ڈرتے تھے کہ لوگ تم کو اچک نہ لیں۔

اسی ملکی شورش اور بدامنی کا یہ نتیجہ تھا کہ ملک میں کوئی تحریک بھی بغیر خود حفاظتی فوجی تدبیر کے کامیاب نہیں ہو سکتی تھی، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی فرض اسلام کی دعوت تھی، اس کے لئے تیغ و خنجر اور فوج و لشکر کی حاجت نہ تھی، لیکن ایک طرف تو دشمن پر حملہ کرتے چلے آتے تھے اور دوسری طرف ہر جگہ دعاۃ اسلام کی جانیں معرضِ خطر میں رہتی تھیں، تجارت کے قافلے جن پر اصل میں ملک کی معاش کا دار و مدار تھا غیر مامون تھے، چنانچہ اس قسم کے تفصیلی واقعات غزواتِ نبوی کے اسباب و انواع میں گزر چکے ہیں۔

بیرونی خطرات

بہر حال یہ تو ملک کی اندرونی حالت تھی، بیرونی خطرات بھی کچھ کم نہ تھے، ملک کے تمام سرسبز و زرخیز صوبے روم و فارس دو عظیم الشان طاقتوں کے پنجہ میں تھے، تقریباً ساٹھ برس سے ایرانی یمن، عمان اور بحرین کے مالک بن بیٹھے تھے اور ان کے زیر اقتدار برائے نام عرب رؤسا حکمران تھے، حدودِ عراق میں آلِ منذر کی حکومت کو مٹا کر ایرانیوں نے اندرونِ ملک میں بھی پیش قدمی شروع کر دی تھی، حجاز میں اسلام کی جو تحریک پھیل رہی تھی اس کو بھی وہ اپنے ہی حدود میں سمجھتے تھے، چنانچہ ۶ھ میں شاہ ایران نے یمن کے ایرانی گورنر کو فرمان بھیجا کہ "میرے غلام کو جو حجاز میں مدعی نبوت بنا ہے گرفتار کر کے میرے پاس بھیج دو۔"

رومیوں نے حدودِ شام میں قبضہ کر لیا تھا، آلِ غسان اور چھوٹے چھوٹے عرب رؤسا نے جنھوں نے مدت سے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا ان کی ماتحتی قبول کر لی تھی، ۸ھ کے بعد رومی ان عیسائی رؤسائے عرب کی مدد سے مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کر رہے تھے جس کا ظہور واقعہ تبوک اور موتہ وغیرہ کی صورت میں ہوا۔

یہودیوں کی قوت

رومیوں نے دوسری صدی عیسوی میں یہودیوں سے شام و فلسطین کی برائے نام حکومت بھی چھین لی تھی اور وہ مجبوراً حدودِ شام سے قلبِ حجاز تک پیچھے ہٹ آئے تھے اور اپنے لئے مدینہ سے شام تک متصل قلعے قائم کر لئے تھے، یہ مقامات ان کے جنگی استحکامات بھی تھے اور تجارتی گودام بھی[1] قریظہ، قینقاع، خیبر، فدک، تیما، وادی القریٰ وغیرہ ان کی بڑی بڑی چھاؤنیاں تھیں، قرآن مجید میں حسب ذیل آیات میں یہودیوں کے انہی قلعوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِىْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ (حشر)

وہ قلعہ بند آبادیوں میں یا دھس کے پیچھے چھپے بغیر یوں مل کر مقابلہ نہیں کر سکتے۔

وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ (احزاب)

خدا نے ان یہودیوں کو جنھوں نے ان کی مدد کی تھی، ان کے قلعوں سے اتارا۔

[1] معجم البلدان یاقوت میں ان مقامات کے حالات پڑھو، کتب مغازی و سیر میں ان کے حالات دیکھو، بخاری میں ابواب قتل کعب بن اشرف و رافع بن خدیج۔

زمانۂ قدیم میں مالی کاروبار کی وسعت نے اسپین اور دیگر ممالک یورپ میں ان کو جس طرح ملک کی پالٹکس کا خطرناک عنصر بنا دیا تھا، بعینہٖ یہی حال ان کا عرب میں بھی تھا، ان چند قلعوں کے برتے پر وہ اسلام کی قوت کو بالکل نظر میں نہیں لاتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو متعدد لڑائیاں صرف ان کی شرارت سے لڑنی پڑیں، بدر میں جب مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی تو بہ فخر کہتے تھے "بے چارے مکہ کے قریش لڑنا کیا جانیں، مسلمانوں کو ہمارے قلعوں سے مقابلہ پڑے تو معلوم ہو۔"

غرض عرب کا ملک اس قدر متعدد اور مختلف اندرونی اور بیرونی خطرات میں مبتلا تھا کہ اس کی اصلاح و تدبیر کے لئے عام انسانی دست و بازو بے کار تھے، خدا کا غیر مرئی ہاتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آستین میں پوشیدہ تھا وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى۔ ہجرت کے بعد آٹھ برس کی متواتر کوششوں اور پیہم اصلاحات کا یہ نتیجہ ہوا کہ محال نے امکان بلکہ واقعہ کی صورت اختیار کر لی، عرب کے سیاسی ضعف کا تمام تر راز نا اتفاقی اور باہمی جنگ و جدال میں مضمر تھا اور اس نا اتفاقی اور خانہ جنگی کا سبب صرف یہ تھا کہ تمام عرب مختلف خاندانوں اور نسلوں میں منقسم تھا، تمام ملک کے اجتماع اور اتحاد کے لئے ان میں کوئی مستحکم رشتہ موجود نہ تھا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام عرب کی شیرازہ بندی کے لئے اسلام کا رشتہ قائم کیا اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (حجرات) اور دفعۃً اس روحانی رشتہ نے خون، قرابت اور نسل کے تار و پود ادھیڑ دیئے اور صرف ایک کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی برقی رو اب تمام عرب کی اتحادی روح کو حرکت دے رہی ہے، خدائے پاک نے قرآن مجید میں اس اجتماع اور اتحاد کے وجود کو اپنی مخصوص نعمت فرمایا۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا (آل عمران)

خدا کے اس احسان کو یاد کرو کہ تم باہم ایک دوسرے کے دشمن تھے، خدا نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا پھر اس کے لطف و محبت سے بھائی بھائی بن گئے۔

خدا نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا کہ محمد! یہ تیرا کام نہ تھا، اس میں خود خداوند مقلب القلوب کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔

هُوَ الَّذِىْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (انفال-۸)

وہ خدا ہی ہے جس نے محمد! اپنی نصرت اور مسلمانوں کے ذریعہ تجھ کو قوت بخشی اور اسی نے مسلمانوں کے دل باہم جوڑ دیئے اگر تم تمام دنیا کے خزانے بھی لٹا دیتے تو بھی ان کے دلوں کو نہ جوڑ سکتے لیکن خدا نے ان کے دل باہم جوڑ دیئے وہ زبردست حکمت والا ہے۔

ہجرت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار کے درمیان جو مواخاۃ اور برادری قائم کرائی تھی وہ اس سلسلہ کی پہلی کڑی تھی اور اس کی آخری کڑی وہ خطبہ تھا جو فتح مکہ کے موقع پر دیا گیا، قرآن مجید نے اپنے متواتر ارشادات میں فتنہ و فساد فی الارض کو مکروہ ترین فعل انسانی قرار دیا اور اس فعل کے مرتکب کے لئے سخت سزائیں مقرر کیں، چوری کے لئے قطع ید کی سزا متعین کی، رہزنی کے لئے قتل، پھانسی، قطع ید اور جلا وطنی کی تعزیر

جاری کیں، سورۂ مائدہ میں خون ریزی اور قتل و سفاکی کے انسداد کے لئے قصاص کا قانون نازل ہوا، عملاً ملک میں قیامِ امن کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد بار فوجیں بھیجیں، رہزن قبائل پر چھاپے مارے، حجاز میں جن قبائل کا پیشہ چوری تھا وہ تائب ہو کر مسلمان ہو گئے[۱]۔ فوجداری اور دیوانی کے مقدمات کے فیصلے کے لئے قوانین وضع ہوئے اور جا بجا عمال کا تقرر ہوا۔

لیکن یہ سب جو کچھ ہوا وہ انسانوں کی ظاہری فطرت کی پابندی تھی، ورنہ ایک پیغمبر کا فرض ایک مقنن اور ایک عام مدبر کے فرائض سے بدرجہا بلند ہے۔ اسلام کے قانونِ تعزیرات نے جو کچھ کام کیا، قرآن کا روحانی اثر اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا فیضِ تلقین اس سے پہلے فردِ قرارداد جرم کی دفعات کو بالکل مٹا دیتا تھا۔ قانون و خوفِ تعزیر صرف بازاروں میں اور انسانوں کے عام مجمعوں میں جرائم سے باز رکھ سکتا ہے لیکن دعوتِ اسلام کے فیضِ اثر نے دلوں کو بالکل خدا کے سامنے کر دیا جو رات کی تاریکیوں میں بھی دیکھتا تھا اور مقفل دروازوں کی کھڑکیوں سے بھی جھانکتا تھا اور اب یہ تمام ملک میں امن و امان تھا اور یہ عدی بن حاتم نے شہادت دی کہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق لوگ صنعاء سے حجاز تک تنِ تنہا سفر کرتے تھے اور خشیت الٰہی کے سوا کوئی اور خوف راستہ میں نہ تھا[۲]۔ ایک یورپین مورخ نے جس کے قلم نے پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدح کے لئے بہت کم جنبش کی ہے (مارگولیوس) وہ بھی ان الفاظ میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے۔

"محمد کی وفات کے وقت اُن کا سیاسی کام غیر مکمل نہیں رہ گیا تھا، آپ ایک سلطنت کی جس کا ایک سیاسی و مذہبی دار السلطنت مقرر کیا گیا تھا بنیاد ڈال چکے تھے۔ آپ نے عرب کے منتشر قبائل کو ایک قوم بنا دیا تھا، آپ نے عرب کو ایک مشترک مذہب عطا کیا اور ان میں ایک ایسا رشتہ قائم کیا جو خاندانی رشتوں سے زیادہ مستحکم اور مستقل تھا[۳]۔"

بیرونی خطرات کے انسداد کے لئے خدا نے عجیب و غریب سامان پیدا کر دیئے۔ قریش اور منافقین مدینہ کے اشتعال سے یہودیوں نے اسلام کو پامال کرنا چاہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود چور ہو گئے، ۳ھ سے لے کر ۷ھ تک متواتر لڑائیاں پیش آئیں اور آخر فتح خیبر پر اُن کی سیاسی قوت کا خاتمہ ہو گیا، رومیوں نے اور حدودِ شام کے عیسائی عربوں نے اسلام کے استیصال کا بیڑہ اٹھایا، عیسائی رؤسائے عرب میں سب سے زیادہ طاقت ور اور پُر زور غسانی تھے جو رومیوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح کام کرتے تھے، بہرا، وائل، بکر، لخم، جذام، عاملہ وغیرہ عرب قبائل اُن کے ماتحت تھے، ان کے علاوہ دومۃ الجندل، ایلہ، جرباء، اذرح، تبالہ اور جرش وغیرہ کے چھوٹے چھوٹے عیسائی او یہودی رئیس تھے، غسانیوں کے حملہ کی ابتداء جس طرح ہوئی وہ اوپر گزر چکا ہے، حارثؓ بن عمیر جو شاہ بصریٰ کے دربار میں دعوتِ اسلام کا خط لے کر گئے تھے اُن کو غسانیوں نے راستہ میں قتل کر دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ہزار مسلمانوں کا ایک دستہ تادیب و انتقام کے لئے روانہ فرمایا، غسانی ایک لاکھ کا ٹڈی دل لے کر میدان میں

۱ دیکھو غزوات نبوی پر دوبارہ نظر۔ ۲ صحیح بخاری ذکر غفار و اسلم۔ ۳ صحیح بخاری۔
۴ لائف آف محمد، مارگولیوس ص ۱۰۴۔

آئے اور خبر تھی کہ رومی بھی اسی قدر فوج لئے ہوئے موقع سے قریب مواب میں پڑے ہیں، تاہم مٹھی بھر مسلمان آدمیوں کے اس جنگل سے نہ ڈرے اور کچھ عزیز جانیں کھو کر فوج کو میدانِ جنگ سے ہٹا لائے۔ اس جنگ کا نام غزوہ موتہ ہے۔

اس کے بعد ۹ھ میں غزوہ تبوک پیش آیا۔ دم بدم خبریں آتی رہتی تھیں کہ رومی حملہ آوری کے لئے عیسائی عربوں کی ایک فوجِ گراں ترتیب دے رہے ہیں اور ایک سال کی پیشگی تنخواہ بھی فوج کو تقسیم کر چکے ہیں۔ یہ بھی خبر تھی کہ غسانی فوج کی آراستگی میں مصروف ہیں اور گھوڑوں کی نعلبندی بھی کر رہے ہیں۔ اس بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تیس ہزار صحابہ کے ساتھ پیش قدمی فرمائی اور بیس دن تک دشمنوں کی آمد کا انتظار کرتے رہے، لیکن کوئی مقابل نہ آیا، تاہم اس پیش قدمی کا فائدہ یہ ہوا کہ غسانیوں کے علاوہ تمام رؤسا نے رومیوں کو چھوڑ کر اسلام کی حمایت قبول کر لی[۱]۔ ۱۱ھ میں زمانہ مرض الموت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسامہ بن زیدؓ کے زیر افسری رومیوں کے مقابلہ کے لئے پھر فوجیں روانہ فرمائیں لیکن اس مہم کا اختتام عہدِ صدیقی میں ہوا۔

ایرانیوں کی حکومت زندگی کے آخری دور کو پہنچ چکی تھی۔ ۸ھ میں دعاۃِ اسلام کے پہنچنے کے ساتھ ہی بے مقابلہ و جنگ یمن، عمان اور بحرین میں اُن کی قبائے حکومت کا تار تار الگ ہو گیا۔

غرض نو دس برس کی متواتر اور پیہم کوششوں سے اور مافوقِ طاقتِ بشری، تائیدات کے جب سے اب تمام ملک میں امن و امان قائم ہو گیا، قریش اور یہود کی سازشوں کا طلسم ٹوٹ گیا۔ قبائل کی خانہ جنگیاں مٹ گئیں، تمام رہزن اور ڈاکو جتھے رام ہو گئے۔ بیرونی خطرات کا انسداد ہو گیا، اب موقع ملا کہ صلح و آشتی کے ساتھ حسبِ فرمانِ الٰہی اصل مقصود کی طرف توجہ کی جائے۔

*

۱ اوپر کے تمام واقعات کی تفصیل اور حوالے غزوۂ موتہ اور تبوک کے ذکر میں گزر چکے ہیں۔

تبلیغ و اشاعتِ اسلام

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی کام تمام عالم میں دعوتِ اسلام کا اعلان کرنا تھا اور نہ صرف اعلان بلکہ ہر قسم کے جائز اور صحیح وسائل سے تمام عالم کو حلقۂ اسلام میں لانا تھا، اس کے لئے تیغ و خنجر اور فوج و عسکر کی ضرورت نہ تھی، بلکہ صرف اس قدر کافی تھا کہ دعوتِ حق کی صدا اطرافِ عالم میں پہنچ جانے پائے، لیکن مکہ میں تیرہ برس تک اعدائے اسلام اسی کے سدِّراہ رہے، حج کے موقع پر عرب کے تمام قبائل دور دراز مقامات سے آتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایک کے پاس جاتے اور صرف یہ درخواست کرتے کہ قریش مجھ کو پیغام پہنچانے سے روکتے ہیں تم اس کا موقع دلا دو اور خود دو، لیکن قریش کے اثر سے ہزاروں لاکھوں میں سے ایک بھی اس کی حامی نہیں بھرتا تھا۔ تاہم آفتابِ حق کی کرنیں ان کثیف بادلوں میں سے بھی چھن چھن کر سطحِ قلوب پر پڑتی تھیں اور اکناف و حوالی کو روشن کرتی جاتی تھیں، اسلام کو صرف اشتہار اور اعلان کی ضرورت تھی اور یہ کام خود اعدائے اسلام نے انجام دیا، جب حج کا زمانہ آتا تو رؤسائے قریش عام گزرگاہوں پر خیمے لگاتے باہر کے لوگ اُن سے ملنے آتے، اور چونکہ بعثتِ نبوی کا چرچا پھیل چکا تھا، لوگ اس کی حقیقت دریافت کرتے اور نہ کرتے تو قریش خود حفظِ ماتقدم کے لئے اُن سے کہتے کہ ہمارے شہر میں ایک بدعقیدہ پیدا ہوا ہے جو ہمارے معبودوں کی توہین کرتا ہے، یہاں تک کہ لات و عزیٰ تک کو بُرا کہتا ہے۔

بدعقیدہ کو عربی میں "صابی" کہتے ہیں، اسی مناسبت سے یا اس وجہ سے کہ اسلام کے بعض فرائض مثلاً نماز کی صورت، صابئین کے اعمال سے ملتے جلتے ہیں۔ قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ کو صابی کا لقب دیا تھا اور بالآخر اس لقب سے تمام عرب میں آپ کا نام مشہور ہو گیا[۱]۔ صحیح بخاری کتاب المغازی میں ایک صحابی سے روایت ہے کہ میں جب چھوٹا تھا تو مکہ کے آنے جانے والوں سے سُنا کرتا تھا کہ مکہ میں ایک مدعی نبوت پیدا ہوا ہے۔ ملک میں جب آپ کا نام مشہور ہوا تو اگرچہ جمہور عام پر مخالف اثر پڑا اور اُن میں سے کسی شخص نے آپ کی طرف رُخ نہیں کیا، لیکن اتنا بڑا وسیع ملک اُن لوگوں سے خالی نہیں ہو سکتا تھا جن کو یہ شوق پیدا ہو کہ اصل واقعہ کیا ہے؟ عرب میں ایسے لوگوں کی خاصی جماعت پیدا ہو گئی تھی جو بُت پرستی سے متنفر ہو چکے تھے اور حق کے متجسس تھے، بعض لوگ اس حد سے ترقی کر کے حنفی بن گئے تھے جن کا تذکرہ آغازِ کتاب میں گزر چکا ہے، حافظ ابن حجر نے اصابہ میں متعدد ایسے صحابہ کا ذکر کیا ہے جو یمن وغیرہ دُور دراز مقامات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تحقیقِ حال کے لئے مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور مخفی طور سے اسلام لا کر واپس گئے، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ (یمنی) اور طفیل بن عمرو دوسی (یمنی) کے خاندان میں جو اسلام پھیلا اُس کی

[۱] صحیح بخاری کتاب التیمم [۲] کتاب المغازی ص ۶۱۵ [۳] اضافہ تا قصہ ابو ذرؓ

ابتداء قیامِ مکہ ہی کے زمانہ میں ہوئی تھی۔

طفیل بن عمرو کا اسلام

طفیل بن عمرو دوسی عرب کا مشہور شاعر تھا اور چونکہ عرب میں شعراء کا اثر بہت تھا یعنی وہ قبیلہ کے قبیلہ کو جدھر چاہتے تھے اُدھر کر دیتے تھے، اس لئے قریش نے کوشش کی کہ وہ کسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نہ پہنچنے پائے، لیکن ایک دفعہ جب اُس نے اتفاقیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید پڑھتے سُنا تو وہ فوراً مسلمان ہو گیا[۱] اور اس کے اسی زمانہ میں قبیلۂ دوس میں بھی اسلام پھیلنے لگا، تاہم عام قبیلے نے طفیل کی دعوت قبول نہ کی، وہ رنجیدہ ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کی کہ یا رسول اللہ! دوس نے نافرمانی کی اُن پر بد دعا کیجئے۔ آپ نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی کہ خدایا دوس کو ہدایت دے اور ان کو بھیج۔ اس کے بعد سارا قبیلہ مسلمان ہو گیا[۲]۔

عمروؓ بن عنبسہ کا اسلام

عمروؓ بن عنبسہ سلمی بھی انہی بزرگوں میں ہیں جنھوں نے لوگوں کی زبانی یہ سُن کر کہ مکہ میں ایک شخص پیدا ہوا ہے جو بہت سی باتیں بتاتا ہے، مشتاقانہ مکہ آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت قریش کے مظالم کی بناء پر چھپے رہتے تھے، عمروؓ بن عنبسہ کسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ گئے اور عرض کی کہ آپ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا "میں پیغمبر ہوں" انھوں نے کہا "پیغمبر کس کو کہتے ہیں؟" آپ نے فرمایا "خدا نے مجھے بھیجا ہے" انھوں نے پھر پوچھا "کیا پیغام دے کر بھیجا ہے؟" ارشاد فرمایا "مجھے خدا نے یہ پیغام دے کر بھیجا ہے کہ قرابت کا حق ادا کیا جائے، بُت توڑ دیئے جائیں، خدا کو ایک مانا جائے اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرایا جائے، عمرو نے پوچھا "اس مذہب کے کتنے پیرو ہیں؟" آپ نے فرمایا "ایک آزاد (ابو بکرؓ) اور ایک غلام (بلالؓ)" عمرو نے کہا "میں بھی آپ کی پیروی کرتا ہوں" ارشاد ہوا کہ ابھی تو یہ ممکن نہیں، تم دیکھتے ہو کہ میں کس حال میں ہوں اور لوگوں کا کیا حال ہے، میری کامیابی کا جب حال سنو تو میرے پاس آ جانا، چنانچہ عمرو واپس گئے اور ہجرت کے بعد جب لوگوں کی زبانی آپ کی کامیابی کا حال معلوم ہوا تو حاضرِ خدمت ہوئے[۳]۔

ضماد بن ثعلبہ کا اسلام

ضمادؓ بن ثعلبہ قبیلۂ ازد شنوءہ کے رئیس اور آپ کے زمانہ جاہلیت کے دوست تھے، وہ مکہ آئے تو سُنا کہ محمدؐ کو جنون ہو گیا ہے۔ وہ جھاڑ پھونک بھی کرتے تھے وہ آپ کے پاس آئے کہ لاؤ میں تمہارا علاج کر دوں۔ آپ نے فرمایا: الحمد للّٰہ نحمدہٗ ونستعینہٗ من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ واشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لا شریک لہٗ واشھد ان محمدًا عبدہٗ ورسولہ۔ ان فقروں نے ضماد پر غیر معمولی اثر کیا، عرض کی دوبارہ ارشاد فرمائیے۔ آپ نے پھر اعادہ فرمایا، ضماد نے پھر تیسری بار پڑھوایا۔ اب وہ بالکل مسحور تھے، بولے کہ میں نے کاہنوں کی باتیں، جادوگروں کے منتر اور شاعروں کے قصائد سُنے ہیں لیکن ایسا

[۱] زرقانی [۲] صحیح مسلم کتاب الایمان سے یہ مفہوم ہوتا ہے [۳] صحیح بخاری باب قصہ دوس [۴] صحیح مسلم باب الاوقات التی نہی عن الصلوٰۃ فیہا [۵] صحیح مسلم باب تخفیف الصلوٰۃ والخطبہ۔

کلام میں نے نہیں سنا، یہ تو دریا کی تہہ تک میں بھی اُتر کر جاتے گا، لائیے ہاتھ لائیے میں اسلام پر بیعت کرتا ہوں۔ آپؐ نے اُن سے بیعت لی۔

قبیلۂ ازد کا اسلام

پھر فرمایا، اپنے پورے قبیلہ کی طرف سے بھی بیعت کر لو۔ چنانچہ انھوں نے پورے قبیلہ کی طرف سے بیعت کر لی اور وہ ان کی دعوت سے مسلمان ہوگیا۔ ایک دفعہ ایک لڑائی میں مسلمان سپاہیوں کا اُدھر سے گزر ہوا تو افسر نے پوچھا کسی نے اس قبیلہ کی کوئی چیز لی ہے۔ ایک سپاہی نے کہا ایک لوٹا میرے پاس ہے اس نے حکم دیا کہ واپس کر دو۔

حضرت ابوذر کا اسلام

حضرت ابوذرؓ کا واقعہ اس موقع پر خاص طرح پر ذکر کے قابل ہے۔
غفار کا قبیلہ جو قریش کی شامی تجارت کے راستہ میں آباد تھا جب وہاں یہ چرچا پھیلا تو حضرت ابوذرؓ جو بُت پرستی سے متنفر ہو چکے تھے اور حق کی تلاش میں تھے، انھوں نے اپنے بھائی (انیس) سے کہا کہ تم مکہ جاؤ اور دیکھو کہ یہ شخص جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اس کی تعلیم اور تلقین کیا ہے؟ انیس مکہ آئے واپس جا کر بیان کیا کہ وہ مکارمِ اخلاق کی تعلیم دیتا ہے اور جو کلام پیش کرتا ہے وہ شاعری سے الگ ہے۔ حضرت ابوذرؓ کو اس مختصر سے جواب سے تسکین نہیں ہوئی، خود گئے، زادِ سفر کے لئے مشک میں پانی اور کچھ کھانے کو لے لیا، مکہ میں آئے تو ڈر کے مارے کسی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام پوچھ نہیں سکتے تھے۔ حرم میں حضرت علیؓ سے ملاقات ہوگئی، انھوں نے گھر پر لاکر مہمان رکھا لیکن تین دن تک اُن سے بھی کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ بالآخر خود حضرت علیؓ نے پوچھا کہ یہاں آنے کی کیا غرض ہے؟ انھوں نے ڈرتے ڈرتے بتایا لیکن پھر قول و اقرار لے لیا کہ کسی پر راز ظاہر نہ ہونے پائے۔ حضرت علیؓ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے اور آپؐ نے اسلام کی تلقین کی اور فرمایا کہ اس وقت گھر واپس جاؤ۔ پھر میں جو کچھ کہلا بھیجوں گا اس کی تعمیل کرنا، لیکن ان کو اسلام کا جوش تھا، عرض کی کہ میں تو اسلام کا اعلان کر کے رہوں گا۔ غرض حرم میں آئے اور زور سے پکارے کہ اشهد ان لا اله الا الله و اشهد ان محمدا رسول الله۔ اس آواز کا سننا تھا کہ لوگ چاروں طرف سے دوڑ پڑے اور اُن کو مارنا شروع کیا۔ حضرت عباسؓ نے آکر بچایا اور لوگوں سے کہا۔ تم یہ نہیں سمجھتے کہ تمہاری تجارت کا راستہ غفار کی آبادی سے ہو کر گزرتا ہے اور یہ اسی قبیلہ کے آدمی ہیں۔ اس وقت لوگوں نے چھوڑ دیا، لیکن دوسرے دن حضرت ابوذرؓ نے حرم میں جاکر پھر اسی طریقہ سے اسلام کا اعلان کیا اور نتیجہ بھی وہی ہوا جو کل ہو چکا تھا۔ آج بھی اتفاق سے حضرت عباسؓ آگئے اور انھوں نے جان بچائی۔[1]

قبیلۂ غفار کا اسلام

حضرت ابوذرؓ مکہ سے جب واپس گئے اور اپنے قبیلہ کو اسلام کی دعوت دی تو آدھا قبیلہ اسی وقت مسلمان ہوگیا۔ بقیہ آدمیوں نے کہا کہ ہم اس وقت اسلام کا اظہار کریں گے

---

[1] یہ روایت تمام صحیح بخاری سے ماخوذ ہے، صحیح مسلم میں یہ واقعہ جس طرح منقول ہے اس میں بہت سی باتیں اس سے زائد ہیں مختلف ہیں، حافظ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں کہ ان دونوں روایتوں میں تطبیق ممکن ہے۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں آجائیں۔ چنانچہ جب آپؐ مدینہ میں تشریف لائے تو باقی آبادی بھی مسلمان ہوگئی۔[1]

قبیلۂ اسلم کا اسلام

غفار سے قریب اسلم کا قبیلہ آباد تھا اور دونوں قبیلوں میں قدیم تعلقات تھے۔ غفار کے اثر سے انہوں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ (حالانکہ یہ دونوں قبیلے اسلام سے پہلے چوری میں بدنام تھے اور ان کو معلوم تھا کہ اسلام اس فعلِ شنیع کا دشمن ہے)

اوس و خزرج کا اسلام

موسمِ حج میں عرب کے اکثر قبائل کا اجتماع ہو جاتا تھا۔ آپؐ اس موقع پر ایک ایک قبیلہ کے قیام گاہ پر جاتے اور اسلام کی دعوت دیتے تھے۔ چنانچہ مدینہ کے قبائل اوس و خزرج کی معتدبہ جماعت نے اسی موقع پر اسلام قبول کیا۔

قیامِ مدینہ میں اشاعتِ اسلام

اس کے بعد جب حضرت مصعبؓ بن عمیر داعیِ اسلام بنا کر مدینہ منورہ بھیجے گئے تو اُن کے فیضِ تلقین سے چند ہی مہینوں میں دو گھرانوں کے سوا بقیہ تمام گھرانے مسلمان ہوگئے۔ ہجرت کے بعد جب آپؐ مدینہ تشریف لائے تو آس پاس کے قبائل میں جیسا کہ اوپر گزرا غفار و اسلم نے اسلام قبول کر لیا۔

بدر کے بعض قریشیوں کا اسلام

کچھ ہی دنوں کے بعد بدر کا معرکہ پیش آیا جس میں قریش کو شکست ہوئی اور ستر اشخاص مسلمانوں کے ہاتھ میں قید ہوئے۔ ان قیدیوں کی رہائی کے لئے قریش نے مدینہ میں آمد و رفت شروع کی۔ اس تقریب سے لوگوں کو مسلمانوں سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوا اور اس اثر سے متعدد اشخاص مسلمان ہوگئے۔

(ان میں) بہت سے لوگ ایسے تھے کہ اتفاقیہ اُن کے کانوں میں قرآن مجید کی آواز پڑ گئی اور باوجود سخت عداوت کے اُن کا دل پتھر سے موم بن گیا۔ جبیر بن مطعم بدر کے قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑانے کے لئے آئے تھے اور قیدیوں کے ساتھ اسیر تھے۔ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ آیتیں پڑھ رہے تھے۔

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخَالِقُوْنَ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ (طور ۲۰)	کیا یہ یوں ہی آپ سے آپ پیدا ہوگئے یا ان لوگوں نے خود اپنے آپ کو پیدا کیا، یا ان لوگوں نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا بلکہ یہ بات ہے کہ ان کو یقین نہیں ہے۔

جبیر بن مطعم کا اسلام

جبیر بن مطعم نے یہ آیتیں سن لیں تو ان کا بیان ہے کہ مجھ کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ میرا دل پرواز کر گیا، صحیح بخاری سورۂ طور میں یہ واقعہ مذکور ہے۔

(مکہ میں روم و فارس کی جنگ کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پیشین گوئی فرمائی تھی وہ ٹھیک فتح بدر کے موقع پر پوری اتری اور قرآن مجید کی پیشین گوئی کے مطابق سات برس کے بعد رومیوں نے فارس پر فتح کُلی پائی۔ اس عظیم الشان معجزہ کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک خلق کثیر نے اسلام کی صداقت کا اقرار کیا)

---

[1] صحیح مسلم اسلام ابی ذرؓ، [2] صحیح بخاری ذکر اسلم و غفارؓ (...) بحوالہ سابق۔

پیشین گوئی روم کا اثر غرض اس طرح آپ ہی آپ لیکن نہایت آہستگی اور تدریج کے ساتھ اسلام پھیلتا جاتا تھا ۵ھ میں قریش، کنانہ، غطفان، اسد اور دیگر قبائل نے متحد ہو کر مدینہ پر حملہ کیا اور شکست کھائی۔ اس معرکہ کا نام احزاب ہے جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے۔ اس شکست نے قریش کا عالمگیر اثر کسی قدر کم کیا اور وہ قبائل جو قبولِ اسلام کے لئے آمادہ تھے لیکن قریش کے ڈر سے ان کو اظہارِ اسلام کی جرأت نہیں ہوتی تھی، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں وفود بھیجنے شروع کئے۔

قبیلہ مزینہ کا اسلام سب سے پہلی جو سفارت آئی وہ قبیلہ مزینہ کی تھی جس میں چار سو آدمی شریک تھے انھوں نے یہ بھی خواہش ظاہر کی کہ اگر ارشاد ہو تو ہجرت کر کے مدینہ میں آجائیں، لیکن آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم جہاں رہو، مہاجر ہو۔[1]

قبیلہ اشجع کا اسلام اسی زمانہ میں قبیلہ اشجع کے سفراء جن کی تعداد سو تھی، مدینہ میں آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہم آپ سے لڑنا نہیں چاہتے بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ صلح کا معاہدہ ہو جائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمایا۔ اس وقت تک یہ لوگ کافر ہے۔ لیکن جب صلح ہو چکی تو انھوں نے خود بخود اسلام قبول کر لیا۔[2]

قبیلہ جہینہ کا اسلام جہینہ بھی انہی قبائل کے آس پاس آباد تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اسلام کی دعوت دی اور وہ فوراً ایک ہزار کی جمعیت لے کر مدینہ آئے اور مسلمان ہو گئے اور اس کے بعد وہ اکثر غزوات میں مسلمانوں کے شریکِ حال رہے[3] ہے (غفار، اسلم، مزینہ، اشجع اور جہینہ کی یہی اطاعت اور سابقتِ اسلام تھی جس کی بنا پر آپ نے اُن کے حق میں دعائے خیر فرمائی[4]

صلح حدیبیہ کا اثر صلح حدیبیہ کے زمانہ میں جیسا کہ ہم حدیبیہ کے ذکر میں لکھ آئے ہیں، کفار اور مسلمان نہایت آزادی کے ساتھ آپس میں ملتے جلتے اور اس لئے منکروں کو خلوت وجلوت میں مسلمانوں کی تلقینات کے سننے کا موقع ملا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے پہلے باوجود غزوات اور محاربات کے جس قدر لوگ اسلام لاتے تھے صرف دو برس میں یہ تعداد اس سے اضعافاً مضاعفہ بڑھ گئی، چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ کے سال ادائے عمرہ کے ارادہ سے مدینہ طیبہ سے نکلے تو صرف ڈیڑھ ہزار شخص ساتھ تھے، اب دو برس کے بعد فتح مکہ

---

[1] جزء طبقات ابن سعد متعلق وفود جزءاول قسم ثانی صہ ۳۸ [2] جزء طبقات ابن سعد مذکور صہ ۴۷ [3] اصابہ تذکرہ بشیر بن عرفطہ،
[4] صحیح بخاری ج ۱ اول ذکر غفار واسلم وجہینہ۔ [5] طبری میں امام زہری کا قول ہے۔

فلما کانت الھدنۃ وضعت الحرب اوزارھا وامن الناس کلھم بعضھم بعضا فالتقوا وتفاوضوا فی الحدیث والمنازعۃ فلم یکلم احدٌ بالاسلام یعقل شیئاً الا دخل فیہ فلقد دخل فی تینک السنتین فی الاسلام مثل ماکان فی الاسلام واکثر (صہ ۱۵۵۱)

جب صلح ہو گئی اور جنگ موقوف ہو گئی، ایک دوسرے سے لوگ بے خوف ہو گئے، باہم ملے جلے، باتیں چیتیں ہوئیں تو کوئی عقلمند ایسا نہیں تھا جس سے اسلام کے متعلق گفتگو ہوتی اور اس نے قبول نہ کر لیا چنانچہ جتنے لوگ ابتدا سے اس وقت تک مسلمان ہوئے تھے صرف ان دو برسوں میں اتنے برابر بلکہ ان سے زیادہ تعداد میں لوگ مسلمان ہو گئے۔

کو چلے تو دس ہزار مسلمانوں کا لشکرِ جرار ساتھ تھا۔

صلح حدیبیہ کا اثر اگرچہ تمام عرب پر محیط نہ تھا، کیونکہ اس معاہدہ میں صرف قریش اور کنانہ شریک تھے اس لئے جو لوگ براہِ راست قریش کے زیر اثر یا اُن کے حلیف اور ہم عہد نہ تھے، وہ اب بھی مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کرتے رہتے تھے اور اُن کے دفاع کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ کچھ فوجیں بھیجنی پڑتی تھیں، تاہم جن موقعوں پر امن کا گمان ہوتا تھا وہاں داعیانِ اسلام بھیجے جانے لگے کہ لوگوں کو اسلام کی طرف بلائیں لیکن چونکہ حفاظت خود اختیاری کی غرض سے ان داعیوں کے ساتھ تھوڑی بہت جمعیت بھی ہوتی تھی، اس لئے ارباب سِیَر ان تبلیغی جماعتوں کو بھی سرایا سے تعبیر کرتے ہیں۔

فتح مکہ کا اثر تمام عرب تولیتِ کعبہ کی وجہ سے قریش کو مذہبی رہبر سمجھتا تھا اس لئے وہ انتظار کر رہے تھے کہ قریش کا کیا انجام ہوتا ہے، عمروؓ بن سلمہ ایک صحابی تھے جو مدینہ سے دور ایک گزرگاہِ عام پر رہتے تھے، اُن کے یہ الفاظ صحیح بخاری میں منقول ہیں۔

کانت العرب تلوم باسلامھم الفتح فیقولون اترکوہ وقومہ فانہ ان ظھر علیھم فھو نبی صادق فلما کانت وقعۃ اھل الفتح بادر کل قوم باسلامھم[1]

عرب قریش کے اسلام کا انتظار کرتے تھے، وہ کہتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی قوم (قریش) پر چھوڑ دو، اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان پر غالب آگئے تو بے شبہ وہ سچے پیغمبر ہیں، پس جب مکہ فتح ہوا تو ہر قبیلہ نے اسلام کی طرف پیش دستی کی۔

ابن ہشام نے زیادہ صاف لکھا ہے۔

وانما کانت العرب تربص بالاسلام امر ھذا الحی من قریش وامر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وذلک ان قریشا کانوا امام الناس وھادیھم اھل البیت والحرم وصریح ولد اسمٰعیل بن ابراہیم علیھما السلام وقادۃ العرب لا ینکرون ذلک وکانت قریش ھی التی نصبت الحرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وخلافہ فلما افتتحت مکۃ ودانت لہ قریش ودخلھا الاسلام عرفت العرب انہ لا طاقۃ لھم بحرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولا عداوۃ فدخلوا فی دین اللہ کما قال اللہ عز وجل۔[2]

اور عرب اسلام کے باب میں صرف قریش کا انتظار کر رہے تھے اور وہ یوں کہ قریش تمام ملک کے سردار اور پیشوا اور کعبہ و حرم کے متولی اور حضرت اسماعیل کی خاص اولاد اور عرب کے قائد تھے اور صرف قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے لئے جنگ برپا کی تھی تو جب مکہ فتح ہو گیا اور قریش نے سپر ڈال دی اور اسلام مکہ میں چھا گیا تو عرب کو یقین ہو گیا کہ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگ اور عداوت کی طاقت نہیں ہے تو وہ خدا کے دین میں داخل ہو گئے جیسا کہ اللہ عز وجل نے قرآن میں کہا ہے (یعنی اذا جاء نصر اللہ والفتح)

---

[1] صحیح بخاری فتح مکہ [2] سیرت ابن ہشام ذکر واقعات ۹ھ و وفود ۱۲۔

غرض اسلام کی سچائی اور سادگی اور عرب کی تیز فہمی اور ذہانت کے لحاظ سے اسلام کے پھیلنے میں جو دیر لگی، وہ زیادہ تر قومی اور خاندانی مخالفت کی وجہ سے تھی اب جبکہ باطل کا سنگِ راہ ہٹ گیا تو حق کے آگے بڑھنے میں دیر نہ تھی۔

فتح مکہ کے بعد اب دعوتِ اسلام کے لئے یہ خطرہ نہیں رہا کہ اس کے دعاۃ جہاں جائیں بے دریغ قتل کر دیئے جائیں۔ اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام اطرافِ عرب میں دعاۃ بھیج کر لوگوں کو اسلام کے فضائل و محاسن بتا کر اُن کو اسلام کی ترغیب دلائیں، دعاۃ حسبِ ذیل طریقہ سے مقرر کئے گئے۔

(۱) حفاظتِ خود اختیاری کی غرض سے کسی قدر فوج ساتھ کر دی جاتی تھی کہ ان کو کوئی شخص ضرر نہ پہنچانے پائے اور وہ آزادی سے تبلیغ اسلام کر سکیں، حضرت خالدؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن بھیجا تو فوج بھی ساتھ کر دی، لیکن تاکید تھی کہ بہ جبر پیش نہ آئیں۔ چنانچہ پورے چھ مہینے تک ان کی دعوتِ اسلام پر کسی نے توجہ نہیں کی اور وہ کچھ نہ کر سکے حضرت خالدؓ سپہ سالار اور فاتح تھے، واعظ اور صاحبِ ارشاد نہ تھے۔ اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اب حضرت علیؓ کو بھیجا، انھوں نے قبائل کے سامنے جب اسلام کی تبلیغ کی تو دفعۃً ملک کا ملک مسلمان تھا۔

یہی وہ دعاۃ ہیں جن کو علامہ طبری نے ان لفظوں سے تعبیر کیا ہے۔

قد کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعث فیما حول مکۃ السرایا تدعو الی اللہ عز وجل ولم یامر ھو لقتال۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے اطراف میں کچھ ٹکڑیاں بھیجی تھیں کہ لوگوں کو خدا کی طرف بلائیں لیکن ان کو لڑنے کا حکم نہیں دیا تھا۔

حضرت خالدؓ کو قبیلۂ بنی جذیمہ کے پاس بھی اسی طرح دعوتِ اسلام کے لئے بھیجا تھا لیکن جب انھوں نے کشت و خون کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ کھڑے ہو گئے اور قبلہ رخ دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا خدایا! میں خالد کے فعل سے بری ہوں، پھر حضرت علیؓ کو بھیجا، انھوں نے ایک ایک مقتول کا خون بہا ادا کیا، یہاں تک کہ کتوں کا بھی۔

(۱) اشاعتِ اسلام کی غرض سے جو مسلح جماعت اطرافِ ملک میں بھیجی جاتی تھی، اس میں کبھی کبھی آپ ایک ایک فرد کا امتحان لیتے تھے، ان میں جو صاحب سب سے زیادہ حافظ قرآن ہوتے تھے ان کو اس کا امیر مقرر فرماتے تھے، چنانچہ آپ نے ایک بار اسی قسم کی فوج روانہ کرنا چاہی تو ایک ایک شخص سے قرآن پڑھوا کر سنا، ان لوگوں میں ایک کم سن نوجوان تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے پاس آئے۔ پوچھا تمہیں کیا یاد ہے؟ انھوں نے کہا مجھ کو سورۃ بقرہ اور فلاں فلاں سورتیں یاد ہیں، آپ نے فرمایا تو تم ہی اب سب کے امیر ہو (ترغیب و ترہیب ج ۱ صفحہ ۹۵ بروایت ترمذی)

(۲) جو ممالک زیر اثر آتے تھے اور وہاں زکوٰۃ اور جزیہ کے وصول کرنے کے لئے عمال بھیجے جاتے تھے وہ اکثر اس درجہ کے لوگ ہوتے تھے جن کا تقدس، زہد اور پاکیزگی مسلّم ہوتی تھی، اس کے ساتھ عالم اور واعظ بھی ہوتے تھے اور اس لئے وہ تحصیلِ مال کے ساتھ تبلیغِ اسلام کی خدمت بھی انجام دے سکتے تھے، ان میں سے بعضوں کے نام حسبِ ذیل ہیں۔

---

(۱) اس روایت میں اگرچہ یہ تصریح نہیں ہے کہ یہ فوج اشاعتِ اسلام کے لئے بھیجی گئی تھی صرف یہ الفاظ ہیں۔ بعث بعثا وھم ذوو عدد یعنی آپ نے ایک بہت بڑی جماعت بھیجی۔ تاہم قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصد صرف اشاعتِ اسلام تھا، کیونکہ اگر لڑائی مقصود ہوتی تو پھر حفظِ قرآن کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ آپ ہر ایک سے قرآن پڑھوا کر سنتے)

نام	مقام	کیفیت
مہاجرؓ بن ابی امیہ	صنعاء۔ یمن	حضرت ام سلمہؓ (زوجۂ نبوی) کے بھائی تھے۔
زیادؓ بن لبید	حضرموت	یہ اُن اصحاب میں ہیں جو غزوۂ بدر میں شریک تھے۔
خالدؓ بن سعید	صنعاء۔ یمن	سابقین اوّلین اور مہاجرین حبش میں ہیں سب سے پہلے انہی نے کاغذات پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھا
عدیؓ بن حاتم	قبیلۂ طے (یمن)	مشہور صحابی ہیں، حاتم طائی انہی کا باپ تھا۔
علاؓء بن حضرمی	بحرین	
حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ	زبید و عدن	ان کی دعوتِ اسلام سے قریباً تمام لوگ مسلمان ہو گئے، مشہور صاحبِ علم صحابی ہیں۔
حضرت معاذؓ بن جبل	جند	
جریرؓ بن عبداللہ بجلی	ذوالکلاع حمیری	جریرؓ مشہور صحابی ہیں، ذوالکلاع حمیری یمن کے سلاطین کے خاندان سے تھے ایک موقع پر لاکھ آدمیوں نے ان کو سجدہ کیا تھا، جریرؓ کی دعوت پر یہ اسلام لائے تو اس کی خوشی میں چار ہزار غلام آزاد کئے

(۳) بعض لوگ خاص اشاعتِ اسلام کی غرض سے بھیجے جاتے تھے، تفحص سے اس قسم کی دعاۃ کے نام حسبِ ذیل ہیں

نام	مقام دعوت	نام	مقام دعوت
علیؓ بن ابی طالب	قبیلۂ ہمدان و جذیمہ و مذحج	خالدؓ بن ولید	اطرافِ مکہ
مغیرہؓ بن شعبہ	نجران	عمروؓ بن العاص	عمان
وبرؓ بن نحیس	ابنائے فارس	مہاجر بن ابو امیہ	بطرفِ حارث بن عبد کلال شہزادۂ یمن
محیصہؓ بن مسعود	فدک		
احنف	قبیلۂ سلیم (مسند ج ۵ صفحہ ۲۰۲)		

(۴) رؤسائے قبائل بارگاہِ نبوت میں آ کر مسلمان ہو جاتے تھے اور کچھ روز یہاں قیام کر کے اپنے اپنے قبائل میں دعوتِ اسلام کی غرض سے واپس جاتے تھے۔ ان اشخاص کے نام یہ ہیں۔

نام	مقام	کیفیت
طفیل بن عمرو دوسی	قبیلۂ دوس	
عروہ بن مسعود	ثقیف	
عامر بن شہر	ہمدان	
ضمام بن ثعلبہ	بنو سعد	
منقذ بن حبان	بحرین	
ثمامہ بن اثال	اطرافِ نجد	

(۱) اضافہ ذکر اسلام ابنائے یمن۔

ان مبلغین اور دعاۃ کے اثر سے اسلام ہر جگہ تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا، فتح مکہ کے بعد جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، دعاۃ اطراف مکہ میں بھیج دیئے گئے تھے اور لوگ خوشی خوشی مسلمان ہوتے جاتے تھے۔ قرآن پاک کی یہ آیتیں اسی موقع کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا — جب خدا کی فتح و نصرت آئی اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ فوج در فوج خدا کے مذہب میں داخل ہو رہے ہیں۔

فتح مکہ کے تین مہینے کے بعد ذوالحجہ ۸ھ کے موسم حج میں اعلان برأۃ ہوا۔ اس واقعہ کے بعد بلا استثنا حجاز نے عام طور سے اسلام قبول کرلیا۔[1]

حجاز سے باہر نبوت کے اکیس برس میں صرف قریش اور یہود کی مزاحمت سے اسلام آگے نہ بڑھ سکا اور خال خال مسلمان اِدھر اُدھر نظر آتے تھے۔ لیکن ان دیواروں کا ہٹنا تھا کہ صرف تین برس میں ۸، ۹، ۱۰ھ میں اسلام کا اثر ایک طرف یمن، بحرین، یمامہ، عمان اور دوسری طرف عراق و شام کی حدود تک وسیع ہوگیا۔ یہ عرب کے وہ صوبے ہیں جہاں اسلام سے پہلے عربوں کی بڑی بڑی حکومتیں قائم تھیں اور اس وقت بھی وہ روم و فارس دنیا کی دو عظیم الشان طاقتوں کے زیر سایہ تھیں، تاہم اسلام بغیر تلوار کی رفاقت کے صلح و امن کے سایہ میں اپنی آواز بلند کرتا چلا گیا اور ہر گوشہ سے لبیک کی صدائیں خود بخود آنے لگیں۔

یمن

ملک عرب کے تمام صوبوں میں یمن سب سے زیادہ زرخیز اور سیر حاصل ہے اور نہایت قدیم زمانے سے تمدن و تجارت کا مرکز ہے، سبا اور حمیر کی عظیم الشان حکومتیں یہیں قائم ہوئی تھیں، ولادت نبوی سے تقریباً پچاس برس پہلے ۵۲۵ء میں حبشی عیسائیوں نے یمن پر قبضہ کرلیا تھا، ولادت نبوی کے چند سال بعد اہل ایران یہاں کے مالک بن گئے تھے، اُن کی طرف سے یہاں ایک گورنر ہوتا تھا جو یمن پر حکومت کرتا تھا۔ یمن میں اسلام کی تحریک کے لئے متعدد عوائق موجود تھے، مثلاً اختلاف جنسیت کہ اہل یمن قحطانی تھے، داعی اسلام اسماعیلی، اہل یمن کو اپنے قدیم جاہ و جلال اور تمدن و حکومت پر ناز تھا اور تمام عرب بجا طور سے ان کی پیش روی کو تسلیم کرتا تھا اور تمام عرب میں وہی حکومت کے مستحق سمجھے جاتے تھے۔ ملک میں جہاں کہیں باقاعدہ حکومت تھی وہ نسلاً اسی خاندان سے شمار ہوتی تھی، چنانچہ جب یمن سے قبیلہ کندہ کا وفد آیا ہے جو یمن کا ایک شاہی خاندان تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک عرب فرمانروا سمجھ کر رئیس وفد نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! کیا آپ اور ہم ایک ہی خاندان نہیں؟ آپ نے فرمایا۔ ہم نضر بن کنانہ کے خاندان سے ہیں، نہ اپنی ماں پر تہمت رکھ سکتے ہیں اور نہ اپنے باپ سے انکار کرسکتے ہیں۔[2]

یمن میں اشاعت اسلام کا سب سے بڑا عائق یہ ہوسکتا تھا کہ وہ پولیٹیکل حیثیت سے ایرانیوں کے ماتحت تھے اور باشندے مذہباً علی العموم یہودی یا عیسائی تھے، لیکن قبول حق کے لئے کوئی چیز اُن میں سے مانع نہ آئی یمن میں اسلام کی دعوت ہجرت سے بہت پہلے پہنچ چکی تھی، یمن میں دوس ایک ممتاز قبیلہ تھا۔ اس قبیلہ کا رئیس طفیلؓ بن عمرو اتفاق سے مکہ آیا اور مسلمان ہوگیا، اسی زمانہ میں کندہ کا قبیلہ حج کے لئے مکہ آیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ

۱؎ طبری واقعات ۹ھ ۲؎ ابن حنبل حدیث اشعث بن قیس و زاد المعاد جلد ا صفحہ ۳۲ مصر

وسلم نے اُن کو اسلام کی دعوت دی، لیکن انہوں نے انکار کیا۔[1] ۷ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خیبر میں تشریف فرما تھے۔ دوس کا قبیلہ مسلمان ہو کر دار الاسلام میں منتقل ہوگیا۔ یمن کا ایک مشہور قبیلہ اشعر تھا، وہ بھی مہاجرین حبشہ کی معیت میں اسی زمانہ میں بلا تحریک خود بخود اسلام لایا اور آستانہ نبوت پر حاضر ہوا۔ ابو ہریرہؓ، دوسی اور ابو موسیٰ اشعریؓ ان ہی قبائل کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔

یمن میں ہمدان سب سے بڑا کثیر التعداد اور صاحب اثر خاندان تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۰ھ کے آخر میں اُن کو دعوت اسلام دینے کے لئے حضرت خالدؓ کو بھیجا۔ خالدؓ چھ مہینے تک اُن کو اسلام کی دعوت دیتے رہے، لیکن اُن لوگوں نے قبول نہیں کیا، بالآخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد کو بلا لیا اور حضرت علیؓ کو بھیجا، حضرت علیؓ نے ان لوگوں کو جمع کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک پڑھ کر سُنایا اور ساتھ ہی سارے کا سارا قبیلہ مسلمان تھا، حضرت علیؓ نے جب اس واقعہ کی اطلاع بارگاہ رسالت میں دی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کیا اور سر اٹھا کر دو دفعہ فرمایا السلام علی ہمدان۔[2]

بعض روایتوں میں ہے کہ ہمدان نے جب اسلام کا غلغلہ سُنا تو عامر بن شہر کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا کہ یہ مذہب اگر تم کو پسند آئے تو ہم سب اُس کے قبول کے لئے تیار ہیں اور اگر ناپسندیدہ ٹھہرے تب بھی ہم تمہارے ساتھ ہیں، عامر بن شہر جب دربار رسالت سے واپس آیا تو اس کا دل نور اسلام سے معمور تھا اور ساتھ ہی سارا قبیلہ بھی مسلمان تھا، ممکن ہے کہ یہ دونوں واقعے ہوں اور دونوں کی کوشش سے یہ کامیابی حاصل ہوئی ہو۔

یمن میں حضرت علیؓ سے لوگ مانوس ہوگئے تھے، ربیع الاول ۱۰ھ میں تین سو سواروں کی حفاظت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر اُن کو یمن کے قبیلہ مذحج میں تبلیغ اسلام کے لئے نامزد فرمایا اور ساتھ ہی یہ تاکید فرما دی کہ جب تک وہ حملہ آور نہ ہوں پیش دستی نہ کرنا، حضرت علیؓ جب مذحج کی سرزمین میں پہنچے تو مال گزاری وصول کرنے کے لئے اِدھر اُدھر لوگوں کو متعین کیا۔ اسی اثنا میں قبیلہ مذحج کی ایک جمعیت نظر آئی، حضرت علیؓ نے اُن کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی، لیکن ادھر سے اس احسان کا جواب تیر اور پتھروں کی زبان سے ملا۔ یہ دیکھ کر حضرت علیؓ نے بھی اپنے ساتھیوں کی صف آرائی کی۔ مذحج اپنے بیس آدمی مقتول چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے مسلمانوں نے اُن کا تعاقب نہ کیا کہ اُن کا مقصود صرف مدافعت تھا، اس کے بعد رؤسائے قبیلہ خود حاضر ہوئے اور انہوں نے اسلام قبول کیا اور دوسروں کی طرف سے نیابۃً اسلام کا اعلان کیا۔[3]

۱؎ ابن ہشام ذکر عرض الاسلام علی القبائل، ۲؎ زرقانی بہ سند صحیح از بیہقی (اصل واقعہ بخاری جزء غزوات میں موجود ہے، لیکن ہمدان کی اس میں تخصیص نہیں اور نہ ان کے اسلام کا اس میں ذکر ہے) اس واقعہ کے متعلق اور بھی روایتیں ہیں لیکن وہ صحیح نہیں، چنانچہ وہ خود مواہب لدنیہ نے تسلیم کیا ہے۔ ان روایتوں کا یہ مفہوم ہے کہ ہمدان کے لوگوں نے حضرت علیؓ کے ڈر سے اسلام قبول کرلیا لیکن یہ راویوں کا حسن ظن ہے واقعہ نہیں (ایک روایت میں ہے کہ آپ نے ہمدان کو حکم دیا کہ وہ ثقیف سے ہمیشہ لڑا کریں اور ان پر غارت گری کیا کریں لیکن حافظ ابن قیم نے تصریح کی ہے کہ یہ روایت بالکل غلط ہے، ہمدان یمن کا قبیلہ تھا اور ثقیف مکہ کے پاس طائف میں تھے، یہ حکم تو دو ہمسایہ قبیلوں کو دیا جاسکتا تھا، ۳؎ حضرت علیؓ کی مہم یمن کا واقعہ تمام حدیث کی کتابوں میں مذکور ہے۔ لیکن یہ تفصیل ابن سعد جزء مغازی سے ماخوذ ہے۔

یمن میں فارس کے جو رؤسا قیام پذیر ہو گئے تھے، ان کو ابناء کہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۰ھ میں وبر بن نحلیس کو اُن کے پاس دعوتِ اسلام کے لئے بھیجا، وہ نعمان بن بزرج (بزرگ) کے گھر اُن کے مہمان ہوئے اور فیروز دیلمی، مرکبود، وہب ابن منبہ کے پاس دعوت اسلام کے خطوط بھیجے، سب نے اسلام قبول کیا، صنعا میں سب سے پہلے جس نے قرآن مجید حفظ کیا وہ مرکبود کے صاحبزادے عطاء اور وہب بن منبہ تھے[1]

دعامِ یمن میں تبلیغِ اسلام کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذؓ بن جبل اور ابو موسیٰ اشعریؓ کو نامزد فرمایا، دونوں صاحب یمن کے ایک ایک ضلع میں بھیجے گئے تھے۔ چلتے وقت آپؐ نے ان لوگوں کو جو باتیں تعلیم فرمائیں۔ وہ درحقیقت اسلامی تبلیغ کے اصول ہیں، آپؐ نے فرمایا، سہولت سے کام کرنا، سخت گیری نہ کرنا، لوگوں کو خوشخبری سنانا، نفرت نہ دلانا، دونوں مل کر کام کرنا، تم کو ایسے لوگ ملیں گے جو پہلے سے کوئی مذہب رکھتے ہیں جب اُن کے ہاں پہنچنا تو پہلے اُن کو توحید اور رسالت کی دعوت دینا، جب وہ اس کو تسلیم کر لیں تو کہنا کہ خدا نے تم پر روز و شب میں پانچ وقت کی نماز بھی فرض کی ہے، جب یہ بھی مان لیں تو اُن کو سمجھانا کہ تم پر زکوٰۃ بھی واجب ہے تم میں جو امیر ہوں اُن سے لے کر جو غریب ہیں اُن کو دے دی جائے گی، دیکھو جب وہ زکوٰۃ دینا منظور کر لیں تو چُن کر اچھی اچھی چیزیں نہ لے لینا، مظلوموں کی بددعا سے ڈرتے رہنا کہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے پوچھا یا نبی اللہ! ہمارے ملک یمن میں جَو اور شہد کی شراب بنتی ہے، کیا یہ بھی حرام ہے؟ آپؐ نے فرمایا ہر شے جو نشہ پیدا کرے حرام ہے[2]

نجران (یمن کے پاس ہی نجران کا ضلع ہے، نجران عرب میں عیسائیت کا خاص مرکز تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مغیرہؓ بن شعبہ کو جو صلح حدیبیہ ۶ھ سے پہلے اسلام لا چکے تھے، دعوتِ اسلام کے لئے نجران بھیجا، عیسائیوں نے قرآن پر اعتراضات شروع کئے یہ جواب نہ دے سکے اور واپس چلے آئے[3]۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ اسلام کا ان کو خط لکھا جس میں تحریر تھا، اگر اسلام قبول نہ ہو تو اسلام کی سیاسی اطاعت قبول کرو اور جزیہ دو[4] اہل نجران نے راہبوں اور مذہبی پیشواؤں کی ایک جماعت کو دریافتِ حال کے لئے مدینہ بھیجا، اس وفد کا تفصیلی بیان آگے آئے گا۔

نصاریٰ کے علاوہ نجران میں مشرکین کی بھی کچھ آبادی تھی، ان میں ایک قبیلہ بنو حارث ابن زیاد تھا جو مدان نام ایک بُت کو پوجتا تھا اور اس لئے عبد المدان کے نام سے مشہور تھا۔ ربیع الآخر ۱۰ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خالدؓ بن ولید کو وہاں دعوتِ اسلام کے لئے بھیجا، حضرت خالدؓ وہاں پہنچے تو سارا قبیلہ مسلمان ہو گیا۔ حضرت خالدؓ نے یہاں تھوڑے دن قیام کیا اور قرآن اور احکامِ اسلام کی تعلیم دی[5]۔

اہل یمن کا بغیر کسی ترہیب و ترغیب کے خلوص دل سے قبول اسلام کوئی ایسا واقعہ نہ تھا جو خاص رحمتِ الٰہی کا مستوجب نہ ہو، جب اشعریوں کی آمد کی خبر ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو بشارت دی کہ کل اہل یمن

---

[1] طبری ص ۱۷۶۳ ارعہ ، اضافہ نا بحر یہ [2] یہ پورا واقعہ بخاری جزو غزوات میں مذکور ہے۔ ہم نے بخاری کی مختلف روایتوں کو یکجا کر لیا ہے [3] ترمذی تفسیر سورۂ مریم [4] زرقانی بحوالہ بیہقی۔ [5] زرقانی جلد ۳ ص ۱۰

آتے ہیں جو رقیق القلب اور نرم دل ہیں[1]۔ جب ہمدان مسلمان ہوا تو آپؐ نے سجدۂ شکر ادا کیا اور ان کو سلامتی کی دُعا دی[2]، حمیر اور تمیم کا وفد آیا تو آپؐ نے پہلے تمیم کی طرف خطاب کیا، تمیم بشارت قبول کرو، بنو تمیم نے کہا یا رسول اللہ ہم نے بشارت تو قبول کر لی، کچھ عطا بھی فرمایئے۔ آپؐ نے منہ پھیر لیا کہ بشارت سے بڑھ کر کیا چیز ہو سکتی تھی؟ پھر اہل یمن کی طرف رُخ کر کے فرمایا، اے اہل یمن، تمیم نے بشارت قبول نہ کی تم قبول کر لو۔ اہل یمن بے اختیار بول اُٹھے اے خدا کے رسول، ہم نے قبول کیا[3]، پھر آپؐ نے عام طور سے فرمایا۔ ایمان یمن کا ایمان ہے اور دانائی یمن کی دانائی ہے۔

مبلغین یمن میں سے حضرت علیؓ اور ابو موسیٰؓ حجۃ الوداع کے موقع پر یمن سے واپس آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کیا۔ ان مبلغین کے ساتھ یمن کے بہت سے نو مسلم بھی حج و زیارت کو آئے)

بحرین میں اسلام ۸ھ بحرین ایران کی حدودِ حکومت میں داخل تھا، عرب کے قبائل وادیوں میں آباد تھے جن میں مشہور اور با اثر خاندان عبد القیس، بکر بن وائل اور تمیم تھے، ان میں سے عبد القیس کے قبیلہ میں سے منقذ بن حبان تجارت کے لئے نکلے، راہ میں مدینہ پڑتا تھا وہاں ٹھہرے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو ان کے پاس تشریف لے گئے اور اسلام کی دعوت دی۔ انہوں نے اسلام قبول کیا اور سورۂ فاتحہ اور اقراء سیکھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک فرمان عنایت کیا، وہ سفر سے واپس گئے تو چند روز تک کسی سے اس کا اظہار نہیں کیا، لیکن اُن کی بیوی نے ان کو نماز پڑھتے دیکھا تو اپنے باپ منذر بن عائذ سے شکایت کی، انہوں نے منقذ سے دریافت کیا۔ بحث و مباحثہ کے بعد منذر بھی مسلمان ہو گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نامۂ مبارک لوگوں کو سنایا، سب نے اسلام قبول کر لیا[4]۔

صحیح بخاری (کتاب الجمعہ) میں روایت ہے کہ مسجد نبویؐ کے بعد سب سے پہلا جمعہ جس مسجد میں ادا کیا گیا وہ بحرین کی مسجد تھی جو جواثی میں واقع ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بحرین میں ابتدائی زمانہ میں اسلام کی اشاعت ہو چکی تھی اسلام قبول کرنے کے بعد ان لوگوں نے چودہ شخصوں کی ایک سفارت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجی جس کے افسر منذر بن الحارث تھے۔ ان کا قافلہ کاشانۂ نبوت کے قریب آیا تو یہ لوگ اس قدر بے تاب ہوئے کہ سواریوں سے کود پڑے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ چومے لیکن منذر کو پاس ادب ملحوظ تھا، انہوں نے قیام گاہ پر جا کر کپڑے بدلے، پھر خدمت میں حاضر ہو کر دست بوسی کی[5]۔

۸ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے علاء حضرمیؓ کو تبلیغ اسلام کے لئے بحرین بھیجا۔ اس زمانہ میں یہاں ایران کی طرف سے منذر بن ساویٰ گورنر تھا اس نے اسلام قبول کیا اور اس کے ساتھ تمام عرب اور کچھ عجم جو

---

[1] بخاری قدوم الاشعریین اہل الیمن [2] زرقانی بحوالہ بیہقی [3] بخاری کتاب بدء الخلق وقدوم الاشعریین [4] زرقانی بحوالہ کرمانی قبیلہ عبد القیس کی ایک سفارت کا ذکر صحیح بخاری میں ہے اور وہ اس زمانہ کے بعد کی ہے، بخاری کی روایت سے بھی اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ عبد القیس اس سفارت سے پہلے ایمان لا چکے تھے، اصابہ میں ابن شاہین سے جو روایت ہے وہ گو زرقانی کی روایت سے مختلف ہے اور رئیس سفارت کے نام میں اختلاف ہے تاہم اس قدر روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلی سفارت ۸ھ سے پہلے کی ہے [5] زرقانی بروایت بیہقی بسند جید۔

یہاں مقیم تھے مسلمان ہو گئے۔[1]

بحرین کے علاقہ میں "ہجر" ایک مقام ہے یہاں ایران کی طرف سے سیبخت حاکم تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے نام بھی خط بھیجا اور اس نے بھی اسلام قبول کیا۔[2]

عمان میں اسلام ۸ھ اس شہر پر قبیلہ ازد کا قبضہ تھا اور جیفر و جعفر یہاں کے رئیس تھے، ۸ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوزید انصاری رضی اللہ عنہ کو جو حافظِ قرآن تھے اور عمرو رضی اللہ عنہ بن العاص کو دعوتِ اسلام کا خط دے کر بھیجا دونوں رئیسوں نے اسلام قبول کیا اور وہاں کے تمام عرب اُن کی ترغیب سے اسلام لائے۔[3]

حدودِ شام میں اسلام ۹ھ شام کے اطراف میں جو عرب آباد تھے اُن میں متعدد ریاستیں تھیں ان میں سے معان اور اس کے اضلاع فروۃ بن عمرو کے زیرِ حکومت تھے لیکن خود فروۃ رضی اللہ عنہ رومی سلطنت کی طرف سے گویا گورنر تھے، انہوں نے اسلام سے واقفیت پیدا کی تو مسلمان ہو گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اظہارِ اسلام کے ساتھ ایک خچر ہدیہ کے طور پر بھیجا (عیسائی) رومیوں کو اُن کے اسلام کا حال معلوم ہوا تو ان کو گرفتار کر کے سُولی دے دی، اس وقت یہ شعر ان کی زبان پر تھا۔[4]

بلغ سراۃ المسلمین باننی مسلم لربی اعظمی ومقامی

(مسلمان سرداروں کو میرا یہ پیغام پہنچا دو کہ میرا جسم اور میری عزت سب اپنے پروردگار کے نام پر نثار ہے)

(شام اور عرب کے درمیان عذرہ، بلی، جذام وغیرہ قبائل آباد تھے۔ قبیلہ بلی میں حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن العاص کا ننہال تھا اس لئے ایک جماعت کے ساتھ وہ ان اطراف میں بھیجے گئے۔ جب وہ جذام کے تالاب پر پہنچے تو اُن کو حملہ کا خوف ہوا، دربارِ نبوت میں اطلاع کی، وہاں سے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی ماتحتی میں بغرضِ حفاظت کچھ فوج بھیج دی گئی۔ اسی کو اہلِ سیر کی اصطلاح میں غزوۂ ذات السلاسل کہتے ہیں)

*

[1] فتوح البلدان [2] ایضاً ذکر بحرین [3] ایضاً ذکر فتح عمان [4] ابن ہشام اسلام فروۃ رضی اللہ عنہ ذکر وفود۔

وفودِ عرب

(جن لوگوں نے مبلغینِ اسلام کی دعوت قبول کر لینے کے بعد خود بارگاہِ نبوت میں جا کر اسلام کا اعلان کرنا چاہا، اربابِ سیر "وفود" کے عنوان سے اُن کا ذکر کرتے ہیں، اس قسم کے وفود کی تعداد بہت زیادہ ہے، ابنِ اسحاق نے صرف پندرہ وفود کا حال لکھا ہے، ابن سعد میں ستر وفود کا تذکرہ ہے، دمیاطی، مغلطائی، زین عراقی بھی یہی تعداد بیان کرتے ہیں، لیکن مصنفِ سیرتِ شامی نے زیادہ استقصاء کیا ہے اور ایک سو چار وفود کے حالات بہم پہنچائے ہیں، اگرچہ ان میں کہیں کہیں ضعیف روایتوں سے استناد کیا گیا ہے اور اکثر وفود کے نام مبہم ہیں، تاہم یہ مسلّم ہے کہ اصل تعداد ابنِ اسحاق کی روایت سے کہیں زیادہ ہے، حافظ ابن قیم اور قسطلانی نے نہایت تحقیق اور احتیاط کے ساتھ ان میں سے صرف ۳۴ وفود کی تفصیل کی ہے)

اصل یہ ہے کہ تمام عرب مکہ کے فیصلۂ اخیر کا انتظار کر رہا تھا، مکہ فتح ہو چکا تو یہ انتظار جاتا رہا، اب ہر قبیلہ نے چاہا کہ خود دارالاسلام میں جا کر کوئی فیصلہ کرے۔ اہلِ عرب کو یہ بات تو معلوم ہو چکی تھی کہ اب وہ اسلام کے مقابلہ میں سرکشی نہیں کر سکتے۔ لیکن خیبر وغیرہ کی نظیروں سے یہ بھی جانتے تھے کہ اسلام لانے پر وہ مجبور نہیں ہیں بلکہ جزیہ یا کسی اور طریقہ سے صلح کر کے ان کی سابق حالت قائم رہ سکتی ہے

فتح مکہ کے ساتھ ہی ہر طرف سے سفارتیں آنی شروع ہو گئیں اور بجز چند کے باقی جس قدر سفارتیں آئیں، انھوں نے بارگاہِ نبوت میں پہنچ کر وہ کچھ دیکھا کہ واپس آئے تو ایمان کی دولت سے مالا مال آئے۔

عرب کے سب سے طاقتور قبیلے جن کا اثر دور تک پھیلا ہوا تھا، بنو تمیم، بنو سعد، بنو حنیفہ، بنو اسد، کندہ، سلاطینِ حمیر، ہمدان، ازد اور طے تھے، ان تمام قبائل کی سفارتیں، دربارِ نبوت میں آئیں، ان میں سے بعض ملکی حیثیت رکھتی تھیں یعنی جن کا مقصد صرف یہ تھا کہ بحیثیت فاتح کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معاہدہ کر لیں لیکن اکثر اس غرض سے آئیں کہ اسلام کی حقیقت سے مطلع ہو کر اس کے حلقہ میں آ جائیں۔ یہ وفود زیادہ تر فتح مکہ کے بعد ۸ھ، ۹ھ اور ۱۰ھ میں آئے، لیکن تسلسلِ بیان کے لئے اس سے پہلے کے چند وفود کا تذکرہ کرنا بھی موزوں ہوگا۔

مزینہ یہ ایک بڑا قبیلہ تھا جو مضر تک پہنچ کر قریش کے خاندان سے مل جاتا ہے، نعمان رضی اللہ عنہ بن مقرن مشہور صحابی جو فتح مکہ میں قبیلہ مزینہ کے علمبردار تھے اسی قبیلہ سے تھے، اصفہان انہی نے فتح کیا تھا،[1] ۵ھ میں اس قبیلہ کے چار سو شخص قبیلہ کے سفیر بن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور اسلام لائے عراقی نے سیرۃ منظوم میں لکھا ہے ؎

([1] اصابہ فی احوال الصحابہ ترجمہ نعمان بن مقرن و ابن سعد جزء وفود صفحہ ۳۸)

اوّل وفد وفد المدینة سنة خمس وفدا مزینه

سب سے پہلا وفد جو مدینہ میں آیا وہ مزینہ کا قبیلہ تھا جو ۵ھ میں آیا

بنو تمیم بنو تمیم کے وفود بڑی شان و شوکت سے آئے۔ قبیلہ کے تمام بڑے بڑے رؤسا، مثلاً اقرع بن حابس زبرقان، عمرو بن الاہتم، نعیم بن یزید سب اس سفارت میں شامل تھے، عیینہ بن حصن فزاری جو مدینہ کے حدود تک حملہ آور ہوا کرتا تھا، وہ بھی ساتھ تھا۔ یہ لوگ اگرچہ اسلام قبول کرنے کی غرض سے آئے تھے، تاہم عربی فخر و غرور کا نشہ سر میں اب بھی باقی تھا۔ دربارِ نبوت یعنی مسجدِ نبوی میں پہنچے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف رکھتے تھے، آستانہ اقدس پر جا کر پکارے کہ محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) باہر آؤ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے تو بولے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، ہم اس لئے آئے ہیں کہ تم سے مفاخرہ کریں۔ آپ نے اجازت دی، عطارد ابن حاجب جو مشہور خطیب تھا اور جس نے نوشیرواں کے دربار سے حسنِ تقریر کے صلہ میں کمخواب کا خلعت حاصل کیا تھا، اٹھا اور اپنی قوم کے مفاخر پر ایک پرزور تقریر کی جس کا خلاصہ یہ تھا۔

"خدا کا شکر ہے جس کے الطاف کی بدولت ہم صاحبِ تاج و تخت خزانہ ہائے گراں بہا کے مالک اور مشرق میں تمام قوموں سے معزز تر ہیں، ہماری برابری آج کون کر سکتا ہے، ہماری ہمسری کا جس کو دعویٰ ہو وہ یہ خصائص اور اوصاف گنائے جو ہم نے گنائے ہیں"۔

عطارد خطبہ دے کر بیٹھ گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت بن قیس کو جواب دینے کا اشارہ کیا۔ انہوں نے جو تقریر کی اس کا ماحصل یہ تھا۔

"اس کی تعریف جس نے زمین و آسمان بنائے اُس نے ہم کو بادشاہت دی اور اپنے بندوں میں سے بہترین شخص کو انتخاب کیا جو سب سے زیادہ شریف النسب، سب سے زیادہ راست گفتار، سب سے زیادہ شریف الاخلاق تھا، وہ تمام عالم کا انتخاب تھا اس لئے خدا نے اس پر کتاب نازل کی، ۱ ہم نے لوگوں کو اسلام کی دعوت دی تو سب سے پہلے مہاجرین اور اس کے بعد ہم (انصار) نے دعوتِ اسلام پر لبیک کہا۔ ہم لوگ انصار الٰہی اور وزرائے رسالت ہیں"۔

تقریریں ہو چکیں تو اشعار کی باری آئی، سفارت کی طرف سے تمیم کے مشہور شاعر زبرقان ابن بدر نے قصیدہ پڑھا۔

نحن الکرام فلا حی یعادلنا　　منا الملوک وفینا تنصب البیع

روایتوں میں آیا ہے کہ ایک شخص نے مدینہ میں آ کر خطبہ دیا تو اس کی خوبی تقریر نے تمام حاضرین کو حیرت زدہ کر دیا۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ان من البیان لسحرا، یعنی بعض بعض تقریروں میں جادو ہوتا ہے۔ اصابہ فی احوال الصحابہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زبرقان ہی کی تقریر پر یہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے۔ غرض جب زبرقان تقریر کر چکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دربارِ رسالت کے شاعر یعنی حسانؓ بن ثابت کی طرف دیکھا، انہوں نے برجستہ کہا۔

---

۱ اصابہ فی احوال الصحابہ۔ ۲ ہم شرفائے قوم ہیں کوئی قبیلہ ہمارا ہمسر نہیں ہو سکتا ہم میں تخت نشین ہیں اور ہم کلیساؤں کے بانی ہیں۔

ان الذوائب من فهر واخوتهم　　قد بینوا سنة للناس تتبع

شرفائے قبیلۂ فہر و برادرانِ فہر نے لوگوں کو وہ راستہ بتا دیا ہے جس کی وہ پیروی کرتے ہیں

ارکانِ سفارت میں اقرع بن حابس عرب کا مشہور حاکم تھا، یعنی قومی مقدمات کا مرافعہ اس کے پاس جاتا تھا اور اُس کے فیصلوں پر لوگ گردن جھکا دیتے تھے۔ وہ اسلام لانے سے پہلے مجوسی تھا اس کا دعویٰ یہ تھا کہ جب سفارت کے ساتھ دربارِ رسالت میں آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا۔

ان حمدی لزین وان ذمی لشین۔　　میں جس کی تعریف کر دوں وہ چمک جاتا ہے اور جس کو برا کر دوں اس کو داغ لگ جاتا ہے۔

نظم و نثر کی معرکہ آرائی ہو چکی تو سفارت نے اعتراف کیا کہ دربارِ رسالت کے خطیب اور شاعر دونوں ہمارے شاعر و خطیب سے افضل ہیں، پھر سب نے اسلام قبول کیا۔

بنو سعد بنو سعد نے ضمام بن ثعلبہ کو سفیر بنا کر بھیجا وہ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں آئے اور جس طریقہ سے سفارت ادا کی اس سے عرب کی اصلی ادائیگی اور آزادروی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ صحیح بخاری میں متعدد موقعوں پر اس کا ذکر ہے۔ کتاب العلم کی روایت حسب ذیل ہے۔

حضرت انسؓ بن مالک کہتے ہیں کہ ہم لوگ دربارِ رسالت میں حاضر تھے، ایک شخص ناقہ پر سوار آیا اور صحنِ مسجد میں آ کر ناقہ سے اترا، پھر حاضرین سے پوچھا "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کس کا نام ہے؟" لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ "یہ گورے رنگ کے جو تکیہ لگائے بیٹھے ہیں"۔ پاس آ کر کہا "اے عبدالمطلب کے بیٹے"۔ آپ نے فرمایا "میں جواب دے چکا"۔ بولا کہ "میں تم سے کچھ باتیں پوچھوں گا لیکن سختی سے پوچھوں گا اس پر ناراض نہ ہونا"۔ ارشاد ہوا کہ جو پوچھنا ہو پوچھو۔ بولا کہ اپنے خدا کی قسم کھا کر کہو، کیا خدا نے تم کو تمام دنیا کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے؟ آپ نے فرمایا "ہاں"! پھر قسم دلا کر پوچھا کہ کیا تم کو خدا نے پنج وقتہ نماز کا حکم دیا ہے؟ اسی طرح زکوٰۃ، روزہ، حج کی نسبت پوچھا اور آپ برابر ہاں فرماتے جاتے تھے۔ جب سب احکام سُن لئے تو کہا کہ میرا نام ضمام بن ثعلبہ ہے اور مجھ کو میری قوم نے بھیجا ہے، میں جاتا ہوں اور جو تم نے بتایا ہے میں اس سے ایک ذرہ نہ زیادہ کروں گا نہ کم۔ وہ جا چکا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ "اگر یہ سچ کہتا ہے تو اس نے فلاح پائی"۔

ضمام نے واپس جا کر اپنی قوم سے کہا کہ لات و عزیٰ کوئی چیز نہیں، لوگوں نے کہا کیا کہتے ہو؟ تم کو جنون یا جذام نہ ہو جائے۔ انہوں نے کہا "خدا کی قسم! وہ نہ کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ ضرر، میں تو خدا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتا ہوں"۔ اُن کی مختصر تقریر کا یہ اثر تھا کہ شام نہیں ہونے پائی تھی کہ قبیلہ کا قبیلہ زن و مرد و بچے سب مسلمان تھے۔

اشعریین ۷ھ یمن کا ایک نہایت معزز قبیلہ اشعریین کا تھا، ابو موسیٰ اشعریؓ اسی قبیلہ سے ہیں، ان لوگوں نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر سُنی تو ترپن شخصوں نے مدینہ کی ہجرت کا قصد کیا، اسی قافلہ میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ بھی تھے۔ یہ لوگ جہاز میں سوار ہو کر چلے، لیکن ہوائے مخالف نے جہاز کو حبش

---

۱ یہ روایت صحیح بخاری میں مختلف ابواب میں منقول ہے۔ ۲ ابن ہشام۔

میں پہنچا دیا، وہاں جعفر طیارؓ موجود تھے، وہ اپنے ساتھ لے کر عرب کو روانہ ہوئے۔ اس زمانہ میں خیبر فتح ہو چکا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہیں تشریف فرما تھے، چنانچہ یہیں لوگوں نے شرفِ باریابی حاصل کیا۔[1]

یہ صحیح مسلم (فضائل اشعریین) کی روایت ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ جب اشعریوں کا وفد آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ تمہارے یہاں یمن کے لوگ آتے ہیں جو نہایت رقیق القلب اور نرم دل ہیں مسند احمد بن حنبل میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب اشاعرہ کا وفد آیا تو یہ لوگ جوشِ مسرت سے یہ رجز پڑھتے تھے۔

غدا نلقی الاحبۃ محمدا و حزبہ

(کل ہم دوستوں سے ملیں گے محمدؐ اور پیروانِ محمدؐ سے)

(بارگاہِ نبوت میں پہنچے تو عرض کی یا رسول اللہؐ! ہم اس لئے حاضر ہوتے ہیں کہ اپنے مذہب کے کچھ احکام سیکھیں اور ابتدائے کائنات کے کچھ حالات پوچھیں۔ آپؐ نے فرمایا "پہلے خدا تھا اور کچھ نہ تھا، اس کا تخت پانی پر تھا"۔[2]

دوس ۷ھ

دوس عرب کا ایک مشہور قبیلہ ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ اسی قبیلہ سے ہیں۔ اس قبیلہ کے مشہور شاعر اور رئیس طفیل بن عمرو تھے۔ وہ ہجرت سے پہلے مکہ گئے۔ قریش نے ان کو منع کیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نہ جائیں لیکن اتفاق سے ایک دفعہ یہ حرم میں گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے۔ قرآن مجید سن کر متاثر ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ آپ مجھ کو اسلام کی حقیقت سمجھائیں، آپؐ نے اسلام کی تبلیغ کی اور قرآن کی آیتیں سنائیں۔ وہ نہایت خلوص سے اسلام لائے، وطن جا کر لوگوں کو اسلام کی دعوت دی، لیکن ان کے قبیلہ میں زنا کا بہت رواج تھا۔ لوگ سمجھے کہ اسلام کے بعد اس آزادی سے محروم ہو جائیں گے، اس لئے لوگوں نے تامل کیا۔ طفیل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر یہ حقیقت بیان کی آپؐ نے دعا فرمائی کہ "خدایا! دوس کو ہدایت دے" پھر طفیل سے ارشاد فرمایا کہ جا کر نرمی اور ملاطفت سے لوگوں کو اسلام کی دعوت دو۔ غرض (دعائے نبوی کی برکت اور طفیل کی) ترغیب اور ہدایت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا اور اسی خاندان جن میں ابو ہریرہؓ بھی تھے، ہجرت کر کے مدینہ چلے آئے۔[3]

بنو حارث بن کعب ۹ھ

یہ نجران کا ایک نہایت معزز خاندان تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالدؓ کو ان کے پاس دعوتِ اسلام کے لئے بھیجا۔ یہ لوگ نہایت خلوص کے ساتھ اسلام لائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو مدینہ بلا بھیجا، چنانچہ قیس ابن الحصین و یزید بن عبدالمدان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے چونکہ اکثر معرکوں میں قبائل عرب پر غالب رہے تھے، آپؐ نے ان سے پوچھا کہ تمہارے غلبہ کے اسباب کیا تھے؟ بولے ہم ہمیشہ متفق ہو کر لڑتے تھے اور کسی پر ظلم نہیں کرتے تھے۔ آپؐ نے قیس کو ان کا رئیس مقرر کیا۔

[1] بخاری باب بدء الخلق، [2] اصابہ اور زاد المعاد اور ابن سعد ذکر وفود۔ [3] اصابہ و زاد المعاد۔

قبیلۂ طے ۹ھ

یمن میں طے نہایت نامور قبیلہ تھا۔ اس قبیلہ کے رؤسا زید الخیل و عدی ابن حاتم طائی تھے اور ان کے حدودِ حکومت الگ تھے۔ زید زمانۂ جاہلیت کے مشہور شاعر، خطیب، خوش جمال فیاض، بہادر تھے۔ ۹ھ میں یہ چند معزز اشخاص کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے ان کو اسلام کی دعوت دی۔ انھوں نے مع اپنے ساتھیوں کے نہایت صدق سے اسلام قبول کیا۔ شہسواری کی وجہ سے یہ زید الخیل کے لقب سے مشہور تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لقب کو زید الخیر سے بدل دیا۔[1]

عدی بن حاتم ۹ھ

عدی مشہور حاتم طائی کے بیٹے اور قبیلۂ طے کے (سردار اور مذہباً عیسائی تھے) سلاطینِ عرب کی طرح ان کو بھی آمدنی کا چوتھا حصہ ملتا تھا۔ جس زمانہ میں اسلامی فوجیں یمن گئیں یہ بھاگ کر شام چلے گئے، ان کی بہن گرفتار ہو کر مدینہ میں آئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بڑی عزت و حرمت سے رخصت کیا۔ وہ اپنے بھائی کے پاس چلی گئیں کہا کہ جس قدر جلد ہو سکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو، وہ پیغمبر ہوں یا بادشاہ ہر حال میں ان کے پاس جانا مفید ہے۔ غرض عدی مدینہ آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تھے۔ عدی نے مسجد میں جا کر سلام کیا۔ آپؐ نے جواب سلام کے بعد نام پوچھا۔ پھر ان کو لے کر گھر کی طرف چلے اسی اثناء میں ایک بڑھیا آگئی، اس نے آپؐ کو روک لیا اور دیر تک آپؐ سے کسی کام کے متعلق باتیں کرتی رہی۔ عدی خود رئیس تھے، شام میں رومیوں کا دربار دیکھا تھا، ان کو حیرت ہوئی کہ شہنشاہِ عرب ایک بڑھیا کے ساتھ اس مساوات سے پیش آتا ہے۔ اسی وقت ان کو خیال ہوا کہ یہ شخص بادشاہ نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لائے، چمڑے کا ایک گدا تھا، اس کو عدی کی طرف بڑھایا، یہ اصرار کے بعد اس پر بیٹھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کیوں عدی! تم اپنی قوم سے مرباع لیتے تھے، لیکن یہ تو تمہارے مذہب (نصرانیت) میں جائز نہیں تھا۔[2] پھر فرمایا کہ خدا کے سوا کوئی اور خدا ہے؟ بولے نہیں۔ پھر پوچھا کہ خدا سے کوئی بڑا ہے؟ بولے کہ نہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہودیوں پر خدا کا غضب نازل ہوا ہے اور عیسائی گمراہ ہو گئے ہیں۔[3]

غرض عدی نے اسلام قبول کیا اور اس قدر ثابت قدم رہے کہ ردہ کے زمانے میں بھی ان پر کچھ اثر نہیں پڑا باپ کی سخاوت کا اثر ان پر بھی تھا۔ ایک دفعہ ایک شخص نے ان سے سو روپے طلب کئے۔ بولے کہ تم حاتم کے بیٹے سے اس قدر حقیر رقم مانگتے ہو، بخدا ہرگز نہ دوں گا۔[4]

وفدِ ثقیف

(زیادہ ہوگا) جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طائف کا محاصرہ چھوڑ کر روانہ ہونے لگے تو صحابہؓ نے عرض کی تھی کہ آپ ان کے حق میں بددعا فرمائیں۔ آپؐ نے جن لفظوں میں دعا فرمائی تھی یہ تھی۔

اللّٰھم اھد ثقیفا وائت بھم — اے خدا ثقیف کو ہدایت دے اور ان کو میرے پاس بھیج

(یہ دعائے نبوی کا اعجاز تھا کہ وہ قبیلہ جو تلوار سے زیر نہ ہو سکا تھا۔ دفعۃً جلالِ نبوت نے اس کی گردن آستانۂ اسلام پر جھکا دی اور پورا قبیلہ مسلمان ہو گیا)

[1] اصابہ و زاد المعاد [2] ابن ہشام اسلام عدیؓ بن حاتم [3] مسند امام احمد حدیث عدی، ترمذی تفسیر فاتحہ

[4] اصابہ فی احوال الصحابہ ذکر عدی۔

طائف دو رئیسوں کے قبضہ میں تھا جن میں ایک عروہ بن مسعود تھے، جن کی نسبت کفار مکہ کہا کرتے تھے کہ کلام مکہ اترتا تو ان پر اترتا، عروہ اگرچہ اب تک اسلام نہیں لائے تھے لیکن مادۂ قابل رکھتے تھے، حدیبیہ کی صلح بھی انہی کی سفارت سے انجام پائی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب طائف سے واپس چلے تو خدا نے ان کو اسلام کی توفیق دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ نہیں پہنچنے پائے تھے کہ وہ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور اسلام لاکر واپس گئے، واپس جاکر انہوں نے اسلام کا اظہار کیا اور لوگوں کو اسلام کی ترغیب دی۔ لوگوں نے ان کو بہت برا بھلا کہا، صبح کو جب اپنے بالاخانہ پر اذان دی تو ہر طرف سے تیروں کا مینہ برسا یہاں تک کہ وہ شہید ہو گئے۔ مرتے وقت وصیت کی کہ محاصرہ طائف میں جو مسلمان شہید ہو چکے ہیں اُن ہی کے پہلو میں ہی دفن کئے جائیں۔

(عروہ کا خون رائیگاں نہیں جاسکتا تھا، اصخر بن عیلہ رئیس احمس یہ سُن کر کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طائف کا محاصرہ کئے ہوئے ہیں کچھ سوار لے کر چل کھڑا ہوا تھا اتفاق سے اس وقت پہنچا جب آپ طائف چھوڑ کر مدینہ کی طرف مراجعت فرما چکے تھے، اصخر نے عہد کیا کہ جب تک اہل طائف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت نہ قبول کرلیں گے میں قلعہ کا محاصرہ نہ چھوڑوں گا، آخر اہل طائف نے اطاعت قبول کرلی۔ اصخر نے خدمت نبوی میں اطلاع کی تو آپ نے مسجد نبوی میں تمام لوگوں کو جمع کیا اور احمس کے لئے دس بار دعا فرمائی) چند روز کے بعد اہل طائف نے مشورہ کیا کہ تمام عرب اسلام لا چکا، اب ہم اکیلے کیا کر سکتے ہیں۔ غرض یہ رائے قرار پائی کہ چند سفیر مقرر کرکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجے جائیں۔

ان کی سفارت نے مدینہ کا رُخ کیا تو مسلمانوں کو اس قدر مسرت ہوئی کہ سب سے پہلے مغیرہؓ بن شعبہ دوڑے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جاکر خبر کریں، راہ میں حضرت ابوبکرؓ مل گئے۔ ان کو معلوم ہوا تو مغیرہ کو قسم دلائی کہ یہ خوشخبری مجھ کو پہنچانے دو، مغیرہ نے ان لوگوں کو تعلیم دی کہ دربار رسالت میں جانا تو اس طریقے سے سلام عرض کرنا، لیکن یہ لوگ اسی قدیم دستور کے موافق آداب بجا لاتے۔

عبد یالیل طائف کا مشہور رئیس امیر الوفد تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو (حالانکہ اب تک وہ کافر تھا) مسجد نبوی میں اتارا (کہ مسلمانوں کی محویت و استغراق کو دیکھ کر متاثر ہو[1]) یہ لوگ صحن مسجد میں خیمہ نصب کرا کر ٹھہرائے گئے نماز اور خطبہ کے وقت یہ لوگ موجود رہتے تھے، گو خود شریک نہیں ہوتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ خطبہ میں اپنا نام نہیں لیتے تھے، ان لوگوں نے آپس میں تذکرہ کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے تو اپنی پیغمبری کا اقرار لیتے ہیں لیکن خطبہ میں خود اپنی پیغمبری کا اقرار نہیں کرتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سُنا تو فرمایا کہ میں سب سے پہلے شہادت دیتا ہوں کہ میں فرستادۂ الٰہی ہوں[2]۔

جماعت سفراء میں عثمان بن ابی العاص سب سے کم عمر تھے، سفراء دربار نبوی میں آتے تو ان کو بچہ سمجھ کر قیام گاہ میں چھوڑ آتے۔ عثمان گو کم سن تھے لیکن سب سے زیادہ تیز فہم اور مائل تحقیق تھے ان کا معمول تھا کہ جب سفراء دن کو قیلولہ کرتے تو یہ چپکے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے اور قرآن مجید اور مسائل اسلام سیکھتے

(۱) ابوداؤد باب اقطاع الارضین، (۲) ابوداؤد باب ماجاء فی خبر الطائف۔

یہاں تک کہ اکثر ضروری مسائل سیکھ لئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ ان لوگوں کو اسلام کی تبلیغ کرتے (نماز عشاء کے بعد اُن کے پاس تشریف لے جاتے اور کھڑے کھڑے اُن سے باتیں کرتے۔ زیادہ تر مکہ میں قریش کے ہاتھ سے جو اذیتیں اٹھائی تھیں انکو بیان فرماتے۔ مدینہ میں جو لڑائیاں پیش آئیں اُن کا بھی تذکرہ فرماتے) بالآخر ان لوگوں نے اسلام پر آمادگی ظاہر کی لیکن یہ شرطیں پیش کیں۔

(۱) زنا ہمارے لئے جائز رکھا جائے، کیونکہ ہم میں سے اکثر مجرد رہتے ہیں اور اس لئے ان کو اس سے چارہ نہیں۔

(۲) ہماری قوم کا تمام کاروبار اور ذریعۂ معاش سود ہے اس لئے سود خواری جائز رکھی جائے۔

(۳) شراب سے نہ روکا جائے، ہمارے شہر میں کثرت سے انگور پیدا ہوتا ہے اور یہ ہماری بڑی تجارت ہے۔

لیکن یہ تینوں درخواستیں نامنظور ہوئیں۔ بالآخر ان لوگوں نے کہا اچھا ہم یہ شرطیں واپس لیتے ہیں لیکن ہمارے معبود (طائف کا سب سے بڑا بت جس کا نام لات تھا) کی نسبت کیا ارشاد ہے؟ آپ نے فرمایا کہ وہ توڑ دیا جائے گا۔ یہ سُن کر ان کو سخت حیرت ہوئی کہ کیا کوئی شخص اُن کے خدائے اعظم کو ہاتھ بھی لگا سکتا ہے۔ بولے کہ اگر ہمارے معبود کو معلوم ہو جائے کہ آپ کا یہ ارادہ ہے تو وہ تمام شہر کو تباہ کر دے گا، حضرت عمرؓ سے ضبط نہ ہو سکا۔ بولے کہ تم لوگ کس قدر جاہل ہو، منات صرف ایک پتھر ہے۔ ان لوگوں نے کہا عمرؓ! ہم تمہارے پاس نہیں آئے۔ یہ کہہ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ ہم منات کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ آپ جو چاہیں کریں لیکن ہم کو اس جرأت سے معاف رکھا جائے۔ آپ نے یہ درخواست منظور کر لی[3]۔

ان لوگوں نے نماز، زکوٰۃ اور جہاد سے مستثنیٰ ہونے کی بھی درخواست کی۔ نماز سے معافی تو کسی حالت میں ممکن نہ تھی، وہ ہر روز پانچ دفعہ ادا کرنے کی چیز ہے لیکن زکوٰۃ سال بھر کے بعد واجب ہوتی ہے اور جہاد فرض کفایہ ہے ہر شخص پر واجب نہیں ہے، واجب بھی ہو تو اس کے خاص مواقع ہیں، روز کا کام نہیں۔ اس بناء پر اس وقت ان دونوں باتوں سے ان کو مجبور نہیں کیا گیا، کیونکہ یہ معلوم تھا کہ جب وہ اسلام قبول کرلیں گے تو رفتہ رفتہ خود ان میں صلاحیت آجائے گی۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ میں نے اس واقعہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے سُنا کہ جب یہ ایمان لاچکیں گے تو زکوٰۃ بھی دینے لگیں گے اور جہاد بھی کریں گے[4]۔ (چنانچہ دو ہی برس کے بعد حجۃ الوداع کا موقع آیا تو کوئی ثقفی ایسا نہ تھا جس نے اسلام نہ قبول کرلیا ہو[5])

سفارت جب واپس چلی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان اور مغیرہ بن شعبہ کو بھیجا کہ شرط کے موافق طائف کے صنم اعظم (لات) کو جاکر توڑ آئیں، مغیرہ نے طائف پہنچ کر بُت کدہ کو ڈھانا چاہا تو مستورات روتی ہوئی ننگے سر گھروں سے نکل آئیں اور یہ اشعار پڑھتی جاتی تھیں[6]۔

(۱) ابوداؤد باب تحزیب القرآن، (۲) زاد المعاد، بحوالہ مغازی موسیٰ بن عقبہ (۳) ابوداؤد کتاب الخراج والامارہ باب ماجاء فی خبر الطائف (۴) (اصابہ ترجمہ جبیر بن حیہ ثقفی، (۵) تاریخ طبری۔

الا ابکین دفاع اسلمها الرضاع لم یحنوا المصاع	لوگوں پر رو، کہ پست ہمتوں نے اپنے بتوں کو دشمنوں کے سپرد کر دیا اور معرکہ آرائی نہ کر سکے۔

عربوں میں کثیر الازواجی کی عام عادت تھی، قبیلۂ ثقیف کے ایک نامور سردار غیلان ابن سلمہ کی دس بیویاں تھیں جب وہ مسلمان ہوا تو احکام اسلام کے مطابق چار کے سوا تمام بیویوں سے اُس کو مفارقت کرنی پڑی[1]۔

وفد نجران ۹ھ نجران مکۂ معظمہ سے یمن کی طرف سات منزل پر ایک وسیع ضلع کا نام ہے جہاں عیسائی عرب آباد تھے، یہاں عیسائیوں کا ایک عظیم الشان کلیسا تھا جس کو وہ کعبہ کہتے تھے اور حرم کعبہ کا جواب سمجھتے تھے، اس میں بڑے بڑے مذہبی پیشوا رہتے تھے جن کا لقب سید اور عاقب تھا، عرب میں عیسائیوں کا کوئی مذہبی مرکز اس کا ہمسر نہ تھا، اعشیٰ اسی کی شان میں کہتا ہے۔

وکعبۃ نجران حتم علیک ... حتی تناخی بابوابہا
تزور یزید او عبد المسیح ... وقیاہم خیر او بابہا

یہ کعبہ تین سو کھالوں سے گنبد کی شکل میں بنایا گیا تھا، جو شخص اس کے حدود میں آجاتا تھا وہ مامون ہو جاتا تھا اس کعبہ کے اوقاف کی آمدنی دو لاکھ سالانہ تھی[2]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دعوتِ اسلام کا خط لکھا تو اس کعبہ کے محافظ اور ائمہ مذہب ساٹھ آدمیوں کے ساتھ مدینہ میں آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو مسجد میں اتارا، تھوڑی دیر کے بعد نماز کا وقت آیا تو ان لوگوں نے نماز پڑھنی چاہی، صحابہؓ نے روکا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پڑھنے دو، چنانچہ ان لوگوں نے مشرق کی طرف منہ کر کے نماز ادا کی، ابوحارثہ جو لارڈ بشپ تھا، نہایت محترم اور فاضل شخص تھا، قیصر روم نے اس کو یہ منصب عطا کیا تھا اور اس کے لئے گرجے اور معبد بنواتے تھے[3]۔

ان لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف مسائل پوچھے اور آپؐ نے وحی کی رُو سے اُنکا جواب دیا، اُن کے زمانہ قیام میں سورۂ آل عمران کی ابتداء کی اسی آیتیں اُتریں، ان آیتوں میں اُن کے سوالات کا جواب تھا، جس آیت میں دعوتِ اسلام کی تشریح تھی وہ یہ ہے۔

قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَیْــٴًـا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ (آل عمران)	کہہ دے کہ اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کو مان لیں جو ہم تم دونوں میں مشترک ہے وہ یہ کہ ہم خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو خدا کا شریک نہ بنائیں اور ہم میں کوئی کسی کو خدا کے سوا رب نہ قرار دیں، پھر اگر یہ لوگ نہ مانیں تو کہہ دو کہ تم گواہ رہو ہم تو مسلمان ہیں۔

[1] جامع ترمذی و ابو داؤد کتاب النکاح۔ [2] یہ تمام تفصیل معجم البلدان میں ہے۔ پہلا فقرہ فتح الباری سے ماخوذ ہے جہاں وفد نجران کا ذکر ہے [3] زاد المعاد۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اُن کو اسلام کی دعوت دی تو ان لوگوں نے کہا کہ ہم تو پہلے سے مسلمان ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم صلیب پوجتے ہو، عیسیٰ کو خدا کا بیٹا کہتے ہو کیونکر مسلمان ہو سکتے ہو، جب یہ لوگ اس پر راضی نہ ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کے مطابق ان سے کہہ دیا کہ اچھا مباہلہ کرو، یعنی ہم تم دونوں اپنے اہل و عیال کو لے کر آئیں اور دعا کریں کہ جو شخص جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو۔

فَمَنْ حَآجَّكَ فِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِیْنَ (آل عمران)	تو جو شخص تجھ سے علم آئے پیچھے جھگڑا کرتا ہے اس سے کہہ دے کہ آؤ اپنی اولاد اور اپنی عورتوں کو اور خود اپنے آپ کو بلائیں پھر مباہلہ کریں اور خدا سے دعا کریں کہ ہم میں سے جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو۔

لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہ زہراؓ اور امام حسن و حسین علیہما السلام کو لے کر مباہلہ کے لئے نکلے تو خود اُن کی جماعت میں سے ایک شخص نے رائے دی کہ مباہلہ نہیں کرنا چاہیئے، اگر یہ شخص واقعی پیغمبر ہے تو ہم لوگ ہمیشہ کے لئے تباہ ہو جائیں گے، غرض ان لوگوں نے کچھ سالانہ خراج قبول کر کے صُلح کر لی۔

بنو اسد ۹ھ یہ وہ قبیلہ ہے جو لڑائیوں میں قریش کا دست و بازو تھا، طلیحہ بن خویلد جس نے حضرت ابو بکرؓ کے زمانہ میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا اسی قبیلہ سے تھا، ۹ھ میں یہ لوگ بھی اسلام لائے اور سفارت بھیجی لیکن اب تک اُن کے دماغ میں فخر کا نشہ باقی تھا، سفراء دربارِ رسالت میں آئے تو احسان کے لہجہ میں کہا کہ آپ نے ہمارے پاس کوئی مہم نہیں بھیجی، بلکہ ہم نے خود اسلام قبول کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

یَمُنُّوْنَ عَلَیْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَیَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ یَمُنُّ عَلَیْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِیْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (سورۂ حجرات)	یہ لوگ تم پر احسان رکھتے ہیں کہ ہم اسلام لائے کہہ دو کہ مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ رکھو بلکہ خدا تم پر احسان رکھتا ہے کہ تم کو ایمان لانے کی ہدایت کی، اگر تم سچے ہو۔

بنو فزارہ ۹ھ یہ نہایت سرکش اور زور آور قبیلہ تھا، عیینہ بن حصن اسی قبیلہ سے تھے، اسی قبیلہ نے رمضان ۹ھ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس تشریف لائے، اپنا وفد بھیجا اور اسلام قبول کیا[1]۔

کندہ ۱۰ھ یہ حضر موت (یمن) کے اضلاع میں سے ایک شہر تھا، یہاں کندی خاندان کی سلطنت تھی، اس زمانہ میں اس خاندان کے حاکم اشعث بن قیس تھے، یہ ۱۰ھ میں اسی سواروں کے ساتھ بڑی شان و شوکت سے حیرہ کی چادریں جن کے سنجاف حریر کے تھے کاندھوں پر ڈالے بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئے، یہ پہلے اسلام قبول کر چکے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو دیکھ کر فرمایا کہ کیا تم اسلام نہیں لا چکے ہو؟ بولے "ہاں!" آپ نے فرمایا کہ "پھر یہ حریر کیسا؟" ان لوگوں نے فوراً چادریں پھاڑ پھاڑ کر زمین پر ڈال دیں[2]۔

حضرت ابو بکرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں اپنی بہن ام فروہ سے ان کی شادی کر دی تھی، نکاح ہو چکا تو فوراً اٹھ کر اونٹوں کے بازار میں پہنچے اور جو اونٹ سامنے آیا تلوار سے اس کی کوچیں اڑا دیں، تھوڑی دیر میں بیسیوں اونٹ

[1] زرقانی [2] ابن ہشام وفد کندہ۔

زمین پر پڑے تھے۔ لوگوں کو حیرت ہوئی، انھوں نے کہا میں اپنی دار الریاست میں ہوتا تو اور ہی سر و سامان ہوتا یہ کہہ کر اونٹوں کے دام دے دیئے اور لوگوں سے کہا یہ آپ کی دعوت ہے۔[1] یہ جنگِ قادسیہ اور یرموک میں شریک تھے اور صفین میں حضرت علیؓ کے ساتھ تھے۔

عبد القیس یہ قبیلہ جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، بحرین کا باشندہ تھا، یہاں اسلام کا اثر بہت پہلے پہنچ چکا تھا، سب سے پہلے اس قبیلہ کے تیرہ آدمی ۵ھ میں یا اس سے آگے پیچھے زمانہ میں خدمتِ نبویؐ میں حاضر ہوتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تم کون لوگ ہو؟ عرض کی یا رسول اللہ! ہم خاندانِ ربیعہ سے ہیں، فرمایا مرحبا لا خزایا ولا ندامی۔ پھر ان لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہمارا ملک (بحرین) بہت دور ہے اور بیچ میں کفارِ مضر کی آبادیاں ہیں، ہم اشہرِ حرم کے سوا اور مہینوں میں نہیں آسکتے۔ چند ایسی باتیں تلقین فرمایئے جن پر ہمیشہ عمل کریں اور اپنے اہلِ وطن کو بھی ان کی تعلیم دیں، ارشاد ہوا کہ میں تم کو چار باتوں کا حکم دیتا ہوں، خدا کو ایک جانو، نماز پڑھو، روزے رکھو اور خمس دو اور چار چیزوں سے منع کرتا ہوں، دبا، حنتم، نقیر، مزفت۔

دُبّا، حنتم، نقیر، مزفت۔ یہ عرب میں چار قسم کے برتن ہوتے تھے جن میں رکھ کر شراب بنائی جاتی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریف یہ جاری تھی کہ جس قبیلہ میں جو مخصوص عیوب ہوتے تھے، اُن کے پند و موعظت میں اُنہی کا خصوصیت کے ساتھ ذکر فرماتے تھے، لوگوں کو تعجب تھا کہ حضورؐ نے ان ظروف کا کیوں مخصوص طور سے ذکر فرمایا، چنانچہ انھوں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! نقیر کے متعلق آپ کو کیا معلوم ہے؟ ارشاد فرمایا۔ ہاں کھجور کی موٹی لکڑی کو اندر سے کھود کے تم اس میں پانی ڈال لیتے ہو جب اُبال کم ہو جاتا ہے تو اُس کو پی کر اپنے بھائیوں پر تلوار چلاتے ہو۔ اتفاق یہ کہ وفد میں ایک صاحب ایسے تھے جن پر یہی واقعہ گزرا تھا اُن کی پیشانی پر تلوار کا داغ بھی تھا، اس کو وہ شرم سے چھپاتے تھے۔[2]

بعض روایتوں میں ہے کہ عبد القیس نے خود پوچھا کہ یا رسول اللہ ہم کو کیا پینا چاہیے؟ اس کے جواب میں آپ نے ان چار چیزوں کا ذکر فرمایا۔

بنو عامر ۹ھ (بنو عامرؓ کا قبیلہ عرب کے مشہور قبیلہ قیس بن عیلان کی شاخ تھا، بنو عامر میں اس وقت تین رئیس تھے۔ عامر بن طفیل، اربد بن قیس اور جبار بن سلمیٰ۔ عامر اور اربد صرف حصولِ جاہ کے خواہاں تھے یہ عامر وہی شخص تھا جو اس سے پہلے متعدد فتنوں کا باعث ہو چکا تھا اور اس وقت بھی شر کی نیت سے آیا تھا۔ جبار اور قبیلہ کے عام لوگ خلوصِ قلب سے صداقت کے طالب تھے۔

عامر مدینہ پہنچ کر خاندانِ سلول کی ایک خاتون کا مہمان ہوا، جبار اور مشہور صحابی کعبؓ ابن مالک میں پہلے کے

---

[1] اصابہ۔ [2] صحیح بخاری و صحیح مسلم باب الایمان۔ [3] صحیح مسلم باب الایمان۔ [4] مسلم اور دیگر کتبِ صحاح میں عبد القیس کے اسی وفد کا ذکر ہے، ابن مندہ و دولابی وغیرہ نے اسی قبیلہ کے ایک اور وفد کا ذکر کیا ہے جس میں چالیس آدمی شریک تھے اس بنا پر علامہ قسطلانی نے اسی قبیلہ کے دو وفد قرار دیئے ہیں، پہلا تقریباً ۵ھ میں اور دوسرا ۸ھ میں، حافظ ابن حجرؒ نے کتاب المغازی میں بعینہٖ یہی تحقیق کی ہے لیکن کتاب الایمان کی شرح میں دونوں روایتوں کو ایک ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ [5] اضافہ۔

مراسم تھے، اس لئے وہ تیرہ آدمیوں کے ساتھ انہی کے گھر مہمان اُترے اور اسی تقریب سے کعبؓ ان کو لے کر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے۔ بنو عامر نے سلسلۂ کلام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کر کے کہا۔ انت سیدنا حضور ہمارے آقا ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ السید اللہ۔ آقا خدا ہے۔ انھوں نے پھر عرض کیا، حضورؐ ہم میں سب سے افضل اور سب سے بڑھ کر فیاض ہیں۔ ارشاد ہوا۔ بات بولو تو اس کا لحاظ رہے کہ شیطان تم کو ہنکا نہ لے جائے یعنی یہ تکلف اور تملق بھی ایک قسم کا جھوٹ ہے۔[1]

عامر بن طفیل نے کہا۔ محمدؐ! تین باتیں ہیں۔ اہلِ بادیہ پر تم حکومت کرو اور شہر میرے قبضہ میں ہوں، اگر یہ نہیں تو اپنے بعد مجھے اپنا جانشین بنا جاؤ۔ اگر یہ بھی منظور نہ ہو تو میں غطفان کو لے کر چڑھ آؤں گا؟ عامر نے اربد کو یہ سمجھا دیا تھا کہ میں ادھر محمدؐ کو باتوں میں لگاؤں گا، اُدھر تم ان کا کام تمام کر دینا۔ اب عامر نے جو دیکھا تو اربد میں جنبش تک نہ تھی۔ نبوت کے غیر مرئی جاہ و جلال نے اس کی آنکھیں خیرہ کر دی تھیں۔ دونوں اٹھ کر چلے آئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا؟ خدایا ان کے شر سے بچانا؟ عامر کو طاعون ہو گیا، عرب میں صاحبِ فراش ہونا شرم کی بات تھی، عامر نے کہا مجھے گھوڑے پر بٹھا دو۔ گھوڑے پر بٹھا دیا گیا اور اسی پر اُس نے دم توڑ دیا۔ جبار اور عام اشخاص ایمان کی دولت سے مالا مال ہو کر دار السلام سے واپس آئے۔[2]

حمیر وغیرہ کی سفارت حمیر میں مستقل سلطنت نہیں رہی تھی، سلاطینِ حمیر کی اولاد نے چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر لی تھیں اور برائے نام بادشاہ کہلاتے تھے۔ عربی میں ان کا لقب قیل تھا، لیکن خود نہیں آئے لیکن قاصد بھیجے کہ ہم نے اسلام قبول کر لیا ہے۔

اسی زمانہ میں بہرا، بنو بکا وغیرہ کی سفارتیں بھی آئیں۔

*

---

[1] مشکوٰۃ باب المفاخرہ بحوالہ ابو داؤد۔ [2] عام واقعات ابن اسحاق و زرقانی سے ماخوذ ہیں۔ عامر کی تقریر اور اس کی موت کا واقعہ صحیح بخاری میں مذکور ہے۔

تاسیس حکومتِ الٰہی

استخلاف فی الارض

لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ

دیرینہ و تار راتوں کے بعد سپیدۂ صبح نمودار ہوتا ہے، گھنگھور گھٹائیں جب چھنٹ جاتی ہیں تو خورشیدِ تاباں ضیا گستری کرتا ہے۔ دنیا گنہگاریوں اور ظلم و ستم کی تاریکیوں سے گھری ہوئی تھی کہ دفعۃً صبحِ سعادت نے ظہور کیا اور حق و صداقت کا آفتاب پرتو افگن ہوا، عرب جس طرح ایک خدا کو پوجنے لگا تھا، اب وہ صرف ایک ہی حکومت کے ماتحت تھا۔ خدائے پاک نے وعدہ فرمایا تھا۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا (نور)

خدا نے تم میں سے ایمانداروں اور نیکوکاروں سے وعدہ کیا ہے کہ ان کو بے شبہ زمین میں اپنی خلافت اسی طرح عطا کرے گا جس طرح گزشتہ امتوں کو اس نے اپنی خلافت عطا کی تھی اور ان کے اس مذہب کو جس کو اس نے ان کے لیے پسند کیا تھا یقیناً قوت بخشے گا اور ان کی بے امنی کو امن سے بدل دے گا، مجھ کو پوجیں اور کسی کو شریک نہ بنائیں۔

حکومتِ الٰہی و استخلاف فی الارض نبوت کے ضروری لوازم نہیں، لیکن جب دعوتِ الٰہی سیاستِ ملکی کی دیواروں سے آکر ٹکراتی ہے یا جب اصلاحات کا دامن ملک کی بدامنی و انتشارِ حال کے کانٹوں میں اُلجھ جاتا ہے تو پیغمبر ابراہیمؑ و موسیٰؑ کے قالب میں آگے بڑھتا ہے اور قوم و ملک کو نمارود و فراعنہ کی غلامی سے آزادی دلاتا ہے۔ پیغمبروں میں عیسیٰؑ اور یحییٰؑ بھی گزرے ہیں، جن کو حکومت کا کوئی حصہ نہیں ملا تھا اور موسیٰؑ اور داؤدؑ و سلیمانؑ بھی جو قوموں اور ملکوں کی قسمت کے مالک تھے لیکن محمد رسول اللہ عیسیٰؑ و یحییٰؑ بھی تھے اور موسیٰؑ و داؤدؑ بھی۔ عرب کے خزانے دستِ تصرف میں تھے لیکن کاشانۂ نبوت میں نہ کوئی نرم بستر تھا نہ غذائے لطیف، نہ جسمِ مبارک پر خلعتِ شاہانہ تھا، نہ جیب و آستین میں درہم و دینار، عین اُس وقت جب اس پر کسریٰ و قیصر کا دھوکا ہوتا تھا وہ گلیم پوش، مکہ کا یتیم اور آسمان کا معصوم فرشتہ نظر آتا تھا۔

اسلام کی حکومت کی غرض و غایت جس کو خدا نے خود اپنے الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے یہ تھی۔

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن

مسلمان جن سے (بلا سبب) جنگ کی جاتی ہے، اب ان کو بھی جنگ کی اجازت دی گئی کہ وہ مظلوم ہیں اور خدا ان کی مدد پر قادر ہے

؎ یہ پورا باب اضافہ ہے۔ (س) ؎ حضرت ابراہیمؑ اپنے قبیلے کے شیخ تھے، چار سو غلاموں کی فوج ساتھ رہتی تھی، شام و اطرافِ بابل کے کئی بادشاہوں سے ان کو لڑنا پڑا اور خدا نے ان سے وعدہ کیا کہ ان کی اولاد کو ارضِ مقدس کی حکومت عطا کرے گا (توراۃ سفر تکوین)

دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۗ وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ

(سورۃ الحج)

وہ جو ناحق اپنے گھروں سے نکال دیے گئے، سوا اس کے ان کا اور کوئی قصور نہ تھا کہ وہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا پروردگار ہی ہمارا خدا ہے، اگر دنیا میں ایک قوم کو دوسری قوم سے بچایا نہ جاتے تو بہت سی خانقاہیں کلیسے عبادت گاہیں، مسجدیں جن میں اکثر خدا کا نام لیا جاتا ہے برباد کر دی جائیں جو خدا کی مدد کرتا ہے خدا اس کی مدد کرتا ہے خدا طاقتور اور غالب ہے مسلمان وہ ہیں جن کو اگر خدا زمین میں قوت عطا کرے تو عبادتِ الٰہی کریں، مستحقین کی مالی اعانت کریں (زکوٰۃ دیں) لوگوں کو نیکیوں کی تاکید کریں، برائیوں سے روکیں، انجام کار خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔

ان آیتوں میں بالاجمال یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام میں غزوات کی ابتدا۔ کیوں اور کیونکر ہوئی؛ اسلام کی حکومت کے کیا اغراض و مقاصد تھے اور استخلاف فی الارض کے کیا فرائض ہیں، اور دنیا کی عام حکومتوں سے وہ کن امور میں ممتاز ہے؟ ان مباحث کا اصولی اور مفصل بیان کتاب کے دوسرے حصوں میں آئے گا، یہاں عرب کے نظم و نسق کے متعلق عام اور جزئی باتیں کرنی مقصود ہیں۔

صفحاتِ بالا سے معلوم ہو چکا ہے کہ اب تمام عرب میں امن و امان قائم ہے، سیاسی مشکلات کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ ملک کے ہر گوشہ میں دعاۃِ اسلام پھیلے ہوتے ہیں، قبائل دور دراز صوبوں سے بارگاہِ نبوت کا رُخ کر رہے ہیں، فتح مکہ اسلام کی شہنشاہی کا پہلا دن تھا جو رمضان ۸ھ کا واقعہ ہے، اسی کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبائل میں محصلینِ زکوٰۃ کا تقرر فرمایا، لیکن اصل خلافتِ الٰہی کے تمام اجزاء اواخر ۱۰ھ زمانہ حجۃ الوداع کے قریب مکمل پائے۔

یورپ کی ناآشنا نگاہ میں اگرچہ آپ کی زندگی کا یہ دور جدید ایشیائی شاہانہ زندگی کا ایک طرب انگیز منظر تھا لیکن آشنایانِ حقیقت کو شہنشاہِ عرب پھٹے پرانے کپڑوں میں مدینہ کی گلیوں کے اندر غلاموں اور مسکینوں کے کام کرتا ہوا نظر آتا ہے، وہ تاج و تخت سے بے نیاز قصر و ایوان سے مستغنی، حاجب و دربان سے بے پروا، مال و زر سے خالی، خدم و حشم کے بغیر دلوں پر حکومت کر رہا تھا۔ اس کی حکومت میں نہ پولیس تھی نہ بڑے بڑے انتظامی دفاتر، نہ کثیر التعداد اربابِ مناصب، نہ وزرائے شوریٰ، نہ امرائے سیاست، نہ الگ الگ حکام و قضاۃ۔ وہ ایک ہی ذات تھی، جو ہر فرض و خدمت کی خود ذمہ دار تھی لیکن بایں ہمہ وہ اپنے آپ کو عام مسلمانوں سے اونٹ کے ایک بال کے برابر بھی زیادہ مستحق نہیں سمجھتا تھا۔ اس کے عدل و انصاف کے آگے فاطمہؓ جگر گوشۂ نبوت اور عام مجرم برابر تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل بعثت کا مقصد دعوتِ مذہب، اصلاحِ اخلاق اور تزکیۂ نفوس تھا اس

؎ ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ القاعد ؎ صحیح بخاری کتاب الحدود۔

کے علاوہ اور تمام فرائض محض ضمنی تھے، اس بنا پر انتظامات ملکی آپؐ نے اسی حد تک قائم کیے جہاں تک ملکی بدامنی کے باعث دعوتِ توحید کے لیے عوائق پیش آتے تھے، تاہم یہ کام بھی کچھ اہم نہ تھا)

انتظام ملکی (عمر شریف اس وقت ساٹھ برس کی تھی لیکن اس عمر میں بھی اس حکومت کے تمام کام خود انجام دیتے تھے۔ ولاۃ اور عمال کا تقرر، موذنین اور ائمہ کا تعین، محصلین زکوٰۃ و جزیہ کی نامزدگی، غیر قوموں سے مصالحت، مسلمان قبائل میں جائیدادوں کی تقسیم، فوجوں کی آراستگی، مقدمات کا فیصلہ، قبائل کی خانہ جنگیوں کا انسداد، وفود کے لیے تعینِ وظائف، اجرائے فرامین، نو مسلموں کے انتظامات، مسائل شرعیہ میں افتاء، جرائم کے لیے اجرائے تعزیر، ملک کے بڑے بڑے سیاسی انتظامات عہدہ داروں کی خبر گیری اور احتساب، دُور کے صوبوں میں متعدد صحابہ گورنر اور والی بنا کر بھیج دیئے گئے تھے لیکن خود مدینہ اور اطراف مدینہ کے فرائض آپؐ خود انجام دیتے تھے۔

خلافتِ الٰہی کے ان فرائض و اعمال نے آپؐ کے دل و دماغ پر جو بارِ عظیم ڈالا، اُس نے آپؐ کے نظامِ جسمانی کو چور چور کر دیا۔ عام روایتوں سے ثابت ہے کہ آپؐ آخر زندگی میں تہجد کی نماز بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے جو ضعفِ جسمانی کا اقتضا تھا، لیکن یہ ضعفِ جسمانی خود کس چیز کا نتیجہ تھا، اس کا جواب حضرت عائشہؓ کی زبان سے سُننا چاہیئے جن سے بڑھ کر آپؐ کے اعمالِ زندگی کا کوئی ترجمان نہیں ہو سکتا۔

ان عبد اللہ بن شقیق قال سألت عائشۃ اکان یصلی قاعداً قالت حین حطمہ الناس[1]۔

عبد اللہ بن شقیق کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ کر نماز پڑھتے تھے؟ انہوں نے کہا ہاں! لیکن اس وقت جب لوگوں نے آپ کو چور چور کر دیا تھا۔

امیر العسکری (چھوٹے چھوٹے غزوات و سرایا کے امیر الجیش اگرچہ اکابر صحابہ ہوتے تھے لیکن جو بڑے معرکے پیش آتے تھے اُن کی قیادت خود آپؐ بہ نفسِ نفیس فرماتے تھے۔ چنانچہ بدر، اُحد، خیبر، فتح مکہ، تبوک میں خود آپؐ ہی امیر العسکر تھے۔ اس کا مقصد صرف فوج کو لڑانا اور آخری فتح و ظفر حاصل کرنا نہ تھا بلکہ فوج کی عام اخلاقی اور روحانی نگرانی کرنا تھا۔ چنانچہ آپؐ نے مجاہدین اسلام کی جن جزئی جزئی سے جزئی بے اعتدالیوں پر گرفت فرمائی ہے وہ احادیث میں بہ تصریح مذکور ہیں اور اسلام کا قانونِ جنگ اسی دار و گیر کے ذریعہ سے وجود میں آیا ہے)

افتاء (آپؐ کے عہدِ مبارک میں اگرچہ متعدد صحابی بھی بطورِ خود فتویٰ دیتے تھے لیکن زیادہ تر آپؐ ہی اس فرض کو بھی ادا کرتے تھے۔ فتویٰ دینے کے لئے آپ نے کوئی خاص وقت مقرر نہیں فرمایا تھا، بلکہ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے، غرض جس وقت لوگ آپؐ سے احکام اسلام کے متعلق سوالات کرتے تھے آپؐ ان کا جواب دیتے تھے، چنانچہ امام بخاری نے کتاب العلم میں ان فتاویٰ کو اس قسم کے متعدد ابواب میں تقسیم کر دیا ہے خلافت کا یہی فرض تھا جس کو حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں نہایت ترقی دی اور اس کا ایک مستقل شعبہ قائم کر دیا)

[1] ابو داؤد کتاب الصلوٰۃ۔ باب صلوٰۃ القاعد

فصل قضایا (اگرچہ آپؐ کے عہدِ مبارک میں عہدۂ قضاۃ قائم ہو چکا تھا اور حضرت علیؓ اور حضرت معاذ بن جبل کو آپؐ نے خود یمن کا قاضی مقرر فرما کے بھیجا تھا، تاہم مدینہ اور اس کے حوالی و مضافات کے تمام مقدمات کا آپؐ خود فیصلہ فرماتے تھے اس کے لئے کسی قسم کی روک ٹوک اور پابندی نہ تھی۔ امام بخاری نے ایک خاص باب باندھا ہے جس کا عنوان یہ ہے۔

باب ما ذکر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یکن لہ بواب۔

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر دربان نہ تھا۔

اس بنا پر گھر کے اندر بھی آپؐ اطمینان و سکون کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے تھے، عورتوں کے معاملات عموماً زنان خانہ ہی میں پیش ہوتے تھے۔ احادیث کی کتابوں میں آپؐ کے فیصلوں کا اتنا ذخیرہ موجود ہے کہ اگر ان کا استقصا کیا جائے تو ایک ضخیم جلد تیار ہو جائے، عموماً احادیث کی کتاب البیوع میں دیوانی کے مقدمات اور کتاب القصاص والدیات وغیرہ میں فوجداری کے مقدمات مذکور ہیں۔

توقیعات و فرامین (یہ اس قدر اہم کام تھا کہ عہدِ مبارک میں اگرچہ اور صیغوں کا کوئی مستقل دفتر نہیں قائم ہوا تھا تاہم توقیعات و فرامین کے لئے اس کی ابتدائی شکل قائم ہو چکی تھی۔ چنانچہ اس خدمت پر حضرت زیدؓ بن ثابت اور آخر میں معاویہؓ مامور ہوتے۔ ان کے علاوہ اور دوسرے صحابہ بھی وقتاً فوقتاً یہ خدمت انجام دیتے تھے۔ آپؐ نے سلاطین و ملوک کو دعوتِ اسلام کے جو خطوط روانہ فرمائے، غیر قوموں کے ساتھ جو معاہدے کیے، مسلمان قبائل کو جو احکام بھیجے، عمال و محصلین کو جو تحریری فرامین عنایت کئے، فوج کا جو رجسٹر مرتب کرایا بعض صحابہ کو جو حدیثیں لکھوائیں، وہ سب اسی سلسلہ میں داخل ہیں۔ زرقانی وغیرہ نے آپؐ کے احکام و فرامین تحریری کا ایک مستقل باب قائم کیا ہے)

مہمان داری (منصبِ نبوت کے بعد آپ کی ذاتی حیثیت تقریباً فنا ہو گئی تھی، اس لئے آپؐ کی خدمت میں جو لوگ حاضر ہوتے تھے ان کا تعلق بھی خلافتِ الٰہی یا نبوت ہی کے ساتھ ہوتا تھا اور آپؐ اسی حیثیت سے اُن کی مہمان داری فرماتے تھے۔ مہمانوں کی زیادہ تر تعداد قبولِ اسلام کے لئے آتی تھی جن کی مہمان داری کے لئے آپؐ نے ابتدائے نبوت ہی سے خاص طور پر حضرت بلالؓ کو مامور فرما دیا تھا، چنانچہ جب کوئی تنگدست مسلمان آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور آپؐ اس کو برہنہ تن دیکھتے تو حضرت بلالؓ کو حکم دیتے اور وہ قرض لے کر اُس کے کھانے اور کپڑے کا انتظام کرتے، جب آپؐ کے پاس کہیں سے کچھ مال آتا تو اُس کے ذریعے سے وہ قرض ادا کیا جاتا، یہاں تک کہ اگر کوئی شخص آپؐ کو ذاتی طور پر ہدیہ دیتا تو وہ بھی اسی صیغہ میں صرف کیا جاتا[1]، کبھی کبھی اس غرض کے لئے آپؐ تمام صحابہ کو صدقہ و خیرات کی ترغیب دیتے اور جو رقم حاصل ہوتی وہ ان مفلوک الحال مہاجرین کی اعانت میں صرف ہوتی، چنانچہ ایک بار مہاجرین کی ایک برہنہ پا و سر جماعت آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی، ہر شخص کے بدن پر صرف ایک چادر اور گلے میں ایک تلوار حمائل تھی۔ آپؐ نے ان کی پریشان حالی دیکھی، دیکھا تو چہرے کا رنگ

[1] ابو داؤد کتاب الخراج والامارۃ باب فی الامام یقبل ہدایا المشرکین۔

بدل گیا۔ فوراً حضرت بلالؓ کو اذان کا حکم دیا۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد ایک خطبہ میں تمام صحابہ کو ان لوگوں کی اعانت کی ترغیب دی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ایک انصاری اٹھے اور ایک توڑا جو اس قدر وزنی تھا کہ اُن سے بمشکل اٹھ سکتا تھا، لاکر آپؐ کے آگے ڈال دیا۔ اس سے تمام لوگوں میں اور بھی جوش پیدا ہوا اور تھوڑی دیر میں ان بے سروسامان مہاجرین کے آگے غلہ اور کپڑے کا ڈھیر لگ گیا۔[۱]

فتح مکہ کے بعد تمام اطرافِ ملک سے بکثرت ملکی و مذہبی وفود آنے لگے۔ آپؐ بنفسِ نفیس اُن کی خاطر مدارات کرتے تھے اور اُن کے لئے حسبِ حاجت وظائف اور سفر کے مصارف ادا فرماتے تھے۔ قبائل پر اس کا بہت اچھا اثر پڑتا تھا۔ آپؐ اس کا اس قدر لحاظ فرماتے تھے کہ وفات کے وقت آپؐ نے جو آخری وصیتیں فرمائی تھیں، اُن میں ایک یہ بھی تھی۔

اجیزوا الوفود بنحو ماکنت اجیزھم۔[۲] جس طرح میں وفود کو عطیہ دیا کرتا تھا اسی طرح تم بھی دیا کرو۔

(وفود کے حالات آگے آتے ہیں)

عیادت مرضیٰ مریضوں کی عیادت اور ان کی تجہیز و تکفین میں بھی شریک ہونا اگرچہ ایک مذہبی فرض تھا اور مذہبی حیثیت سے اس کی ابتدا بھی ہوئی، چنانچہ جب آپؐ مدینہ تشریف لائے تو یہ عام دستور ہو گیا کہ دم نزع میت کے اعزہ آپؐ کو اطلاع دیتے، آپؐ ان کے پاس آکر اُن کے لئے دعائے مغفرت کرتے۔ لیکن بعض حیثیتوں سے اس کا تعلق خلافت کے ساتھ بھی ہو گیا تھا، کیونکہ بعض صحابہ اس حالت میں اپنی جائداد کو وقف یا صدقہ کر دینا چاہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس موقع پر اُن کا صحیح طریقہ بتاتے تھے۔ جن لوگوں پر قرض آتا تھا، آپؐ اُن کے جنازہ میں شریک نہیں ہوتے تھے اس لئے ان کے ورثا، یا دوسرے صحابہ کو مجبوراً یہ قرض ادا کرنا پڑتا تھا اور اس طرح بعض معاملات و نزاعات کا فیصلہ ہو جاتا تھا، چنانچہ احادیث میں اس قسم کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔

احتساب تمدنِ اسلام کے دورِ ترقی میں محکمۂ احتساب ایک مستقل محکمہ تھا جو نہایت وسیع پیمانہ پر تمام قوم کے اخلاق و عادات، بیع و شراء اور معاملات داد و ستد کی نگرانی کرتا تھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں یہ محکمہ قائم نہیں ہوا تھا بلکہ خود ہی آپؐ اس فرض کو ادا فرماتے تھے، ہر شخص کے جزئیات اخلاق اور فرائضِ مذہبی کے متعلق آپؐ وقتاً فوقتاً دارو گیر فرماتے رہتے تھے، تجارتی معاملات کی بھی نگرانی فرماتے تھے۔ عرب میں تجارتی معاملات کی حالت نہایت قابلِ اصلاح تھی اور مدینہ میں آنے کے ساتھ ہی آپؐ نے ان اصلاحات کو جاری کر دیا، لیکن تمام لوگوں سے اصلاحات پر عمل کرانا صیغۂ احتساب سے تعلق رکھتا تھا، چنانچہ نہایت سختی کے ساتھ ان معاملات کی نگرانی فرماتے تھے اور تمام لوگوں سے اُن پر عمل کراتے تھے اور جو لوگ باز نہیں آتے تھے اُن کو سزائیں دلاتے تھے، صحیح بخاری کتاب البیوع میں ہے۔

لقد رأیت الناس فی عھد النبی صلی اللہ علیہ وسلم یتبایعون جزافا یعنی الطعام

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں دیکھا کہ جو لوگ تخمیناً غلہ خریدتے تھے ان کو اس بات

[۱] مسند احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۳۵۸ و ۳۵۹۔ [۲] صحیح بخاری جلد اول باب اخراج الیہود من جزیرۃ العرب۔ [۳] مسند ج ۳ ص ۲۹۶۔

یضربون ان یبیعوہ فی مکانھم حتی یؤدوہ الی رحالھم۔ پر سزا دی جاتی تھی کہ اپنے گھروں میں منتقل کرنے سے پہلے اُس کو خود اسی جگہ بیچ ڈالیں جہاں اس کو خریدا تھا۔

کبھی کبھی تحقیقِ حال کے لئے آپؐ خود بازار تشریف لے جاتے۔ ایک بار آپؐ بازار میں گزرے تو غلہ کا ایک انبار نظر آیا۔ اس کے اندر ہاتھ ڈالا تو نمی محسوس ہوئی۔ دوکاندار سے دریافت فرمایا کہ یہ کیا ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ بارش سے بھیگ گیا ہے۔ ارشاد ہوا کہ پھر اُس کو اوپر کیوں نہیں کر لیا تاکہ ہر شخص کو نظر آئے۔ جو لوگ فریب دیتے ہیں وہ ہم میں سے نہیں ہیں۔[۱]

فرائض احتساب میں آپؐ کا سب سے بڑا فرض عمّال کا محاسبہ تھا، یعنی جب عمّال زکوٰۃ اور صدقہ وصول کر کے آتے تھے تو آپؐ اس غرض سے اُن کا جائزہ لیتے تھے کہ انھوں نے کوئی ناجائز طریقہ تو نہیں اختیار کیا ہے، چنانچہ ایک بار آپؐ نے ابن اللتبیہ کو صدقہ وصول کرنے کے لئے مامور فرمایا۔ وہ اپنی خدمت انجام دے کر واپس آئے اور آپؐ نے اُن کا جائزہ لیا تو انھوں نے کہا یہ مال مسلمانوں کا ہے اور یہ مجھ کو ہدیۃً ملا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ گھر بیٹھے بیٹھے تم کو یہ ہدیہ کیوں نہیں ملا۔ اس کے بعد آپؐ نے ایک عام خطبہ دیا جس میں اُس کی سخت ممانعت فرمائی۔[۲]

اصلاح بین الناس اسلام تمام دنیا کے تفرقوں کو عموماً اور عرب کے اختلافات کو خصوصاً مٹانے کے لئے آیا تھا، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کو اپنا ایک ضروری فرض قرار دیا تھا اور جب آپؐ کو اس قسم کے منازعات کی خبر ہوتی تھی تو آپؐ اصلاح کو تمام مذہبی فرائض پر مقدم رکھتے تھے، چنانچہ ایک بار قبیلہ بنو عمرو بن عوف کے چند اشخاص کے درمیان نزاع پیدا ہوئی۔ آپؐ کو معلوم ہوا تو چند صحابہ کے ساتھ اُن میں مصالحت کرانے کے لئے تشریف لے گئے۔ آپؐ کو اس معاملہ میں دیر ہوئی اور نماز کا وقت آگیا۔ حضرت بلالؓ نے اذان دی لیکن اذان کے بعد بھی آپؐ تشریف نہیں لائے۔ تھوڑی دیر کے انتظار کے بعد انھوں نے حضرت ابوبکرؓ کو امام بنا کر نماز شروع کی۔ آپؐ اسی حالت میں تشریف لائے اور صفوں کو چیرتے ہوئے اگلی صف میں جا کھڑے ہوئے۔ حضرت ابوبکرؓ اگرچہ نماز میں اِدھر اُدھر نہیں دیکھتے تھے لیکن جب لوگوں نے زور زور سے تالیاں بجانی شروع کیں تو انھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہیں۔ آپؐ نے اگرچہ ہاتھ سے اشارہ کیا کہ کھڑے رہیں، لیکن آپؐ کی موجودگی میں انھوں نے امامت کرانا سوءِ ادب خیال کیا اس لئے پیچھے ہٹ آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھ کر اُن کی جگہ کھڑے ہو گئے۔[۳]

ایک بار اہل قباء کے درمیان نزاع قائم ہوئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ لوگوں نے باہم سنگ اندازی کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپؐ صحابہ کے ساتھ مصالحت کرانے کی غرض سے تشریف لے گئے۔[۴] (یہ دونوں واقعات گو امام بخاری نے الگ لکھے ہیں، لیکن شراحِ حدیث کی تحقیق میں یہ ایک ہی واقعہ کے دو حصے ہیں، بخاری کی دوسری روایتوں میں ہے کہ آپؐ اتنی دور پیدل گئے تھے۔

ابن ابی حدرد پر حضرت کعبؓ بن مالک کا کچھ قرض تھا، انھوں نے مسجد میں تقاضا کیا، حدرد قرض کا ایک

[۱] صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۵ کتاب الایمان۔ [۲] بخاری ج ۲ ص ۱۰۶۵ کتاب الاحکام۔ [۳] بخاری جلد ۱ ص ۳۷۱ کتاب الصلح۔ [۴] بخاری کتاب الصلح۔

حصہ معاف کرانا چاہتے تھے لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوتے تھے۔ بات زیادہ بڑھی اور شور و غل ہوا۔ تو آپؐ گھر کے اندر سے نکل آئے اور کعبؓ کو پکارا۔ کعبؓ نے لبیک کہا تو آپؐ نے فرمایا کہ نصف معاف کردو۔ وہ راضی ہو گئے آپؐ نے حدردؓ سے کہا کہ جاؤ اور بقیہ حصہ ادا کردو۔

اس قسم کے سیکڑوں جزئی واقعات روزانہ پیش آیا کرتے تھے۔

مدینہ میں اور مدینہ سے باہر دیگر فرائض کی انجام دہی کے لئے اکابر صحابہ اور ارباب استعداد کو مختلف عہدوں پر نصب فرمایا، کتابتِ وحی، نامہ و پیام، اجرائے احکام و فرامین کے لئے سب سے پہلی ضرورت عہدۂ انشا اور کتابت کی تھی۔ اسلام سے پہلے عرب میں عام طور پر لکھنے پڑھنے کا رواج نہ تھا، لیکن اسلام عرب کے لئے رحمتوں کا جو خزانہ لایا تھا اس میں ایک شے یہ بھی تھی۔ اسیرانِ بدر میں نادار لوگوں کا فدیہ صرف یہ قرار دیا گیا کہ وہ مدینہ کے بچوں کو لکھنا سکھا دیں۔ حضرت زیدؓ بن ثابت نے جن کے متعلق کتابتِ وحی کی مقدس خدمت تھی، اسی طریقہ پر تعلیم پائی تھی۔ ابوداؤد کی ایک روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ اصحابِ صُفّہ کو جو تعلیم دی جاتی تھی اس کا ایک جزو کتابت کی تعلیم بھی تھی۔

کتاب

عہدۂ قضا گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حیثیت سے نیابت تھی اس لئے مختلف اوقات میں بڑے بڑے صحابہ اس خدمت پر مامور کئے گئے جن میں شرحبیلؓ بن حسنہ کندی سب سے پہلے اس شرف سے ممتاز ہوئے، یہ نہایت قدیم الاسلام تھے، مکہ میں انہی نے سب سے پہلے کتابتِ وحی کا فرض انجام دیا، قریش میں سب سے پہلے کاتب عبداللہؓ بن ابی سرح تھے، مدینہ میں اس کی اولیت کا شرف حضرت ابی بن کعب کو حاصل ہوا حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عامرؓ بن فہیرہ، حضرت عمروؓ بن العاص، حضرت عبداللہؓ بن ارقم، حضرت ثابت بن قیسؓ بن شماس، حضرت حنظلہؓ، ابنؓ الربیع الاسدی، حضرت مغیرہؓ بن شعبہ، حضرت عبداللہؓ بن رواحہ، حضرت خالدؓ بن ولید، حضرت خالدؓ بن سعید بن العاص، حضرت علاؓ بن حضرمی، حضرت حذیفہؓ بن الیمان، حضرت معاویہؓ بن ابی سفیان، حضرت زیدؓ بن ثابت مختلف اوقات میں اس منصب پر مامور ہوئے۔ اگرچہ تمام بزرگوں کو کبھی کبھی یہ خدمت ادا کرنی پڑتی تھی۔ چنانچہ صلح نامہ حدیبیہ حضرت علیؓ نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ امراء اور سلاطین کے نام خطوط حضرت عامرؓ بن فہیرہ لکھتے تھے اور امرائے عمان کے نام آپؐ نے جو مکتوب بھیجا تھا وہ حضرت ابی بن کعبؓ کا لکھا تھا۔ قطن بن حارثہ کو جو خط بارگاہِ نبوت سے بھیجا گیا تھا، وہ حضرت ثابتؓ بن قیس نے لکھا تھا۔ لیکن عام طور پر یہ خدمت حضرت زیدؓ بن ثابت کے متعلق تھی اور صحابہ کے گروہ میں انکا نام اسی حیثیت سے زیادہ نمایاں ہے۔[1]

حضرت زیدؓ بن ثابت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے ان تمام بزرگوں پر ایک خاص امتیاز حاصل کیا کہ عبرانی زبان سیکھی، جس کی ضرورت یہ پیش آئی کہ مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ تر یہود سے تعلق رہتا تھا جن کی مذہبی زبان عبرانی تھی، اس بناء پر آپؐ نے حضرت زیدؓ بن ثابت کو عبرانی زبان سیکھنے کا حکم دیا اور انہوں نے پندرہ دن میں اس میں مہارت حاصل کرلی۔

لہ ان بزرگوں کے نام اور تفصیلی حالات زرقانی جلد ۳ صفحہ ۳۰۳ میں مذکور ہیں۔

حکام اور ولاة

فصل قضایا، اقامتِ عدل، بسطِ امن، رفعِ نزاع کے لئے متعدد ولاة حکام کی ضرورت تھی اس غرض سے آپؐ نے متعدد صحابہ کو مختلف مقامات کا حاکم و والی مقرر فرما دیا، چنانچہ انکے نام کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

باذانؓ بن ساسان	بہرام گور کے خاندان سے تھے اور سلاطین عجم میں سب سے پہلے مشرف باسلام ہوئے اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو یمن کا والی مقرر فرما دیا۔
شہر بن باذانؓ	باذان بن ساسان کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو صنعا کا والی مقرر فرمایا۔
خالد بن سعیدؓ بن العاص	شہر بن باذان مارے گئے تو ان کے بعد آپؐ نے ان کو صنعاء میں عامل مقرر فرمایا۔
مہاجرؓ بن امیۃ المخزومی	آپؐ نے ان کو کندہ و صدف کا والی مقرر فرمایا تھا لیکن وہ ابھی روانہ بھی نہ ہوئے تھے کہ آپؐ نے انتقال فرمایا۔
زیاد بن لبید الانصاریؓ	حضر موت کے والی تھے
ابوموسیٰ اشعریؓ	زبید، عدن، زمعہ وغیرہ کے والی تھے۔
معاذ بن جبلؓ	والی جند۔
عمروؓ بن حزم	والی نجران۔
یزید بن ابی سفیانؓ	والی تیما۔
عتابؓ بن اسید	والی مکہ۔
علیؓ بن ابی طالب	متولی اخماس یمن۔
عمروؓ بن العاص	والی عمان۔
علاؓ بن حضرمی	والی بحرین۔

ان ولاة یعنی گورنروں کا تقرر ملک کی وسعت اور ضروریات کے لحاظ سے ہوتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں عرب کے جو حصے اسلام کے زیر سایہ آئے اُن میں یمن سب سے زیادہ وسیع اور متمدن تھا اور مدت تک ایک باقاعدہ سلطنت کے زیر سایہ رہ چکا تھا۔ اس بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کو پانچ حصوں میں منقسم فرمایا اور ہر ایک کے لئے علیحدہ علیحدہ گورنر مقرر فرمائے۔ خالدؓ بن سعید کو صنعا پر، مہاجرؓ بن ابی امیہ کو کندہ پر، زیاد بن لبید کو حضر موت پر، معاذؓ بن جبل کو جند پر، ابوموسیٰ اشعریؓ کو زبید، زمعہ، عدن اور ساحل پر۔[1]

عموماً جب کسی مہاجر کو کہیں کا عامل مقرر فرماتے تھے تو اسی کے ساتھ ایک انصاری کا تقرر بھی فرماتے تھے۔[2]

لہ استیعاب تذکرۂ معاذ بن جبل۔ عہ مسند ابن حنبل ج ۵ ص ۱۸۶۔

ملکی انتظام، فصلِ مقدمات اور تحصیلِ خراج وغیرہ کے علاوہ ان عمال کا سب سے مقدم فرض اشاعتِ اسلام اور سُنن و فرائض کی تعلیم تھی، اس لحاظ سے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے یہ لوگ حاکمِ ملک اور والیٔ صوبہ ہونے کے ساتھ مبلغِ دین اور معلمِ اخلاق کی حیثیت بھی رکھتے تھے، استیعاب تذکرۂ معاذؓ بن جبل میں ہے۔

وبعثہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قاضیاً الی الجند من الیمن یعلم الناس القرآن وشرائع الاسلام ویقضی بینھم وجعل الیہ قبض الصدقات من العمال الذین بالیمن۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یمن کے ایک حصہ یعنی جند کا قاضی بنا کر روانہ فرمایا کہ لوگوں کو قرآن اور شرائعِ اسلام کی تعلیم دیں اور جو عمال یمن میں تھے ان کے صدقات کے جمع کرنے کی خدمت بھی اُن کے متعلق تھی۔

چنانچہ جب یہ لوگ روانہ ہوتے تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان فرائض کی تعیین فرما دیتے تھے، معاذؓ بن جبل کو روانہ فرمایا تو یہ وصیت کی۔

انک تأتی قوما من اھل الکتاب فادعھم الی شھادۃ ان لا الہ الا اللہ وانی رسول اللہ، فان ھم اطاعوا لذالک فاعلمھم ان اللہ افترض علیھم خمس صلوات فی کل یوم ولیلۃ فان ھم اطاعوا لذالک فاعلمھم ان اللہ افترض علیھم صدقۃ تؤخذ من اغنیائھم وترد الی فقرائھم فان ھم اطاعوا لذالک فایاک وکرائم اموالھم واتق دعوۃ المظلوم فانہ لیس بینھا وبین اللہ حجاب۔

تم اہلِ کتاب کے پاس جاتے ہو، پہلے ان کو کلمۂ توحید کی دعوت دو اگر وہ اس کو قبول کر لیں تو ان کو بتاؤ کہ خدا نے رات اور دن میں ان پر پانچ نمازیں فرض کی ہیں، اگر وہ اس کو بھی مان لیں تو ان کو بتاؤ کہ خدا نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے جو اُن کے امرا سے لے کر ان کے غربا پر تقسیم کر دیا جائے گا، اگر وہ اس کو بھی تسلیم کر لیں تو ان کے بہترین مال سے احتراز کرنا اور مظلوم کی بددعا سے بچنا، کیونکہ اس میں اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے۔

ان فرائض کے ادا کرنے کے لئے سب سے زیادہ ضرورت تبحرِ علمی، وسعتِ نظر اور اجتہاد کی تھی، اس بنا پر آپ ان لوگوں کے تبحرِ علمی اور طرزِ عمل کا امتحان لیتے تھے، چنانچہ جب حضرت معاذؓ کو روانہ فرمایا تو پہلے ان کی اجتہادی قابلیت کے متعلق اطمینان فرما لیا، ترمذی میں ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لمعاذ بن جبل حین وجھہ الی الیمن بم تقضی قال بما فی کتاب اللہ قال فان لم تجد فی کتاب اللہ قال بما فی سنۃ رسول اللہ قال فان لم تجد فی سنۃ رسول اللہ قال اجتھد برائی فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ لما یحب رسول اللہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب معاذؓ بن جبل کو یمن کی طرف بھیجا تو فرمایا کس چیز سے مقدمات کا فیصلہ کرو گے، انہوں نے کہا قرآن مجید سے۔ آپ نے فرمایا اگر اس میں وہ فیصلہ تم کو نہ ملے انہوں نے کہا احادیث سے، پھر آپ نے فرمایا اگر احادیث میں بھی اس کے متعلق صراحت نہ ہو تو انہوں نے کہا میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا، اس پر آپ نے فرمایا اس خدا کا شکر ہے جس نے رسول کے رسول کو اس چیز کی توفیق دی جس کو خود اس کا رسول محبوب رکھتا ہے۔

لیکن اہلِ عرب کے دلوں کو مسخر کرنے کے لئے ان تمام چیزوں سے زیادہ رفق و ملاطفت نرمی اور خوش خوئی

کی ضرورت تھی جن کی آمیزش سیاست اور حکومت کے اقتدار کے ساتھ تقریباً ناممکن ہو جاتی ہے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گورنروں کو بار بار اس کی طرف متوجہ فرماتے رہتے تھے، چنانچہ جب معاذؓ بن جبل کو ایک صحابی کے ساتھ یمن کی گورنری پر روانہ فرمایا تو پہلے دونوں کو عام طور سے وصیت فرمائی۔

یسرا ولا تعسرا وبشرا ولا تنفرا وتطاوعا ولا تختلفا (مسلم ج ۲ ص ۹۳ کتاب الایمان)

آسانی پیدا کرنا، دشواری نہ پیدا کرنا، لوگوں کو بشارت دینا اور ان کو وحشت زدہ نہ کرنا، باہم اتفاق رکھنا اور اختلاف نہ کرنا۔

اس پر بھی تسکین نہ ہوئی تو معاذؓ بن جبل جب رکاب میں پاؤں ڈال چکے تو اُن سے خاص طور پر یہ الفاظ فرمائے۔

احسن خلقک للناس (ابن سعد تذکرہ معاذؓ بن جبل)

لوگوں کے ساتھ خوش خلقی کے ساتھ برتاؤ کرنا۔

اگر یہ اصول صحیح ہے کہ کوئی حکومت کتنی ہی رحم دل کیوں نہ ہو لیکن ابتدا میں جب وہ کسی ملک کو اپنے قبضۂ اقتدار میں لاتی ہے تو سرکش لوگوں کے مطیع کرنے کے لئے اس کو مجبوراً سختیاں کرنی پڑتی ہیں تو عرب سب سے زیادہ اس کا مستحق تھا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی مقدس تعلیم کا نتیجہ تھا کہ ریگستانِ عرب کا ایک ذرہ بھی ولاۃ کے مظالم کے سنگِ گراں سے نہ دبا، یہاں تک کہ اخیر زمانہ میں جب صحابہ عمالِ حکومت کے مظالم کو دیکھتے تھے تو اُن کو سخت استعجاب ہوتا تھا اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلقینات کے ذریعہ سے ان کو روکتے تھے، چنانچہ ایک بار ہشام بن حکیم بن حزام نے دیکھا کہ شام کے کچھ نبطی دھوپ میں کھڑے کئے گئے ہیں، انہوں نے لوگوں سے اس کی وجہ پوچھی، لوگوں نے کہا کہ جزیہ وصول کرنے کے لئے اُن لوگوں کے ساتھ یہ سختی کی جا رہی ہے، انہوں نے یہ سن کر کہا۔

اشھد لسمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان اللہ یعذب الذین یعذبون الناس فی الدنیا[1]

میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے کہ خدا ان لوگوں کو سزا دے گا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں۔

محصلین زکوٰۃ و جزیہ

عرب کا خلوص اور جوشِ ایمان اگرچہ خود اُن کو صدقہ و زکوٰۃ کے ادا کرنے پر آمادہ کر دیتا تھا، چنانچہ اسلام لانے کے ساتھ ہی ہر قبیلہ اپنی قوم کا صدقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں خود پیش کرتا اور آپ کی دعا سے برکت اندوز ہوتا تھا، لیکن ایک وسیع ملک اور ایک وسیع حکومت کیلئے یہ طریقہ کافی نہ تھا اس لئے ولاۃ کے علاوہ یکم محرم ۹ھ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ و زکوٰۃ کے وصول کرنے کے لئے ہر قبیلہ کے لئے الگ الگ محصلین مقرر فرمائے جو قبائل کا دورہ کر کے لوگوں سے زکوٰۃ اور خراج وصول کر کے آپ کی خدمتِ مبارک میں پیش کرتے تھے، عموماً خود رؤسائے قبائل اپنے اپنے قبیلوں کے محصل ہوتے تھے اور احادیث[2] سے معلوم ہوتا ہے کہ عموماً ان کا تقرر وقتی ہوتا تھا۔

بہر حال آپ نے اس فرض کی انجام دہی کے لئے حسب ذیل اشخاص کو مختلف قبائل اور شہروں[3] میں متعین فرمایا۔

---

[1] صحیح مسلم باب الوعد الشدید لمن عذب الناس بغیر حق [2] اس فہرست کے اکثر اقسام ابن سعد جزء مغازی ص ۱۱۵ میں مذکور ہے، حضرت عمر فاروقؓ اور عبیدہؓ بن جراح کا ذکر بخاری کتاب الصدقات اور بعض کا ابوداؤد کتاب الخراج میں ہے، بقیہ کے زاد المعاد ذکر مصدقین و امرائے نبوی اور فتوح البلدان بلاذری دیکھو۔

نام	مقام تقرر	نام	مقام تقرر
عدی بن حاتم	طے و بنی اسد	ابوجہم بن حذیفہ	بنو لیث
صفوان بن صفوان ؓ	بنی عمرو	ایک ذہبی	بنو ہذیم
مالک بن نویرہ	بنو حنظلہ	عمر فاروق ؓ	شہر مدینہ
بریدہ بن حصیب الاسلمی	غفار و اسلم	ابوعبیدہ بن جراح	شہر نجران
عباد بن بشر الاشہلی	سلیم و مزینہ	عبداللہ بن رواحہ	شہر خیبر
رافع بن مکیث جہنی	جہینہ	زیاد بن لبید	حضرموت
زبرقان بن بدر	بنو سعد	ابوموسیٰ اشعری	صوبہ یمن
قیس بن عاصم	〃	خالد ؓ	〃
عمرو بن عاص	بنو فزارہ	ابان بن سعید	بحرین
ضحاک بن سفیان کلابی	بنو کلاب	محمد بن جزء الاسدی	تحصیل خمس
بسر بن سفیان کلابی	بنو کعب	عمرو بن سعید بن عاص	تیماء
عبداللہ بن اللتبیہ	بنو ذبیان	عیینہ بن حصن فزاری	بنو تمیم

ان محصلین کے تقرر میں آپ حسب ذیل امور کی پابندی فرماتے تھے۔

(۱) ان کو ایک فرمان عطا ہوتا تھا جس میں بتصریح بتایا جاتا تھا کہ کس قسم کے مال کی کتنی تعداد میں زکوٰۃ کی کیا مقدار ہے؟ چھانٹ کر مال لینے کی یا حق سے زیادہ لینے کی اجازت نہ تھی، عام حکم تھا کہ ایاک وکرائم اموالھم[1]۔ عمال نہایت شدت کے ساتھ اس فرمان پر عمل کرتے تھے اور اس سے تجاوز جائز نہیں رکھتے تھے، بعض لوگوں نے بخوشی حق سے زیادہ دینا چاہا لیکن انھوں نے قبول نہیں کیا، سوید بن غفلہ کا بیان ہے کہ ہمارے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا محصل آیا میں جاکر اس کے پاس بیٹھا تو اس نے پہلے جانوروں کے اُن اقسام کو بیان کیا جن کے لینے کی فرمان میں اجازت نہ تھی، چنانچہ اسی وقت ایک شخص ایک نہایت عمدہ کوہان دار اونٹنی لے کر حاضر ہوا، اور اس کی خدمت میں پیش کی لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اسی طرح جب ایک شخص نے ایک محصل کو بچے والی بکری دی تو اس نے کہا کہ ہم کو اس کے لینے کی ممانعت کی گئی ہے[2]۔

(۲) عرب کے مال و دولت کی کل کائنات بکریوں کے ریوڑ اور اونٹنیوں کے گلے تک محدود تھی، جو جنگلوں میں بیابانوں میں، پہاڑوں کے ... وں میں چرتے رہتے تھے، لیکن بجائے اس کے کہ دنیوی حکومتوں کی طرح جابرانہ احکام کے ساتھ لوگ ... زکوٰۃ کے جانور لاکر محصلین کے سامنے پیش کرتے، محصلوں کو خود ان دروں میں جاکر زکوٰۃ وصول کرنا پڑتی تھی، ایک صحابی کا بیان ہے کہ میں پہاڑ کے ایک درہ میں بکریاں چرا رہا تھا کہ دو شخص اونٹ پر سوار ہو

[1] اصابہ باب صفوان [2] نسائی صفحہ ۳۹۰ [3] نسائی صفحہ ۲۹۳۔

کر آئے اور کہا ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد ہیں، یہاں تمہاری بکریوں کا صدقہ وصول کرنے کے لئے آئے ہیں، میں نے ایک بچہ والی شیر دار بکری پیش کی، لیکن انھوں نے کہا کہ ہم کو اس کے لینے کا حکم نہیں، میں نے ایک دوسرا بچہ دیا تو انھوں نے اس کو اپنے اونٹ پر لاد لیا اور چلتے ہوئے[1]۔

(۳) اگرچہ صحابہؓ اپنے تقدس اور پاک باطنی کی بناء پر ہر قسم کے ناجائز مال لینے سے خود احتراز کرتے تھے، چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن رواحہ کو خیبر کے یہودیوں کے پاس بھیجا کہ وہاں کی زراعت کی نصف پیداوار حسب معاہدہ تقسیم کرا کے لائیں تو انھوں نے ان کو رشوت دینا چاہی تو انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اے خدا کے دشمنو! کیا مجھے حرام مال کھلانا چاہتے ہو[2]؟ لیکن بایں ہمہ زہد و تقدس جب محصل اپنے دورہ سے واپس آتے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کا محاسبہ فرماتے تھے، چنانچہ ایک بار آپ نے ابن اللتبیہ کو صدقہ وصول کرنے کے لئے روانہ فرمایا جب وہ واپس ہوئے اور آپ نے ان کا محاسبہ کیا، تو انھوں نے کہا یہ مال آپ کا ہے اور یہ مجھے ہدیہ ملا ہے، یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ تم کو گھر بیٹھے بیٹھے ہدیہ کیوں نہیں ملا؟ اس پر بھی تسکین نہیں ہوئی تو ایک عام خطبہ دیا اور تمام لوگوں کو اس قسم کے مال لینے سے سختی کے ساتھ ممانعت فرمائی[3]۔

(۴) چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خاندان پر صدقہ و زکوٰۃ کا مال حرام کر دیا تھا اس لئے خاندان نبوت کا کوئی فرد صدقہ کا محصل مقرر نہیں ہوا۔ ایک بار عبدالمطلب بن ربیعہ بن حارث اور فضل ابن عباس نے کہ عم زاد بھائی اور بھتیجے تھے، آپ کی خدمت میں درخواست کی کہ اب ہمارا سن نکاح کے قابل ہو گیا ہے، تمام لوگوں کی طرح ہم کو بھی صدقہ کا عامل مقرر فرما دیجئے تاکہ اس کے معاوضہ سے کچھ مال جمع کر کے نکاح کے لئے سرمایہ مہیا کریں۔ لیکن آپ نے فرمایا کہ صدقہ آل محمد کے لئے جائز نہیں ہے وہ لوگوں کا میل ہے[4]۔

(۵) عمال کا انتخاب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے اور جو لوگ اپنے آپ کو اس خدمت کے لئے خود پیش کرتے تھے ان کی درخواست نامنظور ہوتی تھی، چنانچہ ابوموسیٰ اشعریؓ کے ساتھ دو شخص آئے اور عامل بننے کی درخواست کی، آپ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم کیا کہتے ہو؟ انھوں نے کہا کہ مجھ کو یہ خبر نہ تھی کہ یہ لوگ اس غرض سے آئے ہیں۔ آپ نے ان دونوں کی درخواست نامنظور کی اور فرمایا کہ جو لوگ خود خواہش کرتے ہیں ہم ان کو عامل مقرر نہیں کرتے، لیکن اسی وقت حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو بلا درخواست یمن کا عامل مقرر کر کے روانہ فرمایا[5]۔

(۶) عمال کو صرف بقدر ضرورت معاوضہ ملتا تھا۔ آپ نے عام منادی فرما دی تھی کہ جو شخص ہماری مقررہ شرح سے زیادہ لے گا، وہ خیانت مالی ہے، مقدار ضرورت کی تصریح خود آپ نے فرما دی تھی[6]۔

من کان لنا عاملا فلیکتسب زوجۃ فان لم یکن له خادم فلیکتسب خادما فان لم یکن له مسکن	جو شخص ہمارا عامل ہو اس کو ایک بی بی کا خرچ لینا چاہیئے اگر اس کے پاس نوکر نہ ہو تو نوکر کا، اگر مکان نہ ہو تو مکان کا لیکن اگر

[1] نسائی صفحہ ۲۹۳ [2] فتوح البلدان صفحہ ۳۱ [3] صحیح مسلم ج ۲ صفحہ ۱۱۳ [4] صحاح کتاب الصدقات [5] صحیح مسلم ج ۲ صفحہ ۱۰۹۔ [6] ابوداؤد جلد ۲ باب ارزاق العمال میں دونوں حدیثیں شامل ہیں۔

فلیلتمس مسکنا ومن اتخذ غیر ذالک فہو غال۔ کوئی اس سے زیادہ لے گا تو وہ خائن ہوگا۔

آپ کے زمانہ میں حضرت عمر فاروقؓ کو بھی اس قسم کا معاوضہ ملا تھا، چنانچہ اُن کے عہدِ خلافت میں جب صحابہ نے زہد و تقدس کی بنا پر معاوضہ لینے سے انکار کیا تو انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی طرزِ عمل سے استدلال کیا۔[1]

قضاۃ ان مناصب کے علاوہ بعض اور عہدے بھی سادہ طور سے قائم ہو گئے تھے، مثلاً فصلِ مقدمات کا کام اگرچہ زیادہ تر آپ خود انجام دیتے تھے، لیکن کبھی کبھی آپ کے حکم سے حسبِ ذیل صحابہ نے بھی اس فرض کو انجام دیا ہے۔ حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبد الرحمٰنؓ بن عوف، ابن کعبؓ، معاذؓ بن جبل، اگرچہ خلفائے راشدین کے زمانہ میں بھی باضابطہ طور پر پولیس کا محکمہ قائم نہیں ہوا اور اس کی ابتداء بنو امیہ کی سلطنت میں ہوئی۔[2] تاہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں بھی اس کا ابتدائی نمونہ قائم ہو چکا تھا، چنانچہ آپ کے عہدِ مبارک میں قیسؓ بن سعد اس خدمت کو انجام دیتے تھے اور اس غرض سے ہمیشہ آپ کے ساتھ رہتے تھے۔[3]

جلاد مجرموں کی گردن مارنے کی خدمت حضرت زبیرؓ، حضرت علیؓ، مقداد بن الاسودؓ، محمد بن مسلمہؓ، عاصم بن ثابت ضحاک بن سفیان کلابیؓ کے سپرد تھی۔[4]

غیر قوموں سے معاہدہ عرب میں اب کفر و شرک کا بالکل وجود نہ تھا، کہیں کہیں صرف مجوس، نصاریٰ اور یہود کی آبادیاں تھیں، ان میں سے معتدبہ افراد نے گو نورِ ایمان سے قلوب کو روشن کر لیا تھا لیکن مجموعی حیثیت سے وہ اب تک تاریکی میں تھے، تاہم خلافتِ الٰہی کی ہمہ گیر قوت سے وہ سرتابی نہ کر سکے۔ حجاز کے یہودیوں کے سوا عرب کی تمام قوموں نے بخوشی اسلام کی اطاعت قبول کی۔ اس لئے اسلام نے بھی اُن کی جان و مال، عزت و آبرو اور مذہب کی حفاظت کی تمام ذمہ داری اپنے سر لے لی اور اس کے مقابلہ میں جزیہ کی ایک خفیف رقم (یعنی ہر مستطیع عاقل بالغ مرد پر ایک دینار سالانہ) ان پر مقرر کی، اس رقم کا نقد روپیہ کی صورت میں ادا ہونا ضروری نہ تھا بلکہ عموماً جہاں جس چیز کی پیداوار ہوتی تھی یا جو چیز بنتی تھی وہی چیز جزیہ قرار پائی۔[5]

غیر قوموں میں سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۷ھ میں خیبر، فدک، وادی القریٰ، تیما کے یہودیوں سے مصالحت فرمائی اس وقت تک آیتِ جزیہ کا نزول نہیں ہوا تھا، اس بناء پر باہمی رضامندی سے جو شرائط قرار پا گئے تھے وہ آیتِ جزیہ کے نزول کے بعد بھی قائم رہے۔[6] اصل شرط یہ تھی کہ وہ رعایا کی حیثیت سے کام کریں گے اور پیداوار کا نصف حصہ خود لیں گے اور نصف مالکوں کو ادا کریں گے۔[7]

۹ھ میں جزیہ کی آیت نازل ہوئی اس کے بعد تمام معاہدے اسی کی رُو سے قرار پاتے۔ نجران کے عیسائیوں نے مدینہ میں آکر مصالحت کی درخواست کی جس کو آپ نے منظور فرمایا، شرائطِ صلح یہ تھے کہ وہ مسلمانوں کو سالانہ دو ہزار کپڑے دیں گے اور اُن کو دو قسطوں میں یعنی آدھا ماہِ صفر اور آدھا ماہِ رجب میں ادا کریں گے، اگر یمن میں بھی کبھی بغاوت

---

[1] فتح الباری جلد ۱۳ صفحہ ۱۶۰ [2] بخاری کتاب الاحکام [3] زاد المعاد ابن قیم [4] ایضاً [5] فصل جزیہ [6] زاد المعاد ابن قیم جلد اول۔
[7] بخاری ومسلم وابوداؤد، ذکر خیبر و فتوح البلدان بلاذری ذکر فدک و وادی القریٰ و تیما۔

یا شورش ہوگی تو وہ عاریۃً تیس زرہیں، تیس گھوڑے اور تیس تیس عدد ہر قسم کے ہتھیار دیں گے اور مسلمان اُنکی واپسی کے ضامن ہوں گے، اس کے معاوضہ میں جب تک وہ سودی لین دین یا بغاوت نہ کریں گے، نہ ان کے گرجے ڈھائے جائیں گے نہ اُن کے پادری نکالے جائیں گے، نہ اُن کو اُن کے مذہب سے برگشتہ کیا جائے گا۔[1]

حدودِ شام میں بہت سے عیسائی اور یہودی گاؤں میں آباد تھے، رجب ۹ھ میں غزوہ تبوک کے موقع پر دومۃ الجندل، ایلہ، مقنا، جربا، اذرح، تبالہ اور جرش کے جو عیسائی اور یہودی زمیندار اسلام نہیں لاتے بلکہ جزیہ دینا قبول کیا، اُن میں سے ہر بالغ مرد پر ایک دینار سالانہ مقرر ہوا، اور مسلمان جب ادھر سے گزریں تو اُن کی ضیافت بھی ان پر لازمی قرار دی گئی۔[2] ایک آسانی یہ بھی دی گئی کہ اگر نقد نہ ادا کر سکیں تو اسی کے برابر معافری کپڑے دیا کریں۔[3] بحرین کے مجوسیوں سے بھی جزیہ کی اسی شرح مقدار پر مصالحت کی گئی۔[4]

اصنافِ محاصل و مخارج مختلف اغراض و مصالح کی بنا پر اسلام میں آمدنی کے صرف پانچ ذرائع تھے، غنیمت فئی، زکوٰۃ، جزیہ، خراج۔ اول و دوم کے سوا بقیہ ذرائع آمدنی سالانہ تھے۔ غنیمت کا مال صرف فتوحات کے موقع پر آتا تھا، عرب میں قاعدہ تھا کہ رئیسِ فوج غنیمت کا چوتھا حصہ خود لیتا تھا جس کو اصطلاح میں مرباع کہتے تھے اور بقیہ جو جس کے ہاتھ لگ جاتا تھا لے لیتا تھا، تقسیم کا کوئی نظام نہ تھا، غزوۂ بدر کے بعد خدا نے غنیمت کو خود اپنی ملک قرار دیا جس میں خمس یعنی پانچواں حصہ خدا اور رسول کے نام سے حکومتِ الٰہی کے مصالح و اغراض کے لئے مخصوص فرمایا۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (انفال)

اے پیغمبر! لوگ تجھ سے مالِ غنیمت کی نسبت پوچھتے ہیں کہہ دے کہ وہ خدا اور رسول کی ملک ہے۔

خدا اور رسول کی ملکیت سے مقصود یہ ہے کہ وہ سپاہیوں کی شخصی ملکیت نہیں ہے بلکہ مصالح کی بناء پر صاحبِ خلافت جس طرح مناسب سمجھے اس کو صرف کر سکتا ہے۔ اسی طرح خمس کی نسبت ارشاد ہوا ہے۔

وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (انفال)

مسلمانو! جان لو کہ تم کو جو مالِ غنیمت ہاتھ آئے اس کا پانچواں حصہ خدا اور رسول، اہلِ قرابت اور یتیموں اور مسکینوں کا ہے۔

ایک دو استثنائی واقعہ کے سوا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مالِ غنیمت مخصوص مہاجرین کو یا مکہ کے نومسلموں کو عنایت فرمایا، ہمیشہ آپ کا یہ طرزِ عمل رہا کہ خمس کے بعد ایک ایک حبہ سپاہیوں پر برابر برابر تقسیم فرما دیتے تھے، سواروں کو تین حصے اور پاپیادہ کو ایک حصہ۔ بعض روایتوں میں ہے کہ سواروں کو صرف دو حصے ملتے تھے۔[5] خمس کا بھی عموماً بہت کم حصہ ذاتی مصرف میں آتا تھا۔ آیتِ بالا میں جن اربابِ استحقاق کا ذکر ہے زیادہ تر انہی پر صرف کر دیا جاتا تھا۔

---

[1] ابوداؤد کتاب الخراج باب اخذ الجزیہ [2] فتوح البلدان بلاذری [3] ابوداؤد باب اخذ الجزیہ [4] ابوداؤد باب اخذ الجزیہ من المجوس و تاریخ بلاذری ذکر بحرین۔ [5] ابوداؤد حکم ارضِ خیبر بروایت مجمع۔

زکوٰۃ:- صرف مسلمانوں پر فرض تھی اور وہ چار مدوں سے وصول ہوتی تھی، نقد روپیہ[1] اشیل اور پیداوار، مویشی (بجز گھوڑا) اسبابِ تجارت[2]، دو سو درہم چاندی، بیس مثقال سونے اور پانچ اونٹ سے کم پر زکوٰۃ نہ تھی، پیداوار سے جو زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی، اس کے لئے ضروری تھا کہ اس کی مقدار ۵ وسق (۳۰۰ صاع بہ تحقیق امام ترمذی) یا پانچ وسق سے زیادہ ہو، سونا اور چاندی کا چالیسواں حصہ وصول کیا جاتا تھا، مویشیوں کا نرخ زکوٰۃ بھی مختلف جنس کی مختلف تعداد پر مقرر تھا جو حدیث اور فقہ کی تمام کتابوں میں مفصل مذکور ہے، الاضی کی دو قسمیں کی گئیں، ایک وہ جس کی سیرابی صرف بارش یا بہتے پانی سے ہوتی تھی، اس قسم کی اراضی کی پیداوار میں دسواں حصہ (عشر) وصول ہوتا تھا، اور جس کو آبپاشی کے ذریعہ سے سیراب کیا جاتا تھا، اس میں نصف (عشر) یعنی بیسواں حصہ لیا جاتا تھا، سبزی پر کوئی زکوٰۃ نہ تھی[3]۔

زکوٰۃ کے آٹھ مصرف تھے جن کی تفصیل خود قرآن مجید نے کر دی تھی، فقراء، مساکین، نومسلم، غلام جن کو فدیہ کر آزاد کرانا ہے، مقروض، مسافر، محصلینِ زکوٰۃ کی تنخواہ، دیگر کارِ خیر، عموماً جہاں سے زکوٰۃ کی رقم وصول کی جاتی تھی، وہیں کے مستحقین پر صرف کر دی جاتی تھی، صحابہ اس حکم اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ ایک صحابی کو زیاد نے عامل بنا کر ایک مقام میں بھیجا جب وہ واپس آئے تو زیاد نے اُن سے رقم کا مطالبہ کیا، انھوں نے جواب میں کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے جس طرح ہم کرتے آئے تھے وہی ہم نے کیا[4]، معاذؓ بن جبل جب عامل بنا کر یمن بھیجے گئے تو زکوٰۃ کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، وصدقۃ توخذ من اغنیائھم وترد علی فقرائھم

جزیہ غیر مسلم رعایہ سے اُن کی حفاظت اور ذمہ داری کے معاوضہ میں لیا جاتا تھا، اس کی مقدار متعین نہ تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ میں ہر مستطیع بالغ مرد سے ایک دینار وصول کرنے کا حکم دیا تھا، بچے اور عورتیں اس میں داخل نہ تھیں، ایلہ کے جزیہ کی مقدار ۳۰۰ دینار تھی، عہدِ نبوی میں جزیہ کی سب سے بڑی مقدار بحرین سے وصول ہوتی تھی۔

خراج غیر مسلم کاشت کاروں سے حقِ مالکانہ کے معاوضہ میں زمین کی پیداوار کا جو مخصوص حصہ باہمی مصالحت سے طے ہو گیا ہو اس کا نام خراج ہے، خیبر، فدک، وادی القریٰ، تیما، وغیرہ سے خراج ہی وصول ہوتا تھا، پھل یا پیداوار کے تیار ہونے کا وقت جب آتا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی صحابی کو بھیج دیتے تھے وہ باغوں اور کھیتوں کو دیکھ کر تخمینہ لگاتے تھے، رفعِ اشتباہ کے لئے تخمینہ میں سے ثلث کم کر دیا جاتا تھا، بقیہ پر حسب شرائط خراج وصول کیا جاتا، خیبر وغیرہ میں آدھی پیداوار پر صلح ہوتی تھی، جزیہ اور خراج کی رقم سپاہیوں کی تنخواہ اور جنگی مصارف میں صرف ہوتی تھی تمام صحابہ ضرورت کے وقت والنٹیر سپاہی تھے، جو کچھ وصول ہو کر آتا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب کو اسی وقت تقسیم فرما دیتے سا قول آپؐ اُن لوگوں کو عطا فرماتے تھے جو پہلے غلام رہ چکے تھے، ایک رجسٹر پر لوگوں کے نام لکھے ہوتے تھے اسی ترتیب سے نام پکارے جاتے تھے جو لوگ صاحب اہل وعیال ہوتے تھے ان کے دو حصے

[1] ابو داؤد کتاب الزکوٰۃ باب العروض اذا کانت للتجارۃ [2] صحیح بخاری، ۱۲۰ ص ۲۰۱ [3] ترمذی کتاب الزکوٰۃ [4] ایضاً [5] ابو داؤد کتاب الزکوٰۃ باب الصدقۃ تحمل فی البلدان جلد ۱ بحوالہ مذکور باب فی الحرص۔

اور مجرد لوگوں کو ایک حصہ ملتا تھا۔

جاگیریں اور افتادہ زمینوں کی آبادی

ملکِ عرب کا اکثر حصہ ریگستانی، پتھریلا، شور اور بنجر تھا جو سبز قطعات تھے اُن پر بیرونی قومیں قابض تھیں، بقیہ افتادہ زمینیں تھیں مدینہ اور طائف میں البتہ کاشت کاری ہوتی تھی، بقیہ عام عرب تجارت یا لوٹ مار پر زندگی بسر کرتے تھے۔ عربوں کی غیر مامون زندگی کا راز یہی تھا کہ وہ مستقل پیشہ ور نہ تھے۔ اس بنا پر قیامِ امن کے لئے بھی ضروری تھا کہ زمین کا نئے سرے سے بندوبست کیا جائے، حجاز یمن میں غیر قوموں کے انخلاء کے سبب سے یوں بھی بہت سی زمینیں خالی ہو گئی تھیں جن کا انتظام ضروری تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عام طور پر صحابہ کو اس کی ترغیب دی۔

من احیا ارضا میتۃ فھی لہ من احاط حائطا علی ارض فھی لہٗ۔ — جس شخص نے افتادہ زمینوں کو آباد کیا وہ اس کی ملک ہے جس شخص نے کسی زمین کو گھیر لیا وہ اس کی ملک ہے۔

ترغیب عام کے ساتھ خاص خاص انتظامات بھی فرماتے، بنو نضیر اور قریظہ کے نخلستان اور کھیت خاص بارگاہِ نبوت کی ملک قرار پائے اور آپؐ نے اپنی طرف سے ان کو مہاجرین اور بعض انصار میں تقسیم فرما دیا، خیبر کی زمین کچھ خالصہ رہی اور بقیہ ان مہاجرین و انصار میں تقسیم فرما دی جو حدیبیہ میں شریک تھے لیکن عملاً یہودیوں کے ساتھ ان کا بندوبست رہا۔ پیداوار کا نصف حصہ وہ خود لیتے تھے اور نصف مالکوں کو ادا کرتے تھے اور جو زمینیں آباد تھیں ان کو بعض شرائط پر اصل مالک کے ہاتھ میں رہنے دیا، چنانچہ عک، ذوخیوان اور ایلہ، اذرح، نجران وغیرہ میں اسی طرح معاملات طے پائے۔ افتادہ زمینیں بھی صحابہ کو بطور جاگیر عطا فرمائیں۔ حضرت وائل کو حضر موت میں ایک قطعہ زمین عنایت فرمایا بلالؓ بن حارث مزنی کو قابلِ زراعت زمین کا ایک بہت بڑا ٹکڑا اور کانیں مرحمت فرمائیں۔ حضرت زبیرؓ کو مدینہ کے پاس اور حضرت عمرؓ کو خیبر میں جاگیریں عطا کیں۔ بنو رفاعہ کو دومۃ الجندل کے پاس زمین عنایت کی۔

یہ جاگیریں اس فیاضی اور وسعت کے ساتھ دی جاتی تھیں کہ ہر شخص حسب استطاعت اُن کا انتخاب اور اُن کے رقبہ کی تحدید کر سکتا تھا۔ ایک بار آپؐ نے حضرت زبیرؓ کو حکم دیا کہ جہاں تک ان کا گھوڑا دوڑ سکے وہ زمین ان کی جاگیر میں داخل ہو گی، چنانچہ انھوں نے گھوڑا دوڑایا جب تک گھوڑا ایک خاص حد تک پہنچ کر رک گیا تو انھوں نے اپنا کوڑا پھینکا اور وہ جس نقطے پر گرا وہی ان کی جاگیر کا رقبہ قرار پایا۔ عرب کی خشک زمین میں سب سے زیادہ ضرورت چشمہ ہائے آب کی تھی، چنانچہ ایک بار جب آپؐ نے حکم دیا من سبق الی مالم یسبقہ الیہ مسلم فھو لہ یعنی جو شخص ایسے چشمہ پر قبضہ کر لے جس پر کسی مسلمان نے قبضہ نہیں کیا ہے تو وہ اس کا ہے۔ تو تمام لوگوں نے دوڑ دوڑ کر اپنے اپنے چشموں کے حدود مقرر کر لئے۔

اس فیاضی کی اس قدر شہرت ہوئی کہ لوگوں نے دور دور سے آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جاگیروں کی درخواست کرنا شروع کی، ابیض بن حمال یمن سے خدمتِ مبارک میں حاضر ہوئے اور ایک نمک کی کان کی درخواست

[1] ابو داؤد کتاب الخراج باب قسم الفئی۔

کی جس کو آپ نے منظور فرمالیا۔ لیکن ایک صحابی نے کہا کہ آپؐ نے ان کو جو کچھ جاگیر میں عطا فرمایا ہے وہ پانی کا ایک بہت بڑا چشمہ ہے، چونکہ وہ ایک پبلک چیز تھی، اس بنا پر آپؐ نے اس کو واپس لے لیا۔

یہ تمام فیاضیاں صرف انہی چیزوں کے ساتھ مخصوص تھیں جن کا تعلق پبلک کے ساتھ نہیں تھا، لیکن جو چیزیں رفاہِ عام کے کام آسکتی تھیں ان کو آپؐ نے اسی قدیم حالت پر چھوڑ دیا۔ عرب کا قدیم دستور تھا کہ اپنے مویشیوں کیلئے چراگاہیں متعین کر لیتے تھے جن کو حمیٰ کہتے تھے۔ عرب میں پیلو کا درخت اونٹوں کی عام غذا تھی اور اس کے متعلق کسی قسم کی روک ٹوک نہ تھی لیکن ابیض ابنؓ حمال نے جب اس کو اپنے حمیٰ میں داخل کرنا چاہا تو آپؐ نے منع فرمایا۔ لاحمی فی الاراک۔ عرب میں یہ بھی دستور تھا کہ مویشیوں کے چرانے کے لئے رؤسا اور اربابِ اقتدار اپنے لئے چراگاہ مخصوص کر لیتے تھے اور وہاں کسی دوسرے کو نہیں آنے دیتے تھے۔ چونکہ اس سے عام لوگوں کو تکلیف ہوتی تھی اس لئے اس طریقہ کو بھی روک دیا۔

اسی طرح عرب میں ایک مقام دہنا ہے جس کے ایک طرف بکر بن وائل کا قبیلہ تھا اور دوسری طرف بنو تمیم رہتے تھے، حریث بن حسان نے بکر بن وائل کے لئے اس زمین کی درخواست کی، آپؐ نے فرمان لکھنے کا حکم دیا۔ اتفاق سے اس وقت ایک تمیمیہ موجود تھی، آپؐ نے اس کی طرف دیکھا، اس نے عرض کی، یا رسول اللہ! وہ اونٹوں اور بکریوں کی چراگاہ ہے اور اسی کے پاس بنو تمیم کی عورتیں اور بچے بھی رہتے ہیں، آپؐ نے فرمایا "بے چاری سچ کہتی ہے فرمان نہ لکھو" ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، ایک چشمہ اور ایک چراگاہ سب کو کافی ہو سکتا ہے۔[1]

★

---

[1] یہ تمام واقعات ابوداؤد کتاب الخراج کے مختلف ابواب میں مذکور ہیں۔

مذہبی انتظامات

ملک میں امن قائم رکھنے کی غرض سے جو بعض ضروری انتظامات سر انجام پائے تھے اُن سے زیادہ ضروری مسلمانوں کے مذہبی امور کے انتظامات کا مسئلہ تھا۔ یہودیوں میں مذہبی فرائض کے ادا کرنے کے لئے ایک مخصوص خاندان مقرر تھا، اس کے علاوہ کسی اور کو ان خدمات کی بجا آوری کا حق حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ عیسائیوں میں گو خاندان کی تخصیص نہ تھی لیکن ان میں ایک خاص طبقہ پیدا ہو گیا تھا، جس نے ان خدمات کو اپنا حق قرار دے لیا تھا، ہندوؤں میں غیر برہمن کسی مذہبی خدمت کا مستحق نہیں، دنیا کی دوسری قوموں کا بھی یہی حال تھا لیکن جو شریعت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں قائم کی اس میں مخصوص اشخاص، مخصوص خاندان اور مخصوص طبقہ کی حاجت نہ تھی بلکہ ہر شخص جو اسلام کا کلمہ گو تھا اس رتبہ کا مستحق ہو سکتا تھا۔

دعاۃ اور مبلغینِ اسلام

ایک مشہور مغربی مؤرخ نے لکھا ہے کہ مدینہ میں آکر اسلام نبوت کا منصب چھوڑ کر سلطنت بن گیا تھا اور اب اسلام کے معنی بجائے اس کے کہ خدا پر ایمان لایا جائے یہ رہ گئے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حکومت تسلیم کر لی جائے۔[1] اسلام کا مقصد وہ تھا جو خدا نے قرآن مجید میں بیان کیا ہے۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ

(وہ لوگ جن کو ہم زمین میں اگر طاقت دیں تو نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں، اچھی باتوں کا حکم دیں اور بری باتوں سے روکیں)

اس بنا پر ہر مسلمان واعظ بھی ہوتا تھا اور محتسب بھی، داعیٔ مذہب بھی اور ماہرِ شریعت بھی۔ یہی وجہ ہے کہ یا تو اسلام سے پہلے عرب میں اس قدر جہالت پائی جاتی تھی کہ اکثر شرفاء میں لکھنا پڑھنا عیب خیال کیا جاتا تھا یا ایک ایک گھر فقہ، حدیث اور تفسیر کا دار العلم بن گیا۔ تاہم چونکہ ہر شخص کو تفقہ و تدریس کا کافی وقت نہیں مل سکتا تھا اس لئے ضروری قرار دیا گیا کہ ہر جماعت اور ہر قبیلہ میں کچھ ایسے لوگ موجود رہیں جو تعلیم و ارشاد کا فرض انجام دے سکیں۔ اسی بناء پر قرآن مجید میں حکم آیا۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ (توبہ ۱۴)

(اور سب کے سب مسلمان تو سفر کر کے (مدینہ) نہیں آسکتے اس لئے ہر قبیلہ سے ایک گروہ کو آنا چاہیے تاکہ وہ شریعت (دین) میں تفقہ حاصل کریں اور تاکہ واپس جا کر اپنی قوم کو ڈرائیں شاید یہ لوگ بری باتوں سے بچیں۔)

---

[1] دیکھو ولہاوسن صاحب کا آرٹیکل اسلام پر انسائیکلوپیڈیا

اُن کی تعلیم و تربیت

چونکہ مقصد یہ تھا کہ ایک ایسی جماعت تیار کی جائے جو نہ صرف شریعت کے اوامر و نواہی سے واقف ہو کر شب و روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہنے سے تمام تر اسلامی رنگ میں ڈوب جائے، جس کی گفتار، کردار، بات چیت، نشست و برخاست، قول و عمل، ایک ایک چیز تعلیم نبوی کے پرتو سے منور ہو جائے تاکہ وہ تمام ملک کے لئے اسوۂ حسنہ اور نمونۂ عمل بن سکے، اس لئے عرب کے ہر قبیلہ سے ایک جماعت آتی تھی اور آپ کی خدمت میں رہ کر تعلیمات سے بہرہ اندوز ہوتی تھی۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے۔

کان ینطلق من کل حی من العرب عصابۃ فیأتون النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیسألونہ عما یریدون من امر دینھم و یتفقھوا فی دینھم۔[۱]

عرب کے ہر قبیلہ کا ایک گروہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتا تھا اور آپ سے مذہبی امور دریافت کرتا تھا اور دین میں تفقہ حاصل کرتا تھا۔

داعیانِ اسلام جو اطرافِ عرب میں بھیجے جاتے تھے اُن کو ہدایت کی جاتی تھی کہ لوگوں کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وطن چھوڑ کر مدینہ میں آجائیں اور یہیں بود و باش اختیار کریں، اس کا نام ہجرت تھا۔ اس بناء پر بیعت کی دو قسمیں کر دی گئی تھیں، بیعتِ اعرابی اور بیعتِ ہجرت۔ بیعتِ اعرابی صرف ان بدوؤں کے لئے تھی جن کو کچھ دنوں مدینہ منورہ میں رکھ کر تعلیم دینا مقصود تھا۔ مختصر مشکل الآثار میں روایت ہے کہ عقبہ جہنی جب اسلام لائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا کہ بیعتِ اعرابی کرتے ہو یا بیعتِ ہجرت۔ اس کے بعد مصنف لکھتا ہے۔

ان البیعۃ من المھاجر توجب الاقامۃ عندہ (صلی اللہ علیہ وسلم) لیعرف فیما یصرفہ فیہ من امور الاسلام و بخلاف البیعۃ الاعرابیۃ۔

ہجرت کی بیعت کرنے سے لازم ہو جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قیام کرے تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اسلامی امور میں لگائیں اور بیعتِ اعرابی میں یہ ضرور نہیں۔

اسی بناء پر عرب کے بہت سے خاندان اپنے گھروں سے ہجرت کر کے مدینہ میں چلے آتے تھے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ آئے تو اسی شخصوں کو لے کر آئے اور مدینہ میں آباد ہوئے۔ خلاصۃ الوفا سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں جہنیہ وغیرہ قبائل کی الگ الگ مسجدیں تھیں، یہ وہی قبائل تھے جو ہجرت کر کے مدینہ آگئے تھے اور چونکہ مسجد نبوی سب کے لئے کافی نہ تھی اس لئے الگ الگ مسجدیں بن گئی تھیں۔

تعلیم و ارشاد کے مختلف طریقے تھے۔

ایک یہ کہ دس بیس دن یا مہینہ دو مہینہ رہ کر عقائد اور فقہ کے ضروری مسائل سیکھ لیتے تھے اور اپنے قبائل میں واپس جاتے تھے اور اُن کو تعلیم دیتے تھے۔ مثلاً مالک بن الحویرث جب سفارت لے کر آئے تو بیس دن قیام کیا اور ضروری مسائل کی تعلیم حاصل کی، جب چلنے لگے تو آپ نے فرمایا۔

ارجعوا الی اھلیکم فعلموھم و مروھم و صلوا کما رأیتمونی اُصلی۔

اپنے خاندان میں واپس جاؤ، ان میں رہ کر ان کو احکام شریعت کی تعلیم دو اور جس طرح مجھ کو نماز پڑھتے دیکھا ہے

[۱] تفسیر خازن سورۂ توبہ آیت وما کان المؤمنون لینفروا کافۃ۔

(بخاری باب رحمۃ البہائم) اسی طرح نماز پڑھو۔

دوسرا مستقل طریقہ درس کا تھا، یعنی لوگ مستقل طریقہ سے مدینہ میں رہتے تھے اور عقائد شریعت اور اخلاق کی تعلیم پاتے تھے، اُن کے لئے صفہ خاص درس گاہ تھی اور اس میں زیادہ تر وہ لوگ قیام کرتے تھے جو تمام دنیاوی تعلقات سے آزاد ہو کر شب و روز زہد و عبادت اور زیادہ تر خدمتِ علم میں مصروف رہتے تھے۔

مشکوٰۃ کتاب العلم میں روایت ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لے گئے، اس وقت مسجد میں دو حلقے تھے، حلقۂ ذکر اور حلقۂ درس۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حلقۂ درس میں جا کر بیٹھ گئے۔ اس وقت کی اصطلاح میں ان طالبانِ علم کو قرا کہتے تھے، چنانچہ صحیح بخاری وغیرہ میں ہر جگہ یہی نام آتا ہے۔ عرینہ میں جو لوگ تعلیم و ارشاد کے لئے گئے تھے اور کفار نے ان کو دھوکے سے شہید کر دیا تھا وہ اسی درس گاہ کے تربیت یافتہ تھے اور کتب حدیث میں ان کا نام اسی لقب (قرا) کے ساتھ آیا ہے۔[۱] اربابِ سیر نے لکھا ہے کہ ان لوگوں میں سے جب کوئی شادی کر لیتا تھا تو اس جماعت سے نکل آتا تھا اور ان کے بجائے دوسرے لوگ داخل ہوتے تھے۔

اصحابِ صفہ اگرچہ اس قدر مفلس و نادار تھے کہ کسی کے پاس ایک کپڑے سے زیادہ نہیں ہوتا تھا جس کو گردن سے باندھ کر گھٹنوں تک چھوڑ دیتے تھے کہ چادر اور تہمد دونوں کا کام دیتا تھا، تاہم یہ لوگ پاؤں توڑ کر نہیں بیٹھتے تھے بلکہ جنگل میں جا کر لکڑیاں چن لاتے تھے اور اُن کو بیچ کر آدھا خیرات کر دیتے تھے اور آدھا اخوانِ طریقت میں تقسیم ہوتا تھا، اس بناء پر تعلیم اور درس کا وقت رات کو مقرر کیا گیا، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس درسگاہ کے معلمین میں حضرت عبادہؓ بن الصامت بھی تھے جو مشہور صاحبِ علم تھے اور جن کو حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں تعلیمِ فقہ و قرآن کے لئے فلسطین بھیجا تھا۔ ابوداؤد میں حضرت عبادہؓ بن الصامت سے روایت ہے۔

علمت ناسا من اھل الصفۃ القرآن والکتاب فاھدی الی رجل منھم قوسا (ص ۱۲۹ جلد دوم)

میں نے اصحابِ صفہ میں سے چند لوگوں کو قرآن مجید اور لکھنے کی تعلیم دی اس کے صلہ میں مجھ کو ایک شخص نے ایک کمان تحفہ میں دی۔

ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادہؓ کو اس تحفہ کے قبول کرنے کی اجازت نہیں دی۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ درس گاہِ صفہ کے علاوہ اور بھی کوئی جگہ تھی، جہاں اصحابِ صفہ رات کو تعلیم پاتے تھے، مسند امام ابن حنبل میں ہے۔

عن انس کانوا سبعین فکانوا اذا اجنھم اللیل انطلقوا الی معلم لھم بالمدینۃ فیدرسون اللیل حتی یصبحوا (ج ۳ ص ۱۳۷)

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ اصحابِ صفہ میں سے ستر شخص رات کو ایک معلم کے پاس جاتے تھے اور صبح تک درس میں مشغول رہتے تھے۔

عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج بہت کم تھا لیکن اسلام آیا تو تحریر و کتابت کا فن بھی گویا ساتھ لے کر آیا، سب سے بڑی ضرورت قرآن مجید کے ضبط و تدوین کی تھی، اس بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع ہی سے کتابت کی ترویج کی طرف توجہ فرمائی، جنگِ بدر کے ذکر میں گزر چکا ہے کہ اسیرانِ جنگ میں سے جو لوگ فدیہ نہیں ادا کر سکے انکو اس شرط پر رہا کیا گیا کہ مدینہ میں رہ کر لوگوں کو لکھنا سکھا دیں۔ ابوداؤد کی مذکورہ بالا حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اصحاب

[۱] صحیح بخاری غزوۂ بیر معونہ۔

صفہ کو جو تعلیم دی جاتی تھی اُس میں لکھنا بھی داخل تھا، چنانچہ حضرت عبادہؓ قرآن مجید کے ساتھ لکھنے کی بھی تعلیم دیتے تھے۔[1]

مساجد کی تعمیر

آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ ترقی وجاہ پرستی سے طبعاً نفور تھے اور اس لئے اینٹ اور مٹی پر صرف زر ناپسند فرماتے تھے، تاہم چونکہ اسلام کی تمام تحریکات کا مقصد صرف رفع ذکر اور تسبیح وتقدیس الٰہی تھا، اس بنا پر ہر قبیلہ کو مسلمان ہونے کے ساتھ سب سے پہلے مسجد کی ضرورت پیش آتی تھی، ایک سبب اس کا یہ بھی تھا کہ یہ مسجدیں صرف نماز ہی پڑھنے کے کام میں نہیں آتی تھیں بلکہ درحقیقت یہ تمام اہل قریہ یا اہل محلہ کو دن رات میں پانچ بار ایک جگہ جمع کر کے ان کی اجتماعی اور اتحادی قوت کو روز بروز اور زیادہ ترقی دینے کا ذریعہ بھی بنتی تھیں، اس لئے آپؐ باجماعت نماز پڑھنے کی سخت تاکید فرماتے تھے، خود مدینہ کے اندر بہت سے قبائل آباد تھے، ہر قبیلہ کا الگ الگ محلہ تھا اور ہر محلہ میں ایک ایک مسجد تھی۔

ابوداؤد نے کتاب المراسیل میں بسند لکھا ہے کہ صرف مدینہ کے اندر آپؐ کے زمانہ میں نو مسجدیں تھیں۔ جہاں الگ الگ جماعتیں ہوتی تھیں، اُن کے نام یہ ہیں۔ مسجد بنی عمر، مسجد بنی ساعدہ، مسجد بنی عبید، مسجد بنی سلمہ، مسجد بنی رائح، مسجد بنی زریق، مسجد غفار، مسجد اسلم، مسجد جہینہ۔ ان کے علاوہ متفرق روایات میں مختلف قبائل کی حسب ذیل مسجدوں کا اور پتہ لگتا ہے، مسجد بنی خدارہ، مسجد بنی امیہ (انصار کا ایک قبیلہ تھا) مسجد بنی بیاضہ، مسجد بنی الحبلی، مسجد بنی عصیہ، مسجد ابی فیصلی، مسجد بنی دینار، مسجد ابی ابن کعب، مسجد النابغہ، مسجد ابن عدی، مسجد الحارث بن خزرج، مسجد بنی حطمہ، مسجد الفضیخ، مسجد بنی حارثہ، مسجد بنی ظفر، مسجد بنی عبدالاشہل، مسجد واقم، مسجد بنی معاویہ، مسجد بنی قریظہ، مسجد بنی وائل، مسجد الشجرہ۔[2]

روایتوں سے یہ بھی ثابت ہے کہ اشاعت اسلام کے ساتھ مدینہ سے باہر عرب کے گوشہ گوشہ میں مسجدیں بنتی جاتی تھیں جہاں دن میں پانچ بار خدا کا نام پکارا جاتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوات میں معمول کر لیا تھا کہ رات بھر انتظار فرماتے تھے، صبح کو جہاں سے اذان کی آواز آتی وہاں حملہ نہ فرماتے، چنانچہ ایک سفر جہاد میں آپؐ کے کانوں میں ایک طرف سے اللہ اکبر کی آواز آئی تو آپؐ نے فرمایا "یہ تو فطری شہادت ہے"[3] اس کے بعد آپؐ نے اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی آواز سنی تو فرمایا، آگ سے نجات ہوگی، صحابہ نے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو معلوم ہوا کہ بکرے کے چرواہے کی آواز تھی، تمام مجاہدین اسلام کو بھی یہی حکم تھا، چنانچہ ایک بار آپؐ نے ایک سریہ کو روانہ کیا تو یہ وصیت فرمائی۔

اذا رأیتم مسجدًا او سمعتم صوتًا فلا تقتلوا احدًا[4]	اگر کہیں مسجد دیکھو یا اذان کی آواز سنو تو وہاں کسی شخص کو قتل نہ کرنا۔

ان روایتوں سے ایک طرف تو عہد نبوت میں اشاعت اسلام کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے اور دوسری طرف

[1] اصابہ فتح باب المعوذتین [2] یہ تمام تفصیل عینی شرح بخاری جلد ۲ صفحہ ۴۹ سے ماخوذ ہے [3] صحیح مسلم جلد اول کتاب الاذان باب الامساک عن الاغارہ علی قوم فی دار الکفر اذا سمع فیہم الاذان [4] ابوداؤد کتاب الجہاد فی دعاء المشرکین۔

سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو قبائل اسلام لاتے تھے انھوں نے الگ الگ مسجدیں تعمیر کر لی تھیں اور ان میں پنج وقتہ غلغلۂ تکبیر و اذان بلند ہوا کرتا تھا۔

اگرچہ اس وقت کی عام غربت اور سادگی کی وجہ سے جو مسجدیں تعمیر ہوئی تھیں وہ ایک زمانہ ممتد تک قائم نہیں رہ سکتی تھیں، اس لئے ان باقیات صالحات کا بہت بڑا حصہ صفحۂ ہستی سے مٹ گیا اور ان کے ساتھ ان کا نام اور اُن کی تاریخ بھی مٹ گئی، تاہم جو مسجدیں مدتوں قائم رہیں ان کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کا کوئی گوشہ ان مذہبی یادگاروں سے خالی نہ تھا۔

عرب کے عام قبائل سے بحرین کا ایک قبیلہ عبدالقیس اسلام لا چکا تھا، اس قبیلے نے ایک مسجد تعمیر کی تھی چنانچہ اسلام میں مسجد نبویؐ کے بعد سب سے پہلے جمعہ کی نماز اسی مسجد میں ادا کی گئی، بخاری کتاب الجمعہ میں ہے

عن ابن عباسؓ انه قال ان اول جمعة جمعت بعد جمعة فی مسجد رسول الله صلی الله علیه وسلم فی مسجد عبد القیس بجواثی من البحرین۔	حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ مسجد نبوی کے بعد پہلا جمعہ قبیلہ عبدالقیس کی مسجد میں پڑھا گیا جو بحرین کے ایک گاؤں جواثی نامی میں واقع تھی۔

اہل طائف جب اسلام لائے تو آپؐ نے ہدایت فرمائی کہ خاص اس جگہ مسجد تعمیر کرائیں جہاں ان کا بت نصب تھا، حضرت طلق بن علیؓ سے روایت ہے کہ جب ہماری قوم کے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ہم نے عرض کی کہ ہمارے ملک میں ایک گرجا ہے تو آپؐ نے اپنے وضو کا پانی عنایت فرمایا اور ہدایت کی کہ گرجے کو توڑ ڈالو اور وہاں یہ پانی چھڑک کر مسجد بنا لو۔ چنانچہ جب وہ لوگ واپس آئے تو حسب ارشاد مسجد تعمیر کرلی۔[1]

اس قسم کی مسجدیں اگرچہ عرب کے گوشہ گوشہ میں تعمیر ہوئی ہوں گی، لیکن عموماً احادیث کی کتابوں سے صرف اُن مسجدوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے جو مدینہ اور حوالی مدینہ میں تعمیر ہوئیں، صحیح مسلم میں ہے کہ حوالی مدینہ میں انصار کے جو گاؤں آباد تھے، عاشورہ کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن اُن میں منادی کرادی کہ جو لوگ روزہ دار ہیں وہ اپنے روزے کو پورا کر لیں اور جو لوگ افطار کر چکے ہیں وہ بقیہ دن روزہ رکھیں۔

اس اعلان کے بعد صحابہ نے اس پر اس شدت کے ساتھ عمل کیا کہ خود روزے رکھتے تھے اور اپنے بچوں سے روزے رکھواتے تھے، یہاں تک کہ ان کو گھر سے باہر مسجد میں لے جا کر رکھتے تھے اور جب وہ کھانے کے لئے روتے تھے تو اُن کو ان کے بنے ہوئے کھلونوں سے بہلاتے تھے۔[4]

امام بخاری نے صحیح بخاری میں ایک مستقل باب باندھا ہے کہ "مساجد کو اشخاص کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟" اور اس باب کے تحت میں جو حدیث لائے ہیں اس میں بہ تصریح مسجد بنی زریق کا نام لیا ہے۔ حضرت انسؓ بن مالک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عصر کی نماز پڑھ کر اپنے محلہ میں آتے تھے، یہاں لوگ مسجد میں

[1] نسائی کتاب المساجد جلد اصفحہ ۱۱۱ [2] زاد المعاد جلد اول صفحہ ۲۸۹ بروایت ابوداؤد الطیالسی [3] سنن نسائی کتاب المساجد صفحہ ۱۱۸ [4] صحیح مسلم کتاب الصیام باب من اکل فی عاشورا فلیکف بقیۃ یومہ۔

منتظر رہتے تھے، وہ آکر کہتے تھے کہ مسجد نبوی میں نماز ہو چکی تب لوگ یہاں نماز پڑھتے تھے[1]۔ ان روایتوں سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ ان قبائل کی مسجدیں الگ الگ تھیں، صحاح کی روایتوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بعض لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک جماعت ہوتے تھے اور پھر اپنے محلہ کی مسجد میں جا کر اپنی قوم کی امامت کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت معاذ بن جبلؓ کا اسی پر عمل تھا، مدینہ میں جو قبائل آباد تھے ان کے علاوہ جو قبائل ہجرت کر کے آتے تھے وہ بھی اپنی مسجد تعمیر کر لیتے تھے۔ چنانچہ طبقات ابن سعد میں ہے۔

ولجهينة مسجد بالمدينة[2]　　　مدینہ میں جہینہ کی ایک مسجد ہے۔

قبائل کی ضروریات کے علاوہ مسجدوں کی تعمیر کا ایک بڑا سبب یہ ہوتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم راہ میں جہاں کہیں نماز پڑھتے تھے وہاں صحابہ تبرکاً مسجد تعمیر کر لیتے تھے، امام بخاری نے صحیح بخاری میں مستقل باب باندھا ہے جس کا عنوان یہ ہے۔ باب المساجد التی علیٰ طریق المدینه والمواضع التی صلی فیها النبی صلی الله علیه وسلم، یعنی وہ مسجدیں جو مدینہ کے راستوں اور ان مقامات میں واقع ہیں جہاں آپ نے نماز پڑھی ہے اور اس کے تحت میں اس قسم کی متعدد مسجدوں کا نام لیا ہے اور حافظ ابن حجر نے اُن کے حسب ذیل نام گنائے ہیں۔

مسجد قبا، مسجد الفضیح، مسجد بنی قریظہ، مشربہ ام ابراہیم، مسجد بنی ظفر یا مسجد البغلہ، مسجد بنی معاویہ مسجد فتح، مسجد قبلتین، حافظ ابن حجر نے یہ بھی لکھا ہے کہ مدینہ اور اطراف مدینہ میں جو مسجدیں منقش پتھروں سے تعمیر ہوئی ہیں ان سب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ادا فرمائی ہے، کیونکہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جب ان مساجد کی تجدید کی تھی تو اہل مدینہ سے اس کی تحقیق کر لی تھی[3]۔

ائمہ نماز کا تقرر

مساجد کی تعمیر کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ مختلف قبائل کے لئے الگ الگ امام مقرر کر دیئے جائیں، عموماً عادت شریف یہ جاری تھی کہ جو قبیلہ مسلمان ہو جاتا اس میں جو شخص سب سے زیادہ حافظ قرآن ہوتا وہی امام مقرر کر دیا جاتا اور اس شرف میں چھوٹے بڑے، غلام آقا سب برابر تھے آپ کی تشریف آوری سے پہلے مدینہ میں جو مہاجرین آچکے تھے اُن کے امام حضرت ابو حذیفہؓ کے آزاد کردہ غلام سالم تھے، جرم کا قبیلہ جب اسلام لایا تو عمرو بن سلمہ جرمی اس وقت سات یا آٹھ برس کے کم سن بچے تھے لیکن چونکہ اپنے قبیلہ میں قرآن کے سب سے بڑے حافظ وہی تھے اس لئے وہی امام قرار پاتے۔

امامت کے انتخاب کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند اصول مقرر فرما دیئے تھے۔

عن ابی مسعود الانصاریؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم يؤم القوم اقرأهم لكتاب الله فان كانوا في القرأة سواء فاعلمهم بالسنة فان كانوا في السنة سواء فاقدمهم هجرة فان كانوا

ابو مسعود انصاریؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جماعت کی امامت وہ کرے جو سب سے زیادہ کلام اللہ پڑھا ہو اگر اس میں سب برابر ہوں تو جو سنت سے سب سے زیادہ واقف ہو اگر اس میں بھی مساوات ہو تو جس نے سب سے پہلے ہجرت کی تھی

[1] مسند ابن حنبل ج ۴ صد ۲۳۲ [2] طبقات ابن سعد جزء رابع صد [3] فتح الباری ج اول صد ۴۷ [4] ایضاً

فی الهجرة سواء فاقدمهم سنا (مسلم)　　　اور اس میں بھی سب برابر ہوں تو جس کی عمر سب سے زیادہ ہو۔

جب کوئی ایسا قبیلہ خدمت اقدس میں حاضر ہوتا تو آپ پوچھتے کہ تم میں سب سے زیادہ حافظ قرآن کون ہے؟ اگر کوئی ایسا شخص ہوتا تو لوگ اس کا نام لیتے اور آپ اس کو اس عہدہ پر خود ممتاز فرماتے، چنانچہ اہل طائف کے امام عثمانؓ بن ابی العاص اسی طرح مقرر ہوئے تھے اور سب مساوی الحیثیت ہوتے تو ارشاد ہوتا تم میں جو بڑا ہو وہ جماعت کی امامت کرے، مالکؓ بن حویرث جب اپنی قوم کی طرف سے بارگاہ میں حاضر ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی ارشاد فرمایا۔

مدینہ میں، مدینہ سے باہر اطراف میں عرب کے مختلف صوبوں میں جہاں جہاں مسجدیں تعمیر ہوئی تھیں، ظاہر ہے کہ وہاں ہر جگہ الگ الگ امام مقرر ہوتے ہوں گے، جن قبائل میں عمال مقرر ہوئے تھے وہی ان کے امام بھی ہوتے تھے[2]، بڑے بڑے مقامات میں یہ دونوں عہدے الگ الگ ہوتے تھے، عمان میں حضرت عمرو بن العاص عامل تھے اور ابو زید انصاریؓ امام، لیکن افسوس ہے کہ احادیث و سیر کی کتابوں میں نام بنام ان کی یکجا تفصیل مذکور نہیں، ضمنی واقعات میں جہاں تک اس کا سراغ لگ سکا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

نام	مقام تقرر	کیفیت
مصعبؓ بن عمیر	مدینہ منورہ	ہجرت نبویؐ سے پہلے انصار کی امامت کرتے تھے (ابن ہشام ذکر بیعت عقبہ)
سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ		آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے مہاجرین کے امام تھے (بخاری و ابوداؤد)
ابن مکتومؓ	مدینہ منورہ	جب آپ مدینہ سے باہر غزوات میں تشریف فرما ہوتے تو اکثر صحابہؓ بھی ہمرکاب ہوتے، لیکن چونکہ یہ آنکھوں سے معذور تھے اس لئے مدینہ ہی میں رہتے تھے اس سبب سے اس موقع پر انہی کو آپ امام مقرر فرما جاتے (ابوداؤد)
ابوبکر صدیقؓ	"	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدم تشریف آوری پر مسجد نبویؐ میں امام ہوتے تھے (صحیح بخاری)
عتبان بن مالکؓ	بنو سالم	اپنے قبیلہ کے امام تھے (ابوداؤد و نسائی)
معاذؓ بن جبل	بنو سلمہ	" " " " (بخاری وغیرہ)
ایک انصاریؓ	مسجد قبا	" " " " (بخاری)
عمروؓ بن سلمہ	بنو جرم	" " " " (ابوداؤد و نسائی)

[1] مسند ابن حنبل جلد ۴ صد ۲ [2] فتوح البلدان بلاذری۔

نام	مقام تقرر	کیفیت
اسیدؓ بن حضیر	بنو جرم	اپنے قبیلہ کے امام تھے (ابوداؤد)
انسؓ بن مالک یا کوئی	بنو نجار	" " " " (امام کا نام مشکوک ہے)
دوسرے صحابی	"	" " " " (مسند جلد ۲ صفحہ ۲۳۲)
مالکؓ بن حویرث	"	" " " " (ابوداؤد)
عتابؓ بن اسید	مکہ معظمہ	" " " " (نسائی)
عثمانؓ بن ابی العاص	طائف	" " " " (ذکر وفد طائف)
ابوزیدؓ انصاری	عمان	" " " " (بلاذری ذکر عمان)

مؤذنین عام طور پر اذان کے لئے کوئی خاص شخص منتخب نہیں کیا جاتا تھا۔ تاہم چند مثالوں سے قیاس ہوتا ہے کہ بڑی بڑی مسجدوں میں یہ عہدہ الگ آپ نے قائم فرمایا تھا چنانچہ مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ میں اس عہدے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صاحبوں کو ممتاز فرمایا تھا۔

نام	مقام	مسجد
بلالؓ بن رباح	مدینہ منورہ	مؤذن مسجد نبویؐ
عمروؓ بن ام مکتوم قرشی	"	"
سعدؓ القرظ	عوالی مدینہ	مؤذن مسجد قبا
ابو محذورہؓ جمحی قرشی	مکہ مکرمہ	مؤذن مسجد حرام

*

[1] کتب مذکورہ کی کتاب الصلوٰۃ سے یہ نام ملتقط ہیں۔ [1] نسائی صفحہ ۱۸۔

تاسیس و تکمیلِ شریعت

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔

(آج ہم نے تمہارا مذہب کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور اسلام کو تمہارے لئے مذہب پسند کیا)

یہ تمام انتظام اور نظم و نسق اسلام کا حقیقی نصب العین نہ تھا، بلکہ جیسا کہ بتفصیل اوپر بیان کیا جا چکا ہے یہ اس لئے تھا کہ ملک میں امن و امان پیدا ہو اور ایک منظم اور باقاعدہ حکومت کا وجود ہو تاکہ مسلمان بے روک ٹوک اور بلا مزاحمت اپنے مذہبی فرائض انجام دے سکیں۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے کسی نے اس آیت کے معنی پوچھے۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ۔ ان کافروں سے جہاد کرو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے اور مذہب تمام تر خدا کے لئے ہو جائے۔

انہوں نے فرمایا کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا جب اسلام کم تھا، آدمی اپنے مذہب کی بنا پر فتنہ میں مبتلا ہو جاتا تھا، لوگ اس کو قتل کر دیتے تھے، اب جب اسلام ترقی کر گیا تو کوئی فتنہ نہیں رہا۔[1]

ہجرت سے آٹھ برس تک کا زمانہ تمام تر ان ہی فتنوں کی دار و گیر، مخالفوں کی شورشوں اور ہنگاموں کی مدافعت اور ملک میں امن و امان قائم کرنے میں گزرا، اسی لئے آٹھ برس کی وسیع مدت میں فرائض اسلام سے جو چیز ہر جگہ اور ہر موقع پر نمایاں نظر آتی ہے وہ صرف جہاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں ایک ایک غزوہ کی تفصیل سینکڑوں صفحات میں ہے۔ لیکن نماز، روزہ، زکوٰۃ کے متعلق دو دو، چار چار سطروں سے زیادہ واقعات نہیں ہیں وہ بھی اس طرح کہ جب کوئی سنہ ختم ہوتا ہے تو اس قدر لکھ دیتے ہیں کہ اسی سال فرض نماز کی رکعتیں دو سے چار ہو گئیں۔

اس کی وجہ یہ نہیں کہ نعوذ باللہ ارباب سیر دیگر فرائض کی اہمیت و عظمت پیش نظر نہیں رکھتے تھے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ غزوات کی مصروفیت اور ملک کی بدامنی کی وجہ سے اکثر فرائض دیر میں فرض ہوتے اور جو پہلے فرض ہو چکے تھے ان کی تکمیل بھی بتدریج اسی زمانہ میں ہوتی رہی، جس کے لیل و نہار زیادہ تر مخالفین کے تیر باراں کے روکنے میں بسر ہو گئے۔

جن احکام کا تعلق قانون ملکی سے تھا وہ اس وجہ سے نازل نہ ہو سکے کہ اب تک اسلام کوئی حکمران طاقت نہ تھا، خالص مذہبی فرائض اور احکام بھی رفتہ رفتہ اسی زمانہ میں نازل ہوتے رہے اور بتدریج جیسے جیسے ان کے مناسب حالات پیدا ہوتے جاتے تھے وہ تکمیل کو پہنچ رہے تھے، سب سے بڑا نکتہ احکام کے تدریجی نزول میں

[1] بخاری جلد ۱ صفحہ ۶۰۸ تفسیر سورۂ انفال۔

یہ تھا کہ ان سے مقصود محض عربوں کو ان کا بتا دینا مقصود نہیں تھا بلکہ عملاً ان کی زندگی کو ان پر کاربند بنا دینا تھا اس لئے نہایت آہستہ آہستہ بتدریج ترتیب کے ساتھ ان کو آگے بڑھایا گیا، اسی نکتہ کو حضرت عائشہؓ نے نہایت خوبی سے بیان فرمایا ہے کہ پہلے عذاب و ثواب کی آیتیں نازل ہوئیں، جب دلوں میں استعداد اور رقت پیدا ہو گئی تو احکام نازل ہوتے، ورنہ اگر پہلے ہی دن یہ حکم ہوتا کہ شراب نہ پیو تو کون مانتا۔[1]

الغرض ان مختلف اسباب کی بناء پر اسلام کے اکثر فرائض اور احکام اس وقت تکمیل کو پہنچے جب تمام ملک میں امن و امان قائم ہو گیا۔ مکہ معظمہ کے قیام تک روزہ سرے سے فرض نہیں ہوا، مدینہ منورہ میں روزے فرض ہوئے لیکن زکوٰۃ کی فرضیت سات آٹھ سال کے بعد ہوئی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ رات دن کی معرکہ آرائیوں سے مالی حالت اس حد تک پہنچنے کہاں پائی تھی کہ زکوٰۃ کی فرضیت کا موقع آتے۔ فتح مکہ سے پہلے مسلمان اس سرزمین مقدس پر قدم نہیں رکھ سکتے تھے اس لئے اس وقت تک حج بھی فرض نہ ہوا، نماز روزانہ کا فرض ہے اور یہ فرض اسلام کے وجود کے ساتھ آیا لیکن اس کی تکمیل بتدریج ہجرت کے چھ سات برس کے بعد ہوئی، ۵ھ تک نماز میں بات چیت کرنا جائز تھا اور کوئی باہر کا آدمی سلام کرتا تو نمازی عین نماز میں جواب دیتے تھے، جیسا کہ ابوداؤد وغیرہ میں متعدد روایتیں[2] مذکور ہیں۔

غرض فتح مکہ کے بعد جب کفر کا زور ٹوٹ گیا اور تمام ملک میں امن و امان قائم ہو گیا تو مذہبی احکام کی تفصیل اور نظام شریعت کی تکمیل کا موقع آیا، احکام بہت سے ایسے تھے جو سرے سے ابھی شروع نہیں ہوئے تھے مثلاً زکوٰۃ، حج، حرمت ربا وغیرہ بہت سے ایسے تھے کہ ابتدائی ارکان قائم ہو گئے تھے لیکن تکمیل نہیں ہوئی تھی۔[3]

*

---

[1] صحیح بخاری باب تالیف القرآن [2] ابوداؤد باب رد السلام فی الصلوٰۃ [3] اسلام کے بعض احکام کے نزول اور تدریجی تکمیل کی تاریخ جلد نمبر ۱ کے واقعات متفرقہ کے تحت میں بھی ضمناً گزر چکی ہے۔ ناظرین ایک دو جگہ احکام کی تاریخ اور سنین میں یہاں سے اختلاف پائیں گے اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ جلد اول میں عام مؤرخین اور ارباب سیر کی تقلید کی گئی ہے اور یہاں احادیث اور کتب شان نزول سے استقراء کر کے جو امر محقق نظر آیا ہے اس کی تفصیل کی گئی ہے اور اصل یہ ہے کہ احکام کے سنین اور تاریخیں کتب حدیث میں بالتصریح مذکور نہیں ہیں محدثین اور ارباب روایت کے قیاسات اور استنباطات ہیں اور اسی بنا پر باہم ان میں اختلافات ہیں۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ صحیح اور معتبر دلائل کی رہنمائی سے اس راستہ کو طے کریں والعصمۃ بید اللہ (س)

عقائد اور اسلام کے اصولِ اوّلین

اسلام کے فرائض اوّلین عقائد ہیں، یعنی توحید، رسالت، ملائکہ، قیامت، حشر و نشر وغیرہ پر ایمان لانا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اول وحی جو نازل ہوئی یعنی اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ اس میں خدا کی بڑائی کے سوا کسی مخصوص عقیدہ کی تعلیم نہ تھی، لیکن دوسری بار جو وحی نازل ہوئی وہ یہ تھی۔

يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (مدثر-۱)

اے چادر اوڑھنے والے اٹھ، لوگوں کو ڈرا اپنے پروردگار کی بڑائی کر اور بتوں کو چھوڑ دے۔

اس کے بعد مکہ معظمہ کے قیام کے زمانہ میں جس قدر آیتیں نازل ہوئیں وہ بیشتر عقائد کے متعلق تھیں، شرک اور بت پرستی کی برائی، خدا کی عظمت و جلال کا اظہار، قیامت کے ہولناک سماں اور جنت و دوزخ کا پر اثر بیان، رسالت کے خواص اور اس کی ضرورت کے دلائل مکہ میں تیرہ برس تک زیادہ تر یہی مطالب ادا ہوتے رہے۔ غرض عقائد کے تمام اجزا۔ اگرچہ آغاز اسلام ہی میں لوگوں کو سنائے جا چکے تھے لیکن مکی آیتوں کے استقصا سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر ایک کا بیان الگ الگ ہوتا تھا۔ عقائد کا مسلسل بیان سورۂ بقرہ اور سورۂ نساء میں ہے اور یہ دونوں سورتیں مدینہ میں نازل ہوئیں، مکی سورتوں میں زیادہ تر زور توحید و قیامت کے اعتقاد اور رسول کی صداقت پر صرف ہوا ہے لیکن مدینہ میں آ کر اسلام کے تمام عقائد اور اصول اوّلین کی مجموعی تعلیم شروع ہو جاتی ہے۔

ایمان اور اسلام کے اصولِ اوّلین کے متعلق سورۂ بقرہ کی سب سے پہلی آیت یہ ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ۔

جو بن دیکھے ایمان لاتے ہیں، نماز کھڑی کرتے ہیں، ہم نے جو روزی دی ہے اس سے خرچ کرتے ہیں اور جو ان باتوں پر ایمان رکھتے ہیں جو اے محمدؐ، تجھ پر اتاری گئیں اور تجھ سے پہلے نازل ہوئیں اور ان کو آخرت پر بھی یقین ہے۔

وسط سورہ میں یہ اصول دوبارہ ادا ہوتے ہیں۔

لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ۔

لیکن نیکی یہ ہے کہ کوئی خدا پر، روز قیامت پر، فرشتوں پر، کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لائے۔

اس کے بعد نماز، روزہ، زکوٰۃ اور بعض اخلاقی احکام گنائے گئے ہیں، یہ آیتیں تحویل قبلہ کی آیت کے ساتھ ۲ھ میں نازل ہوئیں، اسی کی تفصیل سورہ کے آخر میں کی گئی ہے۔ یہ آیتیں ہجرت کے چند سال بعد غالباً نازل ہوئیں، جیسا کہ حضرت عائشہؓ اور ابن عباسؓ کی روایتوں سے ثابت ہے۔

---

[1] اضافہ ناتمام ہے [2] صحیح بخاری تفسیر سورۂ مدثر [3] بخاری باب تالیف القرآن۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِ مِنْ رَّبِّہٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ۔

پیغمبر اس پر ایمان لایا جو اس کے رب کی طرف سے اترا اور تمام مسلمان خدا پر، خدا کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر سب پر ایمان لائے۔

سورۂ نساء کی آیت یہ ہے جس میں بالتفصیل بتایا گیا ہے کہ جو لوگ مسلمان ہو چکے ان کے کیا عقائد ہونے چاہئیں،

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیْدًا۔ (پ ۵ ع ۱۷)

اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو! ایمان لاؤ خدا پر، اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو اس سے پہلے اتاری اور جو شخص خدا کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا اور اس کے پیغمبروں کا اور روز آخرت کا انکار کرے گا وہ سخت گمراہ ہوا۔

احادیث کتاب الایمان میں بہت سے ایسے واقعات ہیں جن میں لوگوں نے آپ سے اسلام اور ایمان کے معنی دریافت کئے ہیں اور آپ نے سائل کی یا وقت کی مناسبت سے مختلف جوابات دیئے ہیں، آپ نے فرمایا کہ مجھ کو حکم دیا گیا ہے کہ میں اس وقت تک لڑوں جب تک لوگ یہ گواہی نہ دیں کہ خدا ایک ہے، محمدؐ خدا کا پیغمبر ہے، نمازیں پڑھیں اور زکوٰۃ دیں۔

ایک دفعہ کسی دیہات سے ایک مسلمان حاضر خدمت ہوا اور دریافت کیا کہ اسلام کی حقیقت کیا ہے؟ آپ نے تین چیزیں بتائیں، رات دن میں پانچ وقت کی نماز، رمضان کے روزے اور زکوٰۃ۔ عبد القیس کے وفد نے جو ۹ھ میں حاضر ہو کر عرض کی ہم دشمنوں کی مزاحمت کے سبب سے ہمیشہ نہیں حاضر ہو سکتے اس لئے ایسے احکام بتا دیئے جائیں جو ان لوگوں کو بھی سنا دیئے جائیں جو شرفِ حضوری حاصل نہیں کر سکتے، آپ نے فرمایا۔

شھادۃ ان لا الٰہ الا اللّٰہ وان محمدا رسول اللّٰہ واقام الصلٰوۃ وایتاء الزکوٰۃ وصیام رمضان وان تعطوا من المغنم الخمس۔

اس بات کی شہادت کہ خدا ایک ہے محمدؐ خدا کے پیغمبر ہیں، نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا، رمضان کے روزے رکھنا اور مال غنیمت میں سے پانچواں حصہ دینا۔

ایک دفعہ آپ صحابہ کے مجمع میں تشریف فرما تھے، اس اثناء میں ایک شخص نے آ کر سوال کیا، ایمان کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا، ایمان یہ ہے کہ خدا پر، فرشتوں پر، خدا کی ملاقات پر، اس کے پیغمبروں پر، اور مرنے کے بعد جی اٹھنے پر یقین ہو، اس نے پوچھا اور اسلام کیا ہے؟ فرمایا اسلام یہ ہے کہ صرف خدا کو پوجو، کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ، نماز پڑھو، فرض زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو، اس نے پھر دریافت کیا کہ احسان کس کو کہتے ہیں؟ ارشاد ہوا کہ خدا کی اس طرح عبادت کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگر تم اس کو نہیں دیکھتے تو وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔

یہ اصول اسلام کا تقریباً کامل نقشہ ہے۔ غالباً یہ سوال و جواب فتح مکہ یعنی ۸ھ سے پہلے کا واقعہ ہے، کیونکہ اس میں حج کا ذکر نہیں ہے تاہم اس قدر اطمینان حاصل ہو چکا تھا کہ تکمیل عبادت کے لئے خضوع و خشوع کی قید بھی اضافہ کی جا سکے، اصول اسلام کا آخری اعلان یہ ہے۔

بنی الاسلام علی الخمس شھادۃ ان لا الٰہ الا اللّٰہ وان محمدا رسول اللّٰہ واقام الصلٰوۃ وایتاء الزکوٰۃ والحج وصوم رمضان۔

اسلام کی بنا پانچ باتوں پر ہے، اس بات کی گواہی کہ خدا کے سوا کوئی اور خدا نہیں، محمدؐ اس کا پیغمبر ہے، نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا، حج کرنا، رمضان کے روزے رکھنا۔

رفتہ رفتہ ایمان اور اسلام کے اصول کلیہ کی جب تکمیل ہو چکی تو اس کے جزئیات اور دیگر لوازم کی بھی تعلیم دی گئی آپ نے فرمایا کہ ایمان کی کچھ اوپر ساٹھ شاخیں ہیں جن میں ایک شاخ حیا ہے۔ ایک دفعہ فرمایا کہ بہترین اسلام یہ ہے کہ مسلمان اس کی زبان اور ہاتھ سے محفوظ رہے۔ ایک اور صاحب کے جواب میں فرمایا کہ بہترین اسلام یہ ہے کہ بھوکوں کو کھانا کھلاؤ اور کسی سے جان پہچان ہو یا نہ ہو مگر اس کو سلام کرو۔ یہ بھی فرمایا کہ اس وقت تک تم مومن نہیں جب تک اپنے بھائی کے لئے وہی پسند نہ کرو جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو۔[۱]

غرض اسلام کے تمام اصول و فروع کی تعلیم اسی طرح بتدریج تکمیل کو پہنچی گئی اور آخری ۹ ذی الحجہ ۱۰ھ کے روز وہ ساعت آئی جب خدا نے فرمایا۔[۲]

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ۔

آج ہم نے تمہارا مذہب مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی۔

عبادات

اوپر حدیث گزر چکی ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر قائم کی گئی، ان میں سے توحید و رسالت کے علاوہ بقیہ چار چیزیں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ عبادت میں داخل ہیں، اس میں سب سے اول شے نماز ہے، نماز کی صحت کے لئے متعدد شرطیں ہیں، سب سے اول اور ضروری شرط طہارت ہے۔

طہارت

طہارت کے معنی یہ ہیں کہ جسم اور لباس ظاہری اور معنوی ہر قسم کی نجاستوں سے پاک ہو، طہارت کو اسلام میں جو اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ اس سے کرو کہ دوسری ہی دفعہ کی وحی سے جب احکام اور فرائض کا آغاز ہوا تو توحید کے بعد دوسرا حکم طہارت ہی کا دیا گیا۔

یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ وَثِیَابَکَ فَطَھِّرْ وَالرُّجْزَ فَاھْجُرْ۔ (مدثر)

اے چادر اوڑھنے والے اٹھ اور ڈرا اور اپنے پروردگار کی بڑائی کر اور اپنے کپڑے پاک کر اور ناپاکی کو چھوڑ دے۔

اگرچہ مفسرین نے عموماً کپڑے کی طہارت سے دل کی طہارت اور ناپاکی سے بت پرستی مراد لی ہے، تاہم اس سے ظاہری طہارت اور پاکیزگی کی اہمیت کا اندازہ بھی ہو سکتا ہے۔ نماز سے پہلے وضو کرنا فرض ہے اس فرضیت کا ثبوت ابتدائے اسلام سے ثابت ہوتا ہے۔ تاریخ و سیر اور بعض روایاتِ حدیث میں ہے کہ وضو کا طریقہ آغازِ وحی ہی میں حضرت جبرئیلؑ نے آپ کو سکھایا تھا۔ حاکم نے مستدرک میں حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ہجرت سے پہلے بھی وضو فرماتے تھے۔[۳] لیکن قرآن میں وضو کا حکم باتفاق محدثین مدینہ

۱؎ یہ تمام حدیثیں صحیح بخاری کتاب الایمان میں ہیں۔ ۲؎ صحیح بخاری تفسیر آیت مذکور۔ ۳؎ ابن ہشام و فتح الباری بحوالہ مغازی ابن لہیعہ و امام احمد جلد ۴ ص ۱۶۱ و ابن ماجہ و فتح الباری جلد ۱ ص ۲۰۰ و طبرانی فی الاوسط۔

يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِى الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۔

ہی رات اور دن کا اندازہ کرتا ہے اس لئے جان لیا کہ تم اس کو گن نہیں سکتے، تم پر اس نے مہربانی کی اب جتنا ہو سکے اتنا ہی قرآن نمازمیں پڑھو، اس نے جان لیا کہ تم میں بیمار بھی ہونگے مسافر بھی ہوں گے جو خدا کی روزی ڈھونڈنے کو سفر کریں گے، لوگ خدا کی راہ میں سفر جہاد کریں گے پس اب جتنا ہو سکے اتنا ہی پڑھو۔

رات کی اس نفل نماز کا نام تہجد ہے، نماز نفل کے تہجد ہو جانے کے بعد فجر، مغرب اور عشاء تین وقت کی نمازیں فرض ہوئیں۔

اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَىِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ (ہود - ۱۰)

دن کے دونوں ابتدائی اور انتہائی کناروں میں (یعنی فجر و مغرب) اور رات تھوڑی گزرنے کے بعد نماز پڑھا کرو۔

معراج میں جو نبوت کے پانچویں سال ہوئی، پانچ وقت کی نمازیں فرض ہوئیں[1] اور سورۂ اسراء میں جو معراج کے بیان پر مشتمل ہے۔ یہ آیت اتری۔

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ۔ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۔

نماز کے اوقات زوال آفتاب سے لے کر ظلمت شب تک ہیں (ظہر عصر مغرب، عشاء) اور صبح کی نماز کہ صبح کی نماز میں سب جمع ہوتے ہیں اور رات کو تہجد، یہ تیرے لئے مزید ہے۔

لیکن رکعتیں دو ہی رہیں، مدینہ منورہ میں آکر جب نسبۃً کسی قدر اطمینان ہوا تو اس فرض نے وسعت حاصل کی اور دو کے بجائے چار رکعتیں فرض ہو گئیں[2]۔

بااین ہمہ نماز میں خضوع و خشوع اور تمکین و وقار کے جو ارکان ضروری ہیں اُن کے لئے جس اطمینان کی ضرورت تھی وہ مدت تک نصیب نہیں ہوا، اس لئے فوراً وہ ارکان اور آداب لازمی نہیں قرار پائے بلکہ رفتہ رفتہ ان کی تکمیل کی گئی پہلے لوگ نماز میں آنکھ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھ لیا کرتے تھے، بالآخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مابال اقوام یرفعون البصر الی السماء فی صلوتھم۔

یہ کیسے لوگ ہیں کہ نماز میں آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا کرتے ہیں۔

ایک مدت تک یہ حالت تھی کہ نماز پڑھتے میں کوئی کام یاد آجاتا تو کسی سے کہہ دیتے یا کوئی سلام کرتا تو نماز ہی میں جواب دیتے۔ پاس پاس کے آدمی نماز میں باہم باتیں کیا کرتے۔ جب مہاجرین حبش ۲ھ؁ واپس آکر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں مشغول تھے معمول کے موافق لوگوں نے سلام کیا لیکن جواب نہیں ملا۔ نماز کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "خدا نے اب حکم دیا ہے کہ نماز میں باتیں نہ کرو" اس وقت سے بات چیت کرنا یا سلام کا جواب دینا بالکل منع ہو گیا۔

---

[1] ہماری تحقیق میں معراج نبوت کے نویں سال میں ہوئی تھی۔ [2] فتح الباری مصری جلد ۱ صفحہ ۵۵ [3] صحیح بخاری باب الہجرت [4] بخاری کتاب الصلوۃ باب رفع البصر الی السماء فی الصلوۃ [5] ابوداؤد کتاب الصلوۃ۔

معاویہ بن حکم کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز ادا کی، ایک صاحب کو چھینک آئی، میں نے یرحمک اللہ کہا، لوگوں نے تیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا، میں نے کہا، آپ لوگ کیا دیکھتے ہیں؟ لوگوں نے زانو پر ہاتھ مارے، اس وقت میں سمجھا کہ بات کرنے سے روکنا چاہتے ہیں، میں چپ ہو گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز سے فارغ ہو کر (خلق احمدی سے مجھ کو نہ سزا دی نہ ڈانٹا نہ برا کہا، صرف یہ فرمایا کہ نماز تسبیح و تکبیر اور قرأت کا نام ہے۔ اس میں بات چیت جائز نہیں[1]۔

تشہد کا جو طریقہ اب ہے پہلے نہ تھا مختلف اشخاص کے نام لے کر کہتے تھے، السلام علی فلاں وفلاں، بالآخر التحیات کے خاص الفاظ سکھائے گئے، جو اب نماز میں معمول بہا ہیں[2]۔

حدیثوں میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چھوٹے بچوں کو نماز میں کندھے پر چڑھا لیتے، سجدہ میں جاتے وقت اتار دیتے، دوسری رکعت میں کھڑے ہوتے تو پھر چڑھا لیتے۔ حضرت عائشہؓ باہر سے آتیں اور دروازہ کھٹکھٹاتیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھتے ہوئے عین اسی حالت میں جا کر دروازہ کھول دیتے[3]۔ ان حدیثوں کی بنا پر بہت سے فقہاء کی رائے یہ ہے کہ یہ سب افعال نماز نفل میں جائز ہیں، نفل کی تخصیص اس لئے کہ جن نمازوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے افعال کئے وہ فرض نہ تھیں بلکہ نفل تھیں، لیکن ہمارے نزدیک یہ تاویل صحیح نہیں، ایک حدیث میں صاف موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم امامہ بنت ابوالعاص کو کاندھے پر چڑھائے مسجد میں آئے اور نماز ادا کی[4]۔ ہمارے نزدیک یہ تمام روایتیں اسی زمانہ کی ہیں جب کہ نماز میں بات چیت اور اس قسم کی حرکات ممنوع نہیں قرار پائے تھے، رفتہ رفتہ نماز تکمیل کی اس حد کو پہنچی کہ وہ تمام تر خضوع و خشوع و مراقبہ و محویت بن گئی۔

قرآن مجید میں آیت اتری قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِىْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ۔ یعنی فلاح پانے والے مسلمان وہ مسلمان ہیں جو خشوع کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں، اور اس بنا پر نماز میں ادھر اُدھر دیکھنا یا کوئی حرکت خضوع و خشوع کے خلاف کرنا منع ہو گیا۔ نماز کے تمام ارکان کا نہایت سکون اور اطمینان کے ساتھ ادا کرنا لازمی قرار پایا۔ یہاں تک کہ ایک شخص نے آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نماز ادا کی اور تمام ارکان ٹھہر ٹھہر کر اچھی طرح ادا نہیں کئے تو آپ نے اس سے فرمایا کہ تم نے نماز نہیں پڑھی جا کر پھر پڑھو، اس نے دوبارہ اسی طرح ادا کی، آپ نے پھر فرمایا کہ نماز نہیں ہوئی۔ تیسری دفعہ اس نے پوچھا کہ کیونکر پڑھوں؟ آپ نے رکوع، سجدہ، قیام سب کی نسبت ہدایت کی کہ نہایت اطمینان کے ساتھ ادا کئے جائیں، چنانچہ صحیح بخاری وغیرہ[5] میں یہ روایت تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔

غرض یا تو یہ حالت تھی کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے، اتفاقاً شام سے تجارت کا قافلہ آیا، بارہ آدمیوں کے سوا جس قدر لوگ نماز میں شریک تھے، اٹھ کر قافلہ کی طرف دوڑے اس پر یہ آیت اتری[6]۔

وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْا اِلَيْهَا وَ

اور جب لوگ تجارت یا کھیل تماشہ دیکھ پاتے ہیں تو ٹوٹ کر اس

---

[1] ابوداؤد کتاب الصلوۃ [2] ابوداؤد کتاب الصلوۃ باب التشہد [3] ابوداؤد کتاب الصلوۃ باب العمل فی الصلوۃ [4] ایضاً [5] صحیح بخاری باب امر النبی صلی اللہ علیہ وسلم من لا یتم الصلوۃ باب الاعادۃ [6] صحیح بخاری کتاب البیوع تفسیر آیت مذکور۔

تَرَكُوكَ قَائِمًا قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ (جمعہ-۲)

پر گرتے ہیں اور تجھ کو کھڑا چھوڑ دیتے ہیں کہہ دے کہ جو کچھ خدا کے ہاں ہے وہ تجارت اور کھیل تماشہ سے بہتر ہے۔

اور یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت و تعلیم سے یہ حالت ہوئی کہ (ایک انصاری نماز کی حالت میں تین دفعہ تیر کا زخم کھاتے ہیں لیکن نماز نہیں توڑتے کہ جو سورہ انھوں نے شروع کیا تھا اس کی لذت معنوی اس درد زخم سے زیادہ تھی، اس سے بڑھ کر یہ کہ حضرت عمر فاروقؓ نماز میں زخم کھا کر گرتے اور تڑپتے ہیں، یہ قیامت خیز منظر سب کے سامنے ہے، لیکن ایک شخص مڑ کر نہیں دیکھتا، کیونکہ خشیت الٰہی اور محویت کا عالم جو دلوں پر طاری ہے وہ اور کسی طرف متوجہ ہونے نہیں دیتا۔

نماز عیدین اور جمعہ مکہ میں چار شخصوں کا یکجا ہو کر نماز ادا کرنا ناممکن تھا، اس لئے جمعہ کی نماز فرض نہ تھی کیونکہ جمعہ کی پہلی شرط جماعت ہے، لیکن مدینہ منورہ میں انصار کی ایک بڑی جماعت اسلام لا چکی تھی اور کوئی شخص ادائے نماز میں خلل انداز نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے قبل جو مسلمان مدینہ آ چکے تھے، اسعدؓ بن زرارہ کی تحریک سے بنی بیاضہ کے محلہ میں انہوں نے جمعہ کی سب سے پہلی نماز ادا کی، مصعبؓ بن عمیر امام تھے اور کل چالیس مسلمان نمازی تھے[۱]، اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو پہلے قبا میں قیام فرمایا، یہاں سے روانگی کے لئے آپ نے قصداً جمعہ کا دن متعین فرمایا، بنی سالم کے محلہ میں پہنچے تو نماز کا وقت آ گیا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے نماز جمعہ یہیں ادا فرمائی، یہ اواخر ربیع الاول سنہ۱ھ کا واقعہ[۲] ہے۔ مدینہ سے باہر عرب کے دوسرے حصوں میں مسلمانوں کی یکجا تعداد سب سے زیادہ تعداد جواثی میں تھا جو بحرین میں واقع تھا، حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ مسجد نبوی کے بعد سب سے پہلے نماز جمعہ یہیں قائم ہوئی[۳] لیکن بظاہر نماز جمعہ کا اہتمام مسلمانوں میں پہلے اتنا نہ تھا جتنا کہ ہونا چاہئے، ابھی اوپر گزر چکا ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھا رہے تھے اور ایک روایت میں ہے کہ جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے کہ اتفاقاً شام سے غلہ کے بیوپاری آ گئے سب لوگ اٹھ کر چلے گئے، جماعت میں صرف بارہ آدمی اور دوسری روایت کی رو سے چالیس آدمی رہ گئے[۴]۔ اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انْفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا قُلْ مَا عِنْدَ

ایمان والو! جب نماز جمعہ کے لئے پکارا جائے تو یاد الٰہی کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم کو علم ہو، جب نماز سے فراغت ہو جائے تو زمین میں چلو پھرو اور خدا کی روزی تلاش کرو اور خدا کو کثرت یاد کیا کرو تاکہ فلاح پاؤ۔ جب لوگ تجارت اور کھیل تماشہ دیکھ پاتے ہیں تو ٹوٹ کر اس پر گرتے ہیں اور تجھ کو اے پیغمبر کھڑا چھوڑ دیتے ہیں، کہہ دے کہ جو

[۱] ابوداؤد و ابن ماجہ و دارقطنی کتاب الجمعہ نیز عبدالرزاق و احمد و ابن خزیمہ حسب حوالہ فتح الباری [۲] طبری صفحہ ۱۲۵۶ [۳] صحیح بخاری باب الجمعہ [۴] دارقطنی کتاب الجمعہ۔

اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرَّازِقِينَ (جمعہ)

کچھ خدا کے پاس ہے وہ تجارت اور کھیل تماشہ سے بہتر ہے اور خدا بہتر روزی دینے والا ہے۔

اس کے بعد یہ حالت ہو گئی کہ نماز کے سامنے تمام دنیا کے دولت کا خزانہ بھی اُن کے آگے ہیچ ہو گیا، خدا نے اُن کی مدح فرمائی۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (نور-۱)

یہ وہ لوگ ہیں جن کو تجارت اور خرید و فروخت خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔

عید کی نماز بھی مدینہ ہی میں آ کر قائم ہوئی، لیکن جس سال آپ تشریف لائے اس سال عید کی نماز نہیں ہوئی بلکہ سنہ۲ھ میں مسنونؓ ہوئی، جس کی وجہ یہ ہے کہ عید کی نماز، روزہ رمضان کے تابع ہے اور رمضان کے روزے دوسرے سال فرض ہوئے۔

صلوٰۃ خوف (نماز کسی حالت میں قضا نہیں کی جا سکتی، خوف کی حالت میں مثلاً جنگ میں یہ حکم ہے کہ تمام فوج کے دو ٹکڑے کر دیئے جائیں، پہلے ایک جماعت ہتھیاروں سے مسلح ہو کر امام کے پیچھے کھڑی ہو اور نماز قصر ادا کرے پھر بہ ترتیب یہ آگے بڑھے اور دوسری جماعت جو دشمن کے مقابلہ میں تھی وہ پیچھے ہٹے اور وہ بھی قصر نماز ادا کرے، امام اپنی جگہ پر قیام کرے۔ روایتوں میں ہے کہ ہر جماعت دو دو رکعت امام کے ساتھ ادا کرے یا ایک ایک رکعت امام کے ساتھ اور دوسری رکعت علیحدہ علیحدہ پڑھے۔ یا صرف ایک ہی رکعت اس حالت میں فرض ہے۔ ابوداؤد نے صلوٰۃ الخوف کی تمام صورتیں بروایت صحابہ الگ الگ لکھ دی ہیں۔ ہمارے نزدیک ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے، یہ جنگ کی حالت پر موقوف ہے، امام جس وقت جو مناسب سمجھے کرائے۔ اگر لڑائی پورے زور اور شدت پر ہو تو ہر سپاہی اپنی اپنی جگہ پر اشارات سے نماز ادا کرے گا، سورۂ نساء میں صلوٰۃ الخوف کی صورت بتفصیل مذکور ہے صلوٰۃ الخوف کا حکم غزوۂ ذات الرقاع سنہ۴ھ میں نازل ہوا، اسی غزوہ کا نام بعض راویوں نے غزوۂ نجد بتایا ہے۔ ابوداؤد میں ابوعباس زرقی کی ایک روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صلوٰۃ الخوف کی آیت صلح حدیبیہ کے موقع پر مقام عسفان میں نازل ہوئی یعنی سنہ۶ھ میں لیکن زیادہ تر رواۃ حدیث اور اہل سیر غزوہ ذات الرقاع کو اس حکم کا زمانہ سمجھتے ہیں۔

روزہ اسلام سے پہلے قریش عاشورہ کے دن روزہ رکھتے تھے (اُس دن خانہ کعبہ پر غلاف چڑھایا جاتا تھا[۱]) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اُس دن روزہ رکھتے تھے اور عجب نہیں کہ آپ کی تبعیت میں دوسرے صحابہ بھی روزے رکھتے ہوں، سنہ۵ نبوی میں یعنی ہجرت سے آٹھ برس پہلے حضرت جعفرؓ نے حبش کے نجاشی کے سامنے اسلام پر جو تقریر کی تھی، اس میں روزہ کا ذکر بھی موجود ہے، وہ غالباً اسی دن کا روزہ ہو گا) اس کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینے میں تشریف لائے تو دیکھا کہ یہود بھی اس دن روزہ رکھتے ہیں۔ آپ نے لوگوں سے وجہ پوچھی۔ لوگوں نے بیان کیا کہ حضرت موسیٰؑ نے اسی روز فرعون کے ہاتھ سے نجات پائی تھی۔ آپ نے فرمایا، تو ہم کو موسیٰ کی تقلید کا زیادہ حق ہے، چنانچہ آپ نے (یہاں بھی) عاشورہ کا روزہ رکھا اور صحابہ کو بھی رکھنے کا حکم دیا، پھر سنہ۲ھ میں رمضان کے روزے

[۱] طبری ص ۱۲۸۱ یورپ [۲] دیکھو کتب احادیث صلوٰۃ الخوف اور طبری ج ۳ ص ۴۵ [۳] ابن سعد ج ۲ ص ۴۳ [۴] مسند ابن حنبل جلد ۱ ص ۲۰۲ (معجم کبیر طبرانی)

فرض ہوئے تو عاشورہ کا روزہ مستحب ہوگیا، یعنی جس کا جی چاہتا تھا رکھتا تھا اور جو نہیں چاہتا تھا نہیں رکھتا تھا لیکن آپ نے بنفسِ نفیس اس دن کا روزہ برابر رکھا، سنہ ۱۱ھ میں لوگوں نے عرض کی یارسول اللہ! یہود تو اس دن کی بڑی عزت کرتے ہیں، فرمایا آئندہ سال ۱۰ کے بجائے ۹ کو روزہ رکھوں گا، لیکن افسوس کہ آپ نے اسی سال وفات پائی۔

یہود اس طرح روزہ رکھتے تھے کہ نمازِ عشاء کے بعد پھر نہیں کھاتے تھے اور اس کو حرام سمجھتے تھے، عورت کے ساتھ ہم بستری بھی منع تھی، ابتدائے اسلام میں مسلمان بھی اسی طریقہ کے موافق مامور ہوئے۔ اسلام کے تمام احکام میں سب سے مقدم یہ اصول ملحوظ رہتے تھے۔

يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (بقرہ)
خدا تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے سختی نہیں۔

لا صرورۃ فی الاسلام (ابوداؤد، احمد)
اسلام میں جوگی پن نہیں ہے۔

اسی بنا پر یہ آیت نازل ہوئی۔

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ (بقرہ ۲۳۰)
روزے کی راتوں میں تمہارے لئے عورتوں سے لطف اٹھانا حلال کر دیا گیا ہے (جب تک صبح کی سپید لکیر (رات کی) سیاہ لکیر سے الگ نہ ہو جائے تم کھاتے پیتے رہو۔

اہل عرب روزے کے بہت کم خوگر تھے، اول اول روزہ اُن پر شاق ہوا، اس لئے نہایت تدریج کے ساتھ روزہ کی تکمیل کی گئی، اول اول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں تشریف لائے تو سال میں تین روزے رکھنے کا حکم دیا، پھر روزے کی فرضیت نازل ہوئی تو یہ اختیار رہا کہ جو شخص چاہے روزہ رکھے اور جو چاہے روزہ کے بدلے ایک غریب کو کھانا کھلا دے، رفتہ رفتہ جب لوگ روزے کے خوگر ہو چلے تو یہ آیت اتری۔

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ
جو رمضان کا مہینہ پائے وہ ضرور روزہ رکھے۔

اب بالیقین روزہ فرض ہوگیا اور فدیہ کی اجازت جاتی رہی، البتہ جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو اس کیلئے یہ حکم ہوا کہ اس وقت روزہ چھوڑ دے اور ان کے بدلے کسی اور وقت قضا کر دے، چونکہ اور تمام قوموں میں خصوصاً عیسائیوں میں رہبانیت بڑی فضیلت کی بات سمجھی جاتی تھی، اس لئے جو لوگ زیادہ خدا پرست تھے وہ روزے میں زیادہ سختی برداشت کرتے تھے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وقتاً فوقتاً اس سے روکتے رہتے تھے، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں تھے، ایک شخص کو دیکھا کہ اس کے گرد بھیڑ لگی ہوئی ہے اور اس پر لوگوں نے سایہ کر رکھا ہے سبب پوچھا، معلوم ہوا کہ گرمی میں اس شخص نے روزہ رکھا ہے، آپ نے فرمایا کہ سفر میں روزہ رکھنا کچھ ثواب کی بات نہیں، بعض لوگوں نے صوم وصال رکھنا چاہا، یعنی رات دن روزہ رکھیں، بیچ میں افطار نہ کریں، آپ نے اس سے منع فرمایا۔

روزہ کا مقصد عام طور پر صرف یہ سمجھا جاتا تھا کہ اپنے آپ کو تکلیف میں ڈالنا ثواب کی بات ہے اس

---

۱ ابوداؤد کتاب الصوم ۲ یہ تمام واقعات صحیح بخاری، صحیح مسلم اور ابوداؤد کتاب الصوم میں بتفصیل مذکور ہیں ۳ ابوداؤد کتاب الصوم باب مبدأ فرض الصیام و اسباب النزول للسیوطی ص ۲۰ ۴ ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب کیف الاذان ۵ صحیح بخاری کتاب الصوم۔

لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر طرح کی آسانیوں کا حکم دیا، سفر میں اور بیماری میں روزہ رکھنا فرض نہ تھا۔ راتوں کو صبح صادق تک کھانے پینے اور تمام اشغال کی اجازت تھی۔ سحر کھانے کی فضیلت بیان کی اور یہ بھی فرمایا کہ صبح کے قریب کھائی جائے تاکہ دن بھر قوت باقی رہے۔

روزہ کا مقصد صرف معاصی سے کفِ نفس تھا اور روزہ اس کا معین تھا اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص روزہ میں جھوٹ فریب نہیں چھوڑتا، خدا کو اس کی فاقہ کشی کی کوئی حاجت نہیں۔

زکوٰۃ خیرات اور زکوٰۃ کی ترغیب اور تحریص اسلام میں ابتداء ہی سے معمول بہ تھی، مکہ میں جو سورتیں اتریں اُن میں زکوٰۃ کا لفظ تصریحاً مذکور ہے اور خیرات نہ دینے والے پر عتاب ہے۔

أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ فَذَٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ (ماعون)
تم نے اس شخص کو دیکھا جو قیامت کو جھٹلاتا ہے یہی شخص وہ ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی لوگوں کو ترغیب نہیں کرتا۔

مدینہ منورہ میں زیادہ تاکیدی آیتیں نازل ہوئیں، سنہ ۲ھ میں عید کے دن صدقہ فطر دینا واجب قرار پایا مگر ہجرت کے ابتدائی زمانہ میں عام مسلمان اور خصوصاً مہاجرین سخت فقر و فاقہ میں مبتلا تھے، حدیثوں میں صحابہ کے فقر و تنگدستی کے جو واقعات کثرت کے ساتھ مذکور ہیں اسی زمانہ کے ہیں، اس بنا پر یہ حکم ہوا کہ جس شخص کے پاس ضروری مصارف سے جو کچھ بچے سب کو خیرات کر دینا چاہیئے ورنہ عذاب ہوگا، چنانچہ خاص آیت نازل ہوئی۔

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ (توبہ)
جو سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور خدا کی راہ میں خیرات نہیں کرتے۔

اس آیت کا بھی یہی مطلب ہے۔

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ (بقرہ)
لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خیرات دیں کہہ دو کہ جو کچھ مصارف ضروری سے بچ رہے۔

بہت سے لوگ خیرات کرتے تھے لیکن عمدہ مال کو محفوظ رکھتے تھے، بے کار یا ردی چیزیں خیرات میں دیتے تھے، اس پر حکم ہوا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ (بقرہ)
مسلمانو اپنی کمائی میں سے اور اس چیز میں سے جو ہم نے تمہارے لئے زمین میں پیدا کیا اچھا حصہ خیرات کرو۔

مزید تاکید کے لئے یہ حکم ہوا کہ جو شخص اپنی محبوب چیز نہ دے گا اس کو ثواب نہ ملے گا۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّىٰ تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ (آل عمران)
تم لوگ ثواب نہیں پا سکتے جب تک کہ وہ چیز خیرات نہ کرو جو تم کو عزیز ہو۔

اب صدقہ اور خیرات کی طرف یہ عام رغبت پیدا ہوئی کہ جو لوگ نادار تھے وہ صرف اس لئے بازار میں جاکر

---

۱ صحیح بخاری کتاب الصوم ۲ طبری مطبوعہ یورپ ص ۱۲۸۱ ۳ صحیح بخاری مقولہ حضرت عبداللہ بن عمر۔

مزدوری کرتے اور کندھوں پر بوجھ لاد کر لوگوں کے پاس پہنچاتے تھے کہ مزدوری ملے تو خیرات کریں۔

بایں ہمہ ۸ھ تک زکوٰۃ فرض نہیں ہوئی، فتح مکہ کے بعد اس کی فرضیت ہوئی تو اس کے مصارف بیان کئے گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام ممالکِ مقبوضہ میں زکوٰۃ کے وصول کرنے کے لئے (محرم ۹ھ میں) تحصیلین مقرر کئے۔ زکوٰۃ کے مصارف حسبِ ذیل تھے۔

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِي سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (توبہ)

زکوٰۃ اُن مصارف کے لئے ہے فقراء و مساکین زکوٰۃ کے وصول کرنے والے، مؤلفۃ القلوب غلام جن کو آزاد کرانا ہے مقروض، مسافر اور خدا کی راہ میں یہ خدا کا فرض ہے اور خدا علیم و حکیم ہے۔

زکوٰۃ کی شرح نہایت تفصیل سے فرامینِ نبویؐ میں منقول ہے، فقہ میں کتاب الزکوٰۃ ان ہی فرامین سے ماخوذ ہے۔

حج

دنیا میں سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا پرستی کے لئے عبادت گاہِ عام بنایا اور تمام دنیا کو وہاں آکر عبادت کرنے کی دعوت دی۔

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرَاهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمَاتٍ (حج)

اور جب کہ ہم نے ابراہیم کے لئے کعبہ کی جگہ مقرر کر دی کہ ہمارے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور ہمارے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام و رکوع اور سجود کرنیوالوں کیلئے پاک و صاف رکھو اور حج کی منادی کر دے تو لوگ ہر طرف سے دوڑے آئیں گے کچھ پیدل اور کچھ اونٹنیوں پر سوار تاکہ فائدہ اٹھائیں اور تاکہ ایام مقرر میں خدا کا ذکر کریں۔

حضرت ابراہیم کی دعوتِ عام پر دنیا نے لبیک کہا اور ہر سال عرب کے دور دراز اطراف سے لوگ حج کو آتے تھے لیکن ایک طرف تو یہ افسوس ناک انقلاب ہوا کہ جو گھر خالص توحید کے لئے تعمیر ہوا تھا وہ تین سو ساٹھ بتوں کا تماشہ گاہ بن گیا، دوسری طرف اس گھر کی تولیت کا سب سے زیادہ جس کو حق تھا وہ یہاں سے نکلنے پر مجبور ہوا اور پورے آٹھ برس تک ادھر آنکھ اٹھا کر دیکھ بھی نہ سکا۔ بالآخر ظہورِ حق کا وقت آیا مکہ فتح ہوا اور جانشینِ ابراہیم اور اُن کے متبعین کو موقع ملا کہ شعارِ ابراہیمی کو پھر زندہ کیا جائے چنانچہ ۹ھ میں حج فرض ہوا تاہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سال یہ فرض ادا نہیں کیا کہ عرب ننگے ہو کر طوافِ کعبہ کرتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسی بے حیائی کا منظر آنکھ سے دیکھنا گوارا نہیں فرما سکتے تھے، اس لئے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ ایامِ حج میں روانہ کئے گئے کہ کعبہ میں جا کر منادی کر دیں کہ آئندہ سے کوئی شخص عریاں ہو کر کعبہ کا طواف نہ کرنے پائے گا۔[3]

ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ لسنی کے قاعدہ سے حج کا مہینہ ہٹتے ہٹتے ذوقعدہ میں آگیا تھا۔ چنانچہ ۹ھ کا حج اسی مہینہ میں ادا ہوا تھا لیکن حج کا اصلی مہینہ ذوالحجہ تھا، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سال کا انتظار

---

[1] بخاری کتاب الزکوٰۃ [2] طبری مطبوعہ یورپ جلد ۴ صفحہ ۱۷۲۲ (ابن سعد جزو مغازی صفحہ ۱۱۵) [3] زاد المعاد جلد ۱ صفحہ ۳۰ [4] صحیح مسلم کتاب الحج باب لا یحج البیت مشرک ولا یطوف بالبیت عریان۔

فرمایا اور اس وقت حج ادا کیا جب وہ اپنے اصلی مرکز پر آگیا۔[1]

حج کی اصلاحات

حج کی رسم اگرچہ کفار نے قائم کر رکھی تھی، لیکن اس کی صورت، بالکل بدل دی تھی اور اس میں اس قدر بدعات اضافہ کر دیئے تھے کہ ثواب کے بجائے عذاب کا کام بن گیا تھا، سب سے مقدم یہ کہ حج اور تمام عبادات کا مقصد خدا کا ذکر اور توجہ الی اللہ ہے۔ لیکن اہلِ عرب حج میں جمع ہوتے تھے تو خدا کے بجائے اپنے باپ دادا کے مفاخر اور کارنامے بیان کرتے تھے۔ اسی بناء پر یہ آیت اتری۔

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا (بقرہ)

پھر جب حج کے ارکان پورے کر لو تو خدا کا ذکر کرو جس طرح اپنے باپ دادا کا کرتے تھے، بلکہ اس سے بڑھ کر۔

خاص اہلِ مدینہ نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ منات جو بُت تھا اس کا طواف کرتے تھے اور اس بناء پر جب کعبہ کا حج کرتے تھے تب بھی صفا و مروہ کا طواف نہیں کرتے تھے حالانکہ حج کے مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ حضرت ابراہیم کی یادگاریں قائم رکھی جائیں اور صفا و مروہ کا طواف اسی عہد کی یادگار ہے۔ اسی بناء پر یہ آیت اتری۔

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا (بقرہ-۱۹)

صفا اور مروہ خدا کی یادگار ہیں اس لئے جو شخص حج یا عمرہ کرے تو اس کو دونوں مقاموں کا بھی طواف کرنا چاہیئے۔[2]

ایک طریقہ یہ رائج ہو گیا تھا کہ اکثر لوگ (آج کل کی طرح) جن کے پاس زادِ سفر نہیں ہوتا تھا، یونہی چل کھڑے ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم متوکل ہیں، ان لوگوں کو اکثر راہ میں گداگری اور دوستوں کی دست گیری کا محتاج ہونا پڑتا تھا، اس بناء پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى (بقرہ)

اور گھر سے زادِ سفر لے کر چلو، کیونکہ اچھا زادِ سفر تقویٰ ہے۔[3]

احرامِ حج میں سر کے بالوں کا منڈوانا یا ترشوانا منع ہے، لیکن اس میں اہل جاہلیت نے بہت سختی کر دی تھی، یہاں تک کہ بعض صاحبوں کے بالوں میں اس قدر جوئیں پڑ گئیں کہ بینائی جلتے رہنے کا خوف ہو گیا۔ تاہم وہ بال نہ ترشوا سکے، اسلام میں چونکہ سب سے مقدم یہ امر پیشِ نظر ہے کہ اس کی عبادات و احکام تکلیف مالا یطاق نہ بن جائیں اس لئے یہ حکم ہوا۔

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ۔

تو جو شخص بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ عارضہ ہو تو وہ (اگر بال منڈوائے) تو فدیہ ادا کر دے یعنی روزہ یا خیرات یا قربانی۔

قربانی جو کرتے تھے، اُس کا خون لے کر کعبہ کے در و دیوار پر ملتے تھے اور اس کو ثواب سمجھتے تھے، اس پر

---

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں یہ الفاظ فرمائے تھے۔ الزمان قد استدار کہیئتہ یوم خلق السموات والارض اثنا عشر شہرا منہا اربعۃ حرم ثلث متوالیات ذوالقعدۃ و ذوالحجۃ والمحرم ورجب مضر الذی بین جمادی وشعبان۔ اس سے اسی طرف اشارہ ہے۔ [2] اسباب النزول للواحدی [3] قرآن مجید میں جناح کا لفظ ہے اس کا عام ترجمہ "حرج" یا نقصان ہے، اس بناء پر ترجمہ یہ ہونا چاہیئے کہ صفا اور مروہ کے طواف میں کچھ حرج نہیں، لیکن لاجناح کا لفظ واجب اور مستحب کے معنوں میں بھی آیا ہے۔ [4] بخاری کتاب الحج باب تزودوا فان خیر الزاد التقویٰ۔

یہ آیت نازل ہوئی:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاۤؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (حج) — خدا کو قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ تمہاری پرہیزگاری اس تک پہنچتی ہے۔

اس آیت میں صرف اس فعل سے نہیں روکا گیا بلکہ یہ بھی بتا دیا گیا کہ قربانی کوئی مقصود بالذات چیز نہیں بلکہ اصل چیز جس کو خدا قبول کرتا ہے وہ تقویٰ اور پرہیزگاری ہے۔

رسوم حج میں ایک بڑی چیز جو قریش نے اصول اسلام کے خلاف قائم کر دی تھی یہ تھی کہ وہ عرفات جو حج کا اصلی عبادت گاہ عام تھا نہیں جاتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم اہل حرم ہیں، ہم حدود حرم سے نہیں جا سکتے۔ یہ ہمارے خاندان کی توہین ہے، اس لئے وہ صرف مزدلفہ تک جا کر ٹھہر جاتے تھے۔ باقی تمام عرب عرفات میں جمع ہوتے تھے اور وہاں سے چل کر مزدلفہ اور منیٰ میں آتے تھے چونکہ اسلام کا اصول اصلی مساوات عامہ ہے اور عبادات میں سب یکساں ہیں اس لئے حکم آیا کہ

فَاِذَاۤ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّاۤلِّيْنَ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (بقرہ)

پھر جب عرفات سے لوٹو تو مشعر حرام (مزدلفہ) کے پاس خدا کا ذکر کرو جس طریقہ سے اس نے تم کو ہدایت کی ہے اور اس سے پہلے بے شک تم گمراہ تھے پھر وہیں سے چلو جہاں سے اور لوگ چلتے ہیں اور خدا سے معافی مانگو وہ غفور اور رحیم ہے۔

قربانی کے جانور کو چونکہ سمجھتے تھے کہ خدا پر چڑھا دیا گیا ہے اس لئے اس پر سوار نہیں ہوتے تھے اور پیدل چلنے کی تکلیف گوارا کرتے تھے۔ یہ رسم اسلام کے آنے تک قائم رہی۔ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاحب کو سفر حج میں دیکھا کہ قربانی کے اونٹ کے ساتھ ہیں لیکن خود پیدل جا رہے تھے۔ آپ نے ان سے فرمایا کہ "سوار ہو تو"۔ بولے "یہ قربانی کے اونٹ ہیں"۔ آپ نے دوبارہ فرمایا، انہوں نے دوبارہ وہی عذر کیا، آپ نے زجر کے ساتھ حکم دیا کہ "بیٹھ تو"۔[1]

ایک قسم کا حج ایجاد کر لیا تھا جس کو حج مصمت کہتے تھے، یعنی جو شخص حج کرتا تھا وہ آغاز حج سے اخیر تک منہ سے کچھ بولتا نہ تھا، اسلام نے اس تکلیف مالایطاق سے منع کیا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابوبکرؓ نے احمس کی ایک عورت کو جس کا نام زینب تھا دیکھا کہ کسی سے بات چیت نہیں کرتی، دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ حج مصمت کی نیت کی ہے، حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ یہ جائز نہیں، یہ زمانہ جاہلیت کی بات ہے۔[2]

سب سے بڑی بے حیائی کی بات یہ تھی کہ قریش (حمس) کے سوا عام عرب مرد و زن کعبہ کا برہنہ طواف کرتے تھے حدود حرم میں آ کر تمام لوگ اپنے اپنے کپڑے اتار ڈالتے تھے اور عاریۃً کسی قریش سے کپڑے مانگ لیتے تھے اگر نہ ملتے تو ننگے کعبہ کے گرد گھومتے تھے، عورتیں بھی اسی طرح ننگی طواف کرتی تھیں اور یہ شعر گاتی جاتی تھیں۔

---

[1] تفسیر بیضاوی (یہ رسم یہودیوں سے آئی تھی، اللاویں علاء) تاریخ دوم ۲۹-۲۲ [2] صحیح بخاری جلد ا کتاب الحج صفحہ ۲۲۶ [3] بخاری کتاب الحج [4] بخاری جلد ا صفحہ ۵۴۱۔

اليوم يبدو بعضه او كله — وما بدا منه فلا احله

آج کچھ حصہ اس کا یا پورا کھلے گا — اور جو کھلا ہے اس کو میں حلال نہیں کرتی

اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (اعراف) — اے آدم کے بیٹو! مسجدوں میں کپڑے پہن لیا کرو۔

(اس بنا پر ۹ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ صدیق کو بھیجا، انہوں نے عین موسم حج میں اعلان کیا کہ آئندہ کوئی برہنہ حج نہ کرنے پائے گا۔)[1]

معاملات

شریعت کی تکمیل میں جو تدریج ملحوظ رہی اس کے لحاظ سے وراثت، نکاح و طلاق، و قصاص و تعزیرات (وغیرہ) کے احکام بعثت سے بہت بعد آئے، سبب یہ ہے کہ ان احکام کے اجراء کے لئے ایک نافذ الامر قوت کی ضرورت تھی جو اب تک اسلام کو حاصل نہیں ہوئی تھی، غزوۂ بدر کے بعد سے اسلام کی سیاسی طاقت کا نشو و نما شروع ہوا، ہجرت کے پہلے اور دوسرے سال میں جو احکام نازل ہوئے وہ تحویل قبلہ، فرضیت روزہ، زکوٰۃ فطر، نماز عید اور قربانی تھی تیسرے سال سے جب اسلام کے کاروبار زیادہ پھیلنے شروع ہوئے تو سب سے پہلے توریث کا قانون قرآن مجید میں نازل ہوا۔

وراثت

(مسلمان جب ابتداً مدینہ آئے ہیں تو اس وقت یہ حالت تھی کہ باپ مسلمان ہے تو بیٹا کافر ہے، ایک بھائی کافر ہے تو دوسرا بھائی مسلمان ہے، اس حالت میں اقربا اور اعزہ کی وراثت کا قانون کیونکر نافذ ہو سکتا تھا؟ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو آپ نے مہاجرین اور انصار میں مواخاۃ (برادری) قائم کر دی جس کی رو سے یہ قاعدہ مقرر ہو گیا کہ کوئی انصاری مرتا تو اس کی وراثت مہاجرین کو ملتی، عرب میں پہلے بھی دستور تھا کہ دو آدمی آپس میں عہد کر لیتے کہ ہم دونوں آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوں گے، ان میں سے جب کوئی مرتا تو دوسرا وارث ہوتا لیکن ۵ھ میں قرآن کی اس آیت نے اس قاعدہ کو منسوخ کر دیا)

اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ (انفال) — قرابت مند ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہیں۔

اس کی رو سے مواخاۃ کی بناء پر وراثت موقوف ہو گئی اور خاندان اور ذوی الارحام میں وراثت محدود ہو گئی۔[2]

(آیت توریث کے نزول سے پہلے قرآن نے وصیت کا قاعدہ جاری کیا تھا یعنی مرنے والا اپنے مال و جائیداد کی نسبت یہ وصیت کر جاتا کہ اس میں سے اتنا اس کو دیا جائے اور اتنا اس کو ملے، مرنے کے بعد اسی طریقے سے اس کی جائیداد تقسیم کر دی جاتی، مرنے سے پہلے ہر مسلمان پر اس وصیت کا مکمل کر جانا فرض تھا۔

---

[1] یہ پورا واقعہ اور شان نزول نسائی کتاب مناسک الحج میں ہے [2] صحیح مسلم و صحیح بخاری اور تمام حدیث کی کتابوں میں باب لا یطوف بالبیت عریانا میں مذکور ہے [3] یہ مفسرین کا بیان ہے لیکن صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ یہ حکم حسب ذیل آیت کریمہ سے منسوخ ہوا۔ ولکل جعلنا موالی مما ترک الوالدان والاقربون والذین عقدت ایمانکم فاتوھم نصیبھم (نساء)۔ دیکھو صحیح بخاری تفسیر آیت مذکور۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ (بقرہ)

مسلمانو تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت آئے اور وہ کچھ مال چھوڑنے والا ہو تو ماں باپ اور رشتہ داروں کیلئے بطریق مناسبت وصیت کر جائے، متقی لوگوں پر یہ فرض ہے۔

جو لوگ حالتِ مسافرت میں جاتے اُن کے لئے گواہی اور شہادت کا قانون قرآن میں مقرر کیا گیا۔ گواہی کو چھپانا یا بدل دینا قانوناً جرم تھا، چنانچہ سورۂ بقرہ اور مائدہ میں اس کی پوری تفصیل ہے۔ غزوۂ بدر کے بعد مسلمانوں کی تعداد میں کافی ترقی ہوتی گئی، خاندان کے خاندان مسلمان ہو گئے، اس لئے وراثت کے مخصوص قانون کی ضرورت ہوئی۔ پھر وصیت کے قاعدہ میں بڑی دقت یہ تھی کہ ناگہانی موت کے موقع پر تقسیم جائیداد کا کوئی اصول جاری کرنا ممکن نہ تھا، مثلاً جہاد میں سینکڑوں مسلمان شریک ہوتے، اب کس کو معلوم ہے کس کو شہادت ہو گی۔ اس حالت میں وصیت نہ کر جانے سے رشتہ داروں میں جس کا قابو چل جاتا وہ جائیداد پر قبضہ کر لیتا، چنانچہ غزوۂ احد میں یہی موقع پیش آیا، سعدؓ بن الربیع جو بہت دولت مند صحابی تھے، اس جنگ میں شہید ہوئے، اُن کی بیوی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئیں کہ سعد آپ کی خدمت میں شہید ہوئے، انھوں نے دو لڑکیاں چھوڑی ہیں، لیکن سعد کے بھائی نے سعد کی ساری جائیداد پر قبضہ کر لیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "خدا فیصلہ کرے گا"، پھر اغلباً ۳ھ میں یہ آیت نازل ہوئی، جس میں وراثت کے تمام احکام مذکور ہیں،

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ - الخ

خدا تم کو تمہاری اولاد کی نسبت حکم دیتا ہے کہ لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر حصہ ملے (آخر تک)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد کے بھائی کو بُلا کر فرمایا کہ سعد کے متروکہ میں سے دو تہائی ان کی بیٹیوں کو، آٹھواں حصہ اُن کی بیوی کو دو، اس کے بعد جو بچ رہے وہ تمہارا حق ہے۔[1]

اہلِ عرب عورتوں کو وراثت سے محروم رکھتے تھے کہ وراثت اس کا حق ہے جو تلوار چلائے۔ دنیا کی اور اکثر قوموں میں بھی یہی دستور تھا، یہ پہلا دن ہے کہ اس صنفِ ضعیف کی دادرسی کی گئی۔

وصیت احکامِ وراثت کے بعد بھی وصیت کی اجازت باقی رہی، لیکن چونکہ اس سے مستحقینِ وراثت کی حق تلفی کا اندیشہ تھا، اس لئے وصیت کی تحدید کی ضرورت تھی۔ ۱۰ھ میں حضرت سعدؓ عاد کے والد بیمار ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کی عیادت کو گئے۔ انھوں نے عرض کی کہ میں مر رہا ہوں اور میرے صرف ایک ہی لڑکی ہے

[1] آیتِ میراث کی شانِ نزول میں احادیث میں تین واقعے مروی ہیں، اول یہ کہ حضرت جابرؓ ۸ھ میں بیمار پڑے تو آیت اتری، یہ روایت تمام صحاحِ ستہ میں ہے لیکن درحقیقت اس روایت میں راویوں سے کسی قدر مسامحت ہوئی ہے کیونکہ وراثت ۸ھ سے پہلے جاری ہو چکی تھی اور دوسری یہ کہ حضرت جابرؓ اس وقت تک لاولد تھے، اس لئے صحیح یہ ہے کہ حضرت جابرؓ کا واقعہ وراثت کی ایک خاص صورت لاولدیت (یعنی کلالہ) سے متعلق ہے جیسا کہ مسلم کی دوسری روایتوں میں (کتاب الفرائض) اس کی تصریح ہے، دوسرا شانِ نزول یہ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت حسانؓ کے بھائی عبدالرحمٰن کی وفات کے بعد انکی بیوی ام کجہ کی فریاد پر یہ آیت اتری، یہ روایت طبری وغیرہ کی ہے جو گو ضعیف ہے لیکن بالکل ممکن ہے کہ سعد بن ربیع کے علاوہ اور واقعے بھی اس قسم کے پیش آئے ہوں، تیسرا شانِ نزول یہی سعد بن ربیع کا واقعہ ہے جو ابوداؤد، ترمذی، حاکم اور مستدرک میں مذکور ہے۔

چاہتا ہوں کہ صرف دو تہائی مال خیرات کر دوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت نہیں دی، انھوں نے کہا تو نصف، آپ نے اس کو بھی قبول نہیں کیا، انھوں نے کہا ایک تہائی، آپ نے فرمایا یہ بھی بہت ہے، وارثوں کو غنی چھوڑ کر مرنا اس سے اچھا ہے کہ وہ بھیک مانگتے پھریں۔ تاہم یہ مقدار آپ نے جائز رکھی، اس وقت سے وصیت ایک ثلث سے زیادہ ممنوع ہو گئی۔

وقف وقف شریعت کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، اسلام نے اس مسئلہ کو جس حد تک صاف کیا اس کا دوسرے مذاہب کے قوانین میں شائبہ تک موجود نہیں، اسی بنا پر شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں دعویٰ کیا ہے کہ اسلام طریقۂ وقف کا موجد ہے۔ اسلام میں وقف کی تاریخ نہایت قدیم ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے پہلے ہی سال مدینہ میں مسجدِ نبوی کی بنیاد جس زمین میں رکھی تھی وہ دو یتیموں کی ملکیت تھی، آپ نے قیمت دینی چاہی لیکن انھوں نے کہا،

لا و اللہ لا نطلب ثمنہ الا الی اللہ۔

نہیں ہم خدا کی قسم قیمت نہ لیں گے، ہم اس کی قیمت خدا ہی سے لیں گے

یہ اسلام کا پہلا وقف تھا اور نہایت سادہ صورت میں تھا، چنانچہ امام بخاری اس حدیث کو وقف مشاع (مشترک جائیداد) کا وقف کے ثبوت میں لاتے ہیں، اس کے بعد ۳ھ یا ۴ھ میں جب یہ آیت نازل ہوئی۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ۔ تم نیکی اس وقت تک نہیں پا سکتے جب تک وہ خدا کی راہ میں نہ دے دو جو تم کو سب سے محبوب ہے

تو ابو طلحہؓ صحابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کی یا رسول اللہ! بیرحا مجھ کو سب سے زیادہ محبوب ہے، میں اس کو خدا کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں اور اس کا ثواب اور اجر خدا سے چاہتا ہوں۔ آپ جس مصرف میں چاہیں اس کو رکھیں، چنانچہ آپ کے مشورہ سے انھوں نے اس کا منافع اپنے اعزہ پر وقف کیا۔

اب تک وقف کے لئے جو الفاظ استعمال ہوتے تھے وہ صرف یہ تھے کہ وہ ذاتی تصرف سے نکال کر خدا کی ملکیت میں دیا گیا لیکن ۷ھ میں غزوۂ خیبر کے بعد اس کی حقیقت بالکل واضح کر دی گئی۔ خیبر میں حضرت عمرؓ کو ایک زمین ملی تھی، حضرت عمرؓ نے اس کو وقف کرنا چاہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا،

ان شئت حبست اصلها وتصدق بها۔

اگر چاہو اصل جائیداد باقی رکھو اور منافع صدقہ کرو۔

چنانچہ ان شرائط کے ساتھ وہ جائیداد وقف ہوئی۔[2]

انه لا یباع اصلها ولا یوهب ولا یورث۔

اصل جائیداد نہ بیچی جائے نہ ہبہ کی جائے اور نہ وراثت میں بانٹی جائے

نکاح وطلاق نکاح کے متعلق جو اصلاحی احکام آئے ان کی تفصیلات اصلاحات کے عنوان کے نیچے آئے گی، یہاں صرف اس قدر لکھنا کافی ہے کہ اسلام سے پہلے عرب میں کئی قسم کے نکاح کے طریقے جاری تھے جن میں سے ایک کے سوا سب زنا کے مشابہ تھے، سب سے پہلے اسلام نے ان کو ناجائز ٹھہرایا۔ متعہ جو زمانۂ جاہلیت سے چلا آتا تھا، بار بار حرام اور حلال ہوتا رہا، یہاں تک کہ ۷ھ غزوۂ خیبر میں قطعاً حرام ہو گیا، اگرچہ اس پر بھی اس کی ضرورت پیش آئی کہ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں منبر پر کہا کہ میں متعہ کو حرام کرتا ہوں یعنی متعہ کی حرمت جو اچھی طرح اب بھی ملک میں شائع نہ ہو سکی میں آج اس کا اعلان کرتا ہوں۔

نکاح اور طلاق کے دیگر احکام مثلاً محرماتِ شرعی کا بیان، منہ بولے بیٹے کی بیوی کا حرام نہ ہونا، کثرتِ ازدواج

[1] بخاری جلد ا کتاب الوصایا [2] ایک زمین کا نام ہے جو مدینہ میں واقع تھی [3] یہ تمام حدیثیں بخاری باب الوقف میں ہیں [4] محدود الوقت نکاح

کی تحدید، تعداد طلاق کی تعیین، زمانہ عدت کا بیان، مہر کا ضروری ہونا، ظہار یعنی ایک طریقہ طلاق جس میں اپنی بیوی کو محرمات سے تشبیہ دیتے تھے اور لعان یعنی شوہر کا اپنی بیوی کی عصمت پر شبہ کرنا اور باہم اپنی سچائی اور دوسرے کی دروغ گوئی کا دعویٰ کرنا۔ یہ تمام تفصیلیں اصلاحات کے تحت میں آئیں گی۔ یہاں صرف اس قدر بتا دینا کافی ہے کہ یہ تمام احکام قرآن مجید میں مذکور ہیں اور ان کے نزول کا زمانہ سنہ ۵ھ اور سنہ ۶ھ ہے۔

حدود و تعزیرات

دنیا کے مادی خزانہ میں انسان کی جان سے زیادہ کوئی قیمتی شے نہیں۔ حدود اور تعزیرات کے اکثر قوانین ہجرت کے چند برس بعد نازل ہوئے لیکن انسان کی جان کی حرمت کا حکم مکہ ہی میں اتر چکا تھا معراج کے سلسلہ میں جو اخلاقی احکام بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوئے ان میں سے ایک یہ بھی تھا۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا فَلَا يُسْرِفْ فِي الْقَتْلِ إِنَّهُ كَانَ مَنْصُورًا (بنی اسرائیل)

خدا نے جس جان کو حرام کیا ہے اس کو ناحق نہ مارو اور جو ناحق مارا جائے اس کے وارث کو ہم نے اختیار دیا چاہیئے کہ وہ قصاص میں زیادتی نہ کرے، اس کی مدد کی جائے۔

عرب میں اسلام سے پہلے بھی قتل و قصاص کے کچھ قوانین موجود تھے، یہود جو اس ملک میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے، تورات کے حدود و تعزیرات کا مجموعہ اُن کے پاس بھی موجود تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ عرب میں چونکہ منتظم حاکمانہ طاقت اور اخلاقی روح نہ تھی اس لئے وہ ان احکام کا نفاذ نہیں کر سکتے تھے۔ مدینہ پہنچنے کے ساتھ ہی یہود نے فصلِ مقدمات کے لئے بارگاہِ نبوت کی طرف رجوع کیا۔ آپؐ ان کے مقدمات عموماً تورات کے احکام کے مطابق فیصل کر دیتے تھے۔

عرب میں ایک شخص کا قتل صدہا قبائل کی خانہ جنگی کا سلسلہ چھیڑ دیتا تھا اس لئے غزوۂ بدر کے بعد جب اسلام کے بازوؤں میں حاکمانہ زور آچلا تھا، قصاص کا حکم نازل ہوا، یاد ہو گا کہ اطرافِ مدینہ میں بنو قریظہ اور بنو نضیر دو یہودی قبائل رہتے تھے۔ ان دونوں میں بنو نضیر معزز سمجھے جاتے تھے، اس لئے کوئی قریظی کسی نضیری کو مار ڈالتا تو اس کو بنو نضیر مار ڈالتے تھے اور اگر کسی نضیری کے ہاتھ سے کوئی قریظی قتل ہو جاتا تھا تو چھوہاروں کے سو وسق خون بہا دے دیتے۔ مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا، لوگوں نے اس کا مرافعہ آپؐ کی خدمت میں پیش کیا، اس پر سورۂ مائدہ کی چند آیتیں اتریں، ان میں سے ایک آیت یہ ہے۔

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ ۲؎

ہم نے ان کو توراۃ میں حکم دیا تھا کہ جان کے بدلے جان آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان اور زخموں کے بدلے ویسے ہی زخم۔

یہ حکم گو یہودیوں کے لئے تھا لیکن ایک اور آیت نے اس مسئلہ کو بالکل واضح کر دیا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى ۔ ۱؎

مسلمانو! تم پر مقتولین میں مساوات اور برابری کا حکم دیا جاتا ہے۔

۱؎ اضافہ تا ختم باب حلال و حرام ۲؎ ابوداؤد کتاب الدیات۔

اس حکم نے مساوات اور عدل کے پلّے کو دنیا میں ہمیشہ کے لئے برابر کر دیا، یہودیوں میں خون بہا (دیت) کا قانون ۱؎ نہ تھا لیکن عرب میں یہ قانون تھا اور اسلام نے چند اصلاحات کے ساتھ اس کو باقی رکھا۔

فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ (بقرہ)

اسکے بھائی (یعنی اولیائے مقتول) کی طرف سے کچھ معاف کر دیا جائے تو اس کی پابندی خوبی کیساتھ کرنی اور بطور احسان اسکو ادا کرنا چاہیئے

اب تک قتل عمد اور قتل شبہ (یعنی غلطی سے قتل) میں کوئی تفریق نہ تھی۔ سنہ ۳ھ میں ایک مسلمان غلطی سے ایک مسلمان کے ہاتھ سے مارا گیا اور ایک مسلمان انصاری کے ہاتھ سے ایک قریشی قتل ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتول کے بھائی کو خون بہا دے کر راضی کر لیا۔ اس کے بعد وہ منافقانہ اسلام لایا اور غداری سے انصاری کو قتل کر کے قریش میں جا کر مل گیا۔ ان واقعات کی بنا پر قتل شبہ کے متعلق متعدد احکام نازل ہوئے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَأً وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَى أَهْلِهِ إِلَّا أَنْ يَصَّدَّقُوا فَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ فَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَى أَهْلِهِ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِنَ اللَّهِ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا۔

کسی مسلمان کو سزاوار نہیں کہ کسی دوسرے مسلمان کو مار ڈالے لیکن غلطی سے اگر کسی مسلمان کو غلطی سے قتل کیا تو ایک مسلمان غلام آزاد اور خون بہا اس کے وارثوں کو ادا کرنا چاہیئے لیکن یہ کہ وہ معاف کریں تو خیر اگر مقتول خود مسلمان ہو، وہ کسی دشمن قوم سے ہو تو صرف ایک غلام آزاد کرو اور اگر ایسی قوم سے ہو جس سے تم نے معاہدہ کیا ہو تو خون بہا دینا اور ایک غلام آزاد کرنا چاہیئے۔ اگر قاتل کو یہ مقدور نہ ہو تو پے در پے دو مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں کہ خدا اس کی طرف رجوع ہو، خدا علم اور حکمت والا ہے اور جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی جزا دوزخ ہے ہمیشہ اس میں رہے گا خدا اس پر اپنا غضب اور لعنت بھیجے گا اور اس کے لئے بڑا عذاب اس نے مہیا کیا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ قصاص و قتل کے متعلق یہ سب سے آخری حکم ہے۔ حفاظتِ جان کا اعلان ۲؎ فتح مکہ کے موقع پر ہوا، جب آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ زمانۂ جاہلیت کے تمام خون میرے دونوں پاؤں کے نیچے ہیں اس کے بعد قتل خطا، مشابہ بہ قتل عمد کے خون بہا کی تحدید فرمائی۔ قتلِ خطا کا خون بہا اہل قریہ کے لئے ۸۰۰ دینار مقرر کیا۳؎ سنہ ۶ھ تک رہزنوں کے لئے کوئی حد مقرر نہ تھی، سنہ ۶ھ میں عکل و عرینہ کے قبیلے کے کچھ لوگ مدینہ آکر مسلمان ہوئے۔ یہاں کی آب و ہوا ان کو راس نہ آئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر سے باہر چراگاہ میں ان کو قیام کی اجازت دی، ایک موقع پر مسلمان چرواہوں کو طرح طرح سے عذاب دے کر بڑی بے رحمی سے مار ڈالا اور مویشی لوٹ کر لے گئے۔ وہ گرفتار ہو کر آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کو اسی طرح عذاب کے ساتھ قتل کا حکم دیا، گو یہ برابر کا انتقام تھا، تاہم اس میں کسی قدر بے رحمی تھی اس لئے خدا تعالیٰ کی طرف سے عتاب ہوا اور ڈکوئتی

۱؎ صحیح بخاری کتاب التفسیر آیۃ کتب علیکم القصاص ۲؎ ابوداؤد کتاب الدیات، باب فی دیۃ الخطا شبہ العمد ۳؎ ابوداؤد دیات الاعضاء۔

کے لئے علیحدہ احکام نازل ہوتے تھے۔

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ (مائدہ)	ان لوگوں کی سزا جو خدا اور اس کے رسول سے لڑائی لڑتے ہیں اور ملک میں فساد مچاتے ہیں یہ ہے قتل کئے جائیں یا پھانسی دیئے جائیں یا ان کے ادھر کے ہاتھ اور ادھر کے پاؤں کاٹ ڈالے جائیں یا ملک سے الگ کر دیئے جائیں یعنی قید ہوں یا جلا وطن کئے جائیں۔

جان کے بعد مال کا درجہ ہے، اسلام سے پہلے عرب میں چوروں کے لئے قطعِ ید کی سزا جاری تھی، اسلام نے بھی اس کو باقی رکھا السارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیھما، ۸ھ میں فتح مکہ کے موقع پر قبیلہ مخزوم کی ایک عورت نے اس جرم کا ارتکاب کیا، چونکہ وہ ایک شریف خاندان سے تھی اس لئے مسلمانوں میں بڑا اضطراب پیدا ہوا، حضرت اسامہؓ بن زید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت چہیتے تھے اُن سے سفارش کرائی گئی، آپ بہت برہم ہوتے اور لوگوں کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ "تم سے پہلے لوگوں کی ہلاکت کا یہی سبب ہوا کہ وہ نیچے طبقے کے لوگوں پر تو احکام جاری کرتے لیکن اوپر درجہ کے لوگ جب جرم کا ارتکاب کرتے تو ان سے درگزر کرتے، خدا کی قسم! اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ لیتا، اس تقریر کا یہ اثر ہوا کہ لوگوں نے بے چون و چرا اس حکم کی تعمیل کی۔[1]

عربوں میں زنا کی کوئی سزا مقرر نہ تھی، یہودیوں میں توراۃ کی رو سے زانی کی سزا "رجم" یعنی سنگسار کرنا مقرر تھی، لیکن اخلاقی کمزوری کی بنا پر اس حکم کو جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔ اطرافِ مدینہ میں جو یہود آباد تھے، رجم کے بجائے انھوں نے یہ سزا مقرر کی تھی کہ مجرم کے منہ میں کالک لگا کر کوچہ و بازار میں اس کی تشہیر کرتے تھے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو انھوں نے ایک مجرم کا مقدمہ آپ کی خدمت میں پیش کیا، غالباً یہ ۳ھ کے اندر کا واقعہ ہے۔ آپ نے استفسار فرمایا کہ تمہاری شریعت میں اس جرم کی کیا سزا ہے؟ انھوں نے اپنا رواج بتایا، آپ نے توراۃ منگوا کر اُن سے پڑھوایا، انھوں نے رجم کی آیت پر انگلی رکھ کر چھپا دی، آخر ایک مسلمان یہودی نے نکال کر وہ سنائی، آپ نے فرمایا "خداوندا یہ تیرا حکم ہے جس کو ان لوگوں نے مردہ کر دیا ہے، میں سب سے پہلا شخص ہوں جو تیرے اس حکم کو زندہ کروں گا"، چنانچہ آپ نے اس کے سنگسار کرنے کا حکم دیا اور وہ سنگسار کیا گیا۔[2]

۶ھ میں سورۂ نور نازل ہوئی جس میں زنا کی سزا سو دُرّے قرار دی گئی، حضرت عمرؓ کا بیان ہے کہ رجم کی سزا بھی قرآن نے باقی رکھی تھی اس کی تلاوت منسوخ ہو گئی۔ بہر حال احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بن بیاہے کے سو دُرّے اور بیاہوں کے لئے رجم کا حکم ہے۔ چنانچہ ۸ھ میں ایک مسلمان نے اس جرم کا ارتکاب کیا اور گو لوگوں کو اس کا علم نہ تھا لیکن دنیا کی سزا کو آخرت کے عذاب پر اس نے ترجیح دی۔ اور مجمع عام میں آ کر بارگاہِ نبوتؐ میں عرض پرداز ہوا کہ یا رسول اللہ! میں گنہگار ہوں، مجھے پاک کیجئے۔ آپ نے تحقیق

[1] ابو داؤد کتاب الحدود باب الحاکم[2] صحیح بخاری غزوۃ الفتح [3] ابو داؤد باب فی رجم الیہودیین [4] صحیح بخاری رجم المحصن [5] تمام کتب حدیث میں یہ مذکور ہے۔

فرمائی اور اس کے رجم کا حکم دیا۔

شراب ۵ھ میں حرام ہوئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں شراب خوری کی کوئی خاص سزا مقرر نہ تھی چالیس دُرّے تک لوگوں کو اس جرم میں مارے گئے ہیں، حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں اسی دُرّے کر دیئے تھے۔

قذف یعنی پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے کی سزا ۶ھ میں نازل ہوئی۔[1]

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا (نور)	جو لوگ پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں، پھر چار گواہ نہ لا سکیں تو اُن کو اسی دُرّے مارو اور پھر کبھی ان کی گواہی نہ قبول کرو۔

دنیا میں تین چیزیں ہیں، جان، مال اور آبرو۔ جن حدود اور تعزیرات کا اوپر ذکر ہوا وہ انہی تین چیزوں کے تحفظ کے لئے ہیں، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان قوانین کے نزول کے بعد ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقع پر حرم کے اندر ماہِ حرام کی تاریخوں میں فرمایا۔

"مسلمانو! ہر مسلمان کی جان، مال اور آبرو اسی طرح قابلِ حرمت ہے، جس طرح اس محترم شہر میں اس احاطۂ حرم کے اندر یہ مقدس دن قابلِ حرمت ہے"۔

حلال و حرام

ماکولات میں حلال و حرام

عرب میں کھانے پینے میں کسی چیز کا پرہیز نہ تھا اور نہ کوئی شے حلال یا حرام تھی، مردار اور حشرات الارض تک کھاتے تھے۔ البتہ بعض بعض جانور جن کو بتوں کے نام پر چھوڑتے تھے، ان کو ذبح کرنا گناہ سمجھتے تھے، بعض جانوروں میں یہ نذر مانتے تھے کہ مرد کھا سکتے ہیں عورتیں نہیں، اگر بچہ مُردہ پیدا ہوا تو مرد عورت دونوں کھا سکتے ہیں اور زندہ ہو تو صرف مرد کھائیں اسی قسم کے اور بعض بت پرستانہ رسوم تھے۔ سورۂ انعام میں جو مکہ میں نازل ہوئی تھی، ان رسوم کا بتفصیل ذکر ہے، اسلام کے اکثر احکام گو مدینہ میں اترے لیکن ماکولات کی حلت و حرمت کے احکام مکہ ہی میں اترنے شروع ہو چکے تھے چنانچہ سورۂ انعام میں مشرکین کے ان رسوم کی تردید کے بعد حکم آیا۔

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ	کہہ دے کہ مجھ پر جو وحی اتری ہے اس میں کسی کھانے والے پر کوئی شے حرام نہیں ہے ہاں اگر حرام ہے تو مردار یا بہتا ہوا خون یا سور کا گوشت کیونکہ یہ چیزیں ناپاک ہیں یا وہ گناہ کا جانور جو غیر خدا کے نام پر چڑھایا جائے وہ بھی حرام ہے لیکن جو بھوک سے لاچار ہو کر نافرمانی اور گناہ کے ارادہ سے نہیں بلکہ

[1] ۶ھ کی تحدید میں کہیں یہ تفصیل مذکور نہیں ہے، یہ سنہ اس قیاس سے شارحین حدیث نے اختیار کیا ہے کہ اس وقت حضرت ابوہریرہؓ مدینہ میں موجود تھے اور یہ ثابت ہے کہ وہ اسی سال بزمانۂ فتح خیبر مدینہ میں آئے تھے[2] ابو داؤد ادا تتابع فی الخمر[3] واقعہ افک اسی سال ہوا تھا اور یہ اسی تعلق سے نازل ہوئی ہے اس لئے اس کے لئے ۶ھ کا زمانہ متعین کیا گیا۔

غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔

سے کچھ کھالے تو تیرا پروردگار معاف کرنیوالا اور رحم والا ہے۔

مشرکین کو سب سے زیادہ تعجب اس پر ہوا کہ جو آپ سے مر جاتے اس کو حرام کہتے ہیں اور جس کو خود اپنے ہاتھ سے ماریں اس کو حلال جانتے ہیں، حالانکہ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ اس پر یہ آیت اتری۔

فَکُلُوْا مِمَّا ذُکِرَ اسْمُ اللّٰہِ عَلَیْہِ اِنْ کُنْتُمْ بِاٰیٰتِہٖ مُؤْمِنِیْنَ وَمَا لَکُمْ اَلَّا تَاْکُلُوْا مِمَّا ذُکِرَ اسْمُ اللّٰہِ عَلَیْہِ وَقَدْ فَصَّلَ لَکُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَیْکُمْ (انعام)

جو جانور خدا کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو، وہ کھاؤ جو خدا کا نام لے کر ذبح کیا گیا وہ کیوں نہ کھاؤ خدا نے تم پر جو حرام کیا ہے اس کو تو وہ بیان ہی کر چکا۔

اس کے بعد مکہ معظمہ ہی میں سورۂ نحل کی آیت فَکُلُوْا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ الخ نازل ہوئی جس میں اسی حکم سابق کا اعادہ کیا گیا اور یہی چار چیزیں مُردار، خون، سور اور بتوں پر چڑھاوے حرام بیان کی گئیں۔ مدینہ طیبہ میں آکر پہلے سورۂ بقرہ میں اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَۃَ۔ تیسری بار یہ محرمات اربعہ بیان کئے گئے۔ عرب میں حلال وحرام کی تمیز کم تھی۔ وحشت و جہالت کے علاوہ اس کا ایک سبب عام غربت اور افلاس تھی، اس لئے مسلمانوں کی مالی حالت جیسے جیسے درست ہوتی جاتی تھی حلال وحرام کی تفریق بڑھتی جاتی تھی۔ لوگ عموماً مردار اسی کو سمجھتے تھے جو بیمار ہو کر اپنی موت سے مر جائے۔ اس لئے اگر اور کسی سبب سے جانور مر جاتا تو اس کو حرام نہ سمجھتے۔ ہجرت کے چار پانچ سال کے بعد سورۂ مائدہ میں مردار (میتہ) کی تفصیل بیان کی گئی، یعنی یہ کہ یا وہ گلا گھٹنے سے مرا ہو والمنخنقۃ یا گردن ٹوٹنے سے مرا ہو والموقوذۃ یا اوپر سے گر کے مرا ہو والمتردیۃ یا کسی جانور کا سینگ لگ کر مر گیا ہو والنطیحۃ یا کسی جانور نے اس کو پھاڑ ڈالا ہو وما اکل السبع صرف وہ جانور حلال ہے جس کو تم نے ذبح کیا۔ اِلَّا مَا ذَکَّیْتُمْ۔

۷ھ میں جب مسلمانوں کو خیبر کی فتوحات اور جاگیریں ہاتھ آئیں تو جانوروں میں بھی حلال وحرام کی تفریق کی گئی اور اعلان کیا گیا کہ آج سے گدھا، درندہ جانور اور پنجہ دار پرند حرام ہیں۔ ۸ھ میں فتح مکہ کے بعد طے کے قبیلہ نے جو عیسائی تھا اسلام قبول کیا اور شام کے بعض عیسائی مسلمان ہوئے، یہ لوگ شکاری کُتے پالتے تھے اور اُن سے شکار کرتے تھے اسلام لانے پر ان کو معلوم ہوا کہ مردہ جانور حرام ہیں، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنا حال عرض کیا اُس پر یہ آیت اتری۔

یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَآ اُحِلَّ لَھُمْ قُلْ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ۔

تجھ سے پوچھتے ہیں کہ اُن کے لئے کیا حلال کیا گیا کہہ دے کہ تمام ستھری چیزیں۔

اس کے بعد یہ تفصیل ہے کہ شکاری جانور اگر سدھے ہوئے ہوں اور خدا کا نام لے کر چھوڑے جائیں تو اُن کا شکار کیا ہوا کھانا حلال ہے[1]۔

شراب کی حرمت

مخالفین کا خیال ہے کہ اسلام کی اشاعت کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ اس کے اکثر احکام (مثلاً تعدد ازدواج وغیرہ) نفس پرستی کے مؤید تھے، اس لئے عرب کو اس کے قبول کرنے میں کوئی ایثار درکار نہ تھا، بلکہ اسلام وہ لٹا تھا جو وہ خود چاہتے تھے، اس بحث کی تحقیق آگے آئے گی۔ یہاں صرف تاریخی حیثیت سے

[1] حوالوں کے لئے ان آیتوں کے شان نزول تفسیروں میں دیکھو۔

شراب کی حرمت کا واقعہ ذکر کرنا مقصود ہے۔ عرب کو شراب سے بڑھ کر کوئی چیز محبوب نہ تھی، تمام ملک اس مرض میں مبتلا تھا عرب کی شاعری کا موضوع اعظم شراب ہے۔ مصلحت کے لحاظ سے اسلام کے تمام احکام تبدریج آئے ہیں، اس لئے شراب بھی بتدریج حرام کی گئی۔

مدینہ میں شراب خوری کا رواج کسی قدر زیادہ تھا، بڑے بڑے شرفا۔ اعلانیہ شراب پیتے تھے، عرب میں ایسے بھی نیک لوگ تھے، جنھوں نے شراب پینی چھوڑ دی تھی اور اس کو خلاف اتقا سمجھتے تھے، ابھی تک اسلام نے اُس کے متعلق کوئی اپنا فیصلہ نہ سنایا تھا، لوگوں نے پوچھنا شروع کیا کہ شراب کے متعلق کیا حکم ہے؟ حضرت عمرؓ نے کہا۔

اللّٰھم بین لنا فی الخمر بیانا شفاء۔

اے خدا! شراب کے بارے میں ہمارے لئے شافی بیان کر دے۔

اس پر یہ آیت اُتری۔

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ قُلْ فِیْھِمَآ اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُھُمَآ اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِھِمَا (بقرہ-۲۶)

لوگ تم سے شراب اور جوئے کی بابت پوچھتے ہیں کہ دو کہ ان دو[1] میں بڑا گناہ ہے اور فائدے بھی ہیں، لیکن فائدے سے گناہ بڑھ کر ہے۔

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد بھی لوگ شراب پیتے رہے، ایک دفعہ ایک انصاری نے حضرت علیؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کی دعوت کی، جس میں شراب بھی تھی، کھانے کے بعد مغرب کا وقت آگیا اور حضرت علیؓ نے نماز پڑھائی، لیکن نشہ کے خمار میں کچھ کا کچھ پڑھ گئے۔ حضرت عمرؓ نے پھر دعا کی کہ خدا شراب کے بارے میں صاف صاف بیان کر دے۔ اس پر یہ آیت اُتری۔

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (نساء)

نشہ کی حالت میں تم نماز نہ پڑھو۔ یہاں تک کہ جو تم کہو اس کو بھی سمجھ سکو۔

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد جب نماز کا وقت آتا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ایک مُنادی اعلان کرتا تھا کہ کوئی مخمور نماز میں نہ شامل ہونے پائے۔ لیکن چونکہ عام حکم نہ تھا اس لئے نماز کے سوا باقی اوقات میں لوگ بے تکلف پیتے پلاتے تھے، حضرت عمرؓ نے پھر وہی دعا کی۔ اسی زمانہ میں کچھ لوگ شراب پی کر اس قدر بدمست ہوئے کہ آپس میں مار پیٹ تک نوبت[2] پہنچ گئی، اس پر یہ آیت اُتری[3]۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْہُ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَۃَ وَالْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ وَیَصُدَّکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَعَنِ الصَّلٰوۃِ فَھَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَھُوْنَ (مائدہ)

مسلمانو! بے شبہ شراب اور جوا اور بت اور قمار کے تیر ناپاک ہیں اور شیطان کے کام ہیں تو تم اس سے باز آؤ کہ تم کو فلاح حاصل ہو شیطان تو صرف یہ چاہتا ہے کہ تم لوگوں میں شراب اور جوئے کے ذریعہ سے دشمنی اور بغض ڈال دے اور تم کو خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے تو بولو، تم باز آتے ہو۔

[1] یہ پورا واقعہ ابوداؤد کتاب الاشربہ میں مذکور ہے [2] صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۳۲ ذکر سعد وقاصؓ [3] ابو داؤد میں پوری آیتیں نہیں مذکور ہیں بلکہ چند الفاظ نقل کر کے پوری آیت کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔

ان آیتوں کے نزول کے بعد شراب قطعاً حرام ہوگئی، اسی وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی گلی کوچوں میں منادی کرادی کہ آج سے شراب حرام ہے لیکن بایں ہمہ شراب کی تجارت اور خرید و فروخت جاری تھی، ۸ھ میں یہ بھی حرام ہوگئی، آپ نے مسجد نبوی میں لوگوں کو جمع کرکے اسی وقت اعلان کیا[1]، اس کے بعد اسی سال فتح مکہ کے زمانہ میں آپ نے علی الاعلان ان چیزوں کی تجارت کی ممانعت فرمائی، جن کا کھانا یا رکھنا ناجائز ہے، آپ نے فرمایا،

ان اللہ ورسولہ حرم بیع الخمر والمیتۃ والخنزیر والاصنام۔

خدا اور اس کے رسول نے شراب، مردہ، سور اور بتوں کی خرید و فروخت حرام کردی۔

غور کرو! شراب کی حرمت کس طرح اعلانِ عام کے ساتھ عمل میں آئی، بایں ہمہ ابھی تک یہ نہیں متعین ہوا کہ یہ کس سال کا واقعہ ہے؟ محدثین اور ارباب روایت اس امر میں نہایت مختلف الآرا ہیں[2]۔

حافظ ابن حجر فتح الباری کتاب التفسیر سورۂ مائدہ باب لیس علی الذین آمنوا میں لکھتے ہیں۔

والذی یظهر ان تحریمها کان عام الفتح سنة ثمان کما روی احمد من طریق عبد الرحمٰن بن وعلة قال سألت ابن عباس عن بیع الخمر فقال کان لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صدیق من ثقیف او دوس فلقیه یوم الفتح براویة خمر یهدیها الیه فقال یا فلان اما علمت ان اللہ حرمها۔ الخ

اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شراب کی حرمت فتح مکہ کے زمانے ۸ھ میں ہوئی اور اس کی دلیل یہ ہے کہ امام احمد نے عبد الرحمٰن بن وعلہ کی سند سے روایت کی ہے کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے پوچھا کہ شراب کا بیچنا کیسا ہے تو انھوں نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک دوست تھے جو ثقیف یا دوس کے قبیلے سے تھے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فتح مکہ میں ملے اور ایک مشک شراب تحفہ میں پیش کی، آپ نے فرمایا تم کو معلوم نہیں کہ خدا نے شراب کو حرام کردیا ہے۔

ہماری رائے میں حافظ ابن حجر کا خیال اور ان کا استدلال صحیح نہیں۔ اس روایت سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ ان صاحب کو شراب کی حرمت کا حال فتح مکہ تک نہیں معلوم ہوا تھا، یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت

---

[1] صحیح بخاری تفسیر آیت الربوا و صحیح مسلم باب تحریم بیع الخمر میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اواخر سورۂ بقرہ کے نزول کے بعد جس میں حرمت ربوا کا حکم ہے یہ اعلان فرمایا، یہ آیتیں ۸ھ میں نازل ہوئی ہیں۔ [2] صحیح بخاری و مسلم باب تحریم بیع الخمر والمیتۃ والاصنام [3] سیرۃ النبی جلد اول میں حرمت شراب کی دو تاریخیں مختلف مقامات پر لکھی گئی ہیں، پہلا بیان عام ارباب سیر کا ہے دوسرا علامہ ابن حجر کی تحقیق ہے لیکن مصنفین سیرۃ النبی کی اصلی تحقیق یہاں مذکور ہوئی ہے اور وہ اس باب میں عام محدثین کے ساتھ ہیں جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، "س"۔ [4] مصنف کا یہ قیاس بالکل درست ہے جن صاحب کا یہ واقعہ ہے وہ قبیلۂ ثقیف یا دوس سے تھے ثقیف کا قبیلہ ۸ھ میں مسلمان ہوا اور دوس گو بہت پہلے اسلام لاچکے تھے لیکن وہ مدینہ سے بہت دور آباد تھے، اس کے علاوہ ایک اور نکتہ بھی ہے جس کی طرف ہمارے محدثین نے توجہ نہیں کی ہے وہ یہ ہے جیسا کہ ہم متن میں پہلے لکھ آئے ہیں کہ شراب کا پینا گو ۳ھ میں حرام ہوچکا تھا، لیکن شراب کی تجارت بند نہیں ہوئی تھی، چنانچہ یہ صاحب بھی مے فروش تھے، شراب کی خرید و فروخت ممانعت ربا، کی حرمت کے ساتھ عمل میں آئی اور ربا کی حرمت سب سے آخر میں نازل ہوئی، یعنی ۸ھ میں شراب نوشی کی ممانعت مدینہ میں اسی وقت کردی گئی، لیکن اس کا عام اعلان آپ نے فتح مکہ

حرمت نازل بھی نہیں ہوئی تھی، بہت سے احکام ہیں جن کی خبر دُور کے رہنے والوں کو بہت دیر کے بعد ہوتی، علاوہ اس کے خود بعض روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ فتح مکہ سے پہلے شراب کی حرمت نازل ہوچکی تھی، یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ شراب جیسی ناپاک چیز ۸ھ تک حلال رہتی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے صرف دو برس پہلے حرام ہوتی حقیقت میں شراب ہجرت کے تیسرے یا چوتھے برس حرام ہو چکی تھی۔

سود خواری کی حرمت

سود خواری بھی ان اخلاق ذمیمہ میں سے ہے جو اہل عرب کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گئے تھے، اس لئے نہایت تدریج کے ساتھ اس کی حرمت کے احکام بھی اترے، قریش عموماً تجارت پیشہ تھے ان میں جو امیر اور دولت مند سوداگر تھے وہ غریبوں اور کاشت کاروں کو بھی شرح سود پر روپیہ قرض دیتے اور جب تک قرض وصول نہ ہوجاتا، اصل سرمایہ کو ہر سال بڑھاتے جاتے، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباس (اسلام سے پہلے) بہت بڑے سودی کاروبار کے مالک تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو یہودی تاجروں کے سبب سے یہاں مختلف قسم کے سود کا رواج دیکھا، سب سے پہلے آپ نے چاندی اور سونے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کے زمانہ میں فرمایا جیسا کہ احادیث صحیحہ میں بتصریح مذکور ہے (دیکھو صحیح بخاری تفسیر آیت ربا و باب بیع المیتۃ والاصنام اور صحیح مسلم باب تحریم بیع الخمر)، حافظ ابن حجر جو اس بات کے قائل ہیں کہ شراب کی حرمت ۸ھ میں نازل ہوئی وہ خود جلد اول ص۱۹۱ میں قاضی عیاض کے جواب میں لکھتے ہیں۔ قلت ویحتمل ان یکون تحریم التجارۃ فیها تأخر عن وقت تحریمها واللہ اعلم۔ یعنی ممکن ہے کہ شراب پینے کی حرمت کے بعد شراب کی تجارت کی حرمت نازل ہوئی ہو، صحیح مسلم میں ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے (باب تحریم بیع الخمر) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شراب پینے اور اس کی خرید و فروخت کی ممانعت ایک ساتھ نازل ہوئی، لیکن اس کے بعد حضرت عائشہؓ اور جابرؓ بن عبد اللہ سے جو روایتیں ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلی روایت میں ابو سعید خدری یا ان کے بعد کے راویوں سے کسی قدر تسامح ہوا ہے، واللہ اعلم بالحق علاوہ ازیں حافظ ابن حجر نے امام احمد کی جس حدیث سے فتح مکہ میں شراب نوشی کی حرمت کے نزول پر استدلال کیا ہے، وہ حدیث صحیح مسلم (باب تحریم بیع الخمر) میں بھی ہے، لیکن اس میں فتح مکہ کی تعیین نہیں، سب سے بڑی دلیل اس کی یہ ہے کہ جب شراب کی حرمت نازل ہوئی تو لوگوں نے کہا کہ ہمارے مسلمان بھائی جو شراب پی کر جنگ احد میں شریک ہوئے اور اسی حالت میں مارے گئے ان کا کیا حال ہوگا؟ اس پر آیت لیس علی الذین آمنوا نازل ہوئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شراب کی حرمت کا واقعہ جنگ احد سے بالکل متصل تھا اور جنگ اُحد کا زمانہ یہی ہے۔ بخاری تفسیر آیت مذکور میں حضرت جابرؓ کی روایت ہے۔

صبح ناس غداۃ احد الخمر فقتلوا من یومهم جمیعا شهداء وذالک من قبل تحریمها۔

غزوہ احد کی صبح کو کچھ لوگوں نے شراب پی اور یہ سب اسی دن شہید ہوئے، یہ شراب کی حرمت سے پہلے ہوا۔

اس روایت کے ساتھ حضرت انسؓ کی اس روایت کو ملاؤ جو اس کے بعد ہی واقع ہے۔

فقال بعض القوم قتل قوم وهی فی بطونهم قال فانزل اللہ لیس علی الذین آمنوا۔ الخ

حرمت شراب کی آیت نازل ہوئی تو بعض لوگوں نے کہا کہ کچھ لوگ اس حال میں مارے گئے ہیں کہ شراب ان کے پیٹ میں تھی، اس پر یہ آیت اتری کہ مومنوں پر کچھ حرج نہیں۔ "س"۔

[1] اضافہ تا ختم سود [2] موطا امام مالک باب الربوا [3] ابن جریر طبری آیت ربوا۔

کے ادھار خرید و فروخت کو سود قرار دیا، پھر دو گنے اور چوگنے سود لینے کی ممانعت آئی اور یہ آیت اُتری۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (آل عمران) — مسلمانو! دگنا چوگنا سود نہ کھایا کرو اور خدا سے ڈرا کرو تاکہ فلاح پاؤ۔

اس کے بعد آپ نے ہم جنس اشیا کا باہم گھٹ بڑھ کے مبادلہ منع فرمایا۔ ۷ھ میں غزوۂ خیبر کے موقع پر مسلمانوں نے یہودی سوداگروں سے لین دین شروع کیا، اس وقت آپ نے اعلان فرمایا کہ سونے کو اشرفی کے بھاؤ گھٹا بڑھا کر بیچنا بھی سود ہے، سود کی حرمت کے متعلق تفصیلی احکام ۸ھ میں نازل ہوئے۔ آل عمران کے بعد سورۂ بقرہ میں سب سے پہلے یہ آیت اتری۔

الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّهِ فَانْتَهَىٰ فَلَهُ مَا سَلَفَ — جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ اس طرح کھڑے ہوں گے جس طرح شیطان کسی کو چھو کر مخبوط بنا دیتا ہے، اسلئے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ بیع اور سود کا معاملہ ایک ہی ہے خدا نے بیع کو تو حلال کیا اور سود کو حرام کر دیا پس جس کے پاس خدا کی طرف سے نصیحت کی بات پہنچی اور وہ باز آگیا تو اس کو وہی لینا چاہیئے جو پہلے لیا۔

لوگوں کو یہ اعتراض تھا کہ سود بھی ایک قسم کی تجارت ہے، جب تجارت جائز ہے تو سود کیوں حرام ہے؟ اس سوال کا جواب تو کتاب کی دوسری جلدوں میں آئے گا، یہاں صرف سود کی تاریخ حرمت سے بحث ہے، بہر حال اس آیت میں بھی سود کی قطعی حرمت کا فیصلہ نہ ہوا، آخر تھوڑے ہی وقفہ کے بعد غالباً ۸ھ میں یہ آیت نازل ہوئی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ (بقرہ) — مسلمانو! خدا سے ڈرو اور سود جو باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو، اگر تم سچے مومن ہو اگر یہ نہ کرو تو خدا اور رسول سے لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ، اگر باز آجاؤ تو تم کو اپنے راس المال کا حق ہے نہ تم کسی پر ظلم کرو، نہ کوئی تم پر ظلم کرے۔

یہ آیت جب اُتری تو آپ نے مسجد میں تمام مسلمانوں کو جمع کر کے یہ حکم سنایا۔ ۹ھ میں اہل نجران سے جو معاہدات صلح ہوئے، ان میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ سود نہ لیں گے۔ ذی حجہ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقع پر اس آیت کے نزول سے پہلے تمام ملک عرب میں جس قدر سودی معاملات تھے، آپ نے سب کو کالعدم قرار دیا۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ سود کی حرمت کا حکم اسلام کے سلسلۂ احکام کی سب سے آخری کڑی تھی۔

*

۱ صحیح مسلم باب الصرف ۲ صحاح کتاب البیوع ۳ صحیح مسلم باب بیع القلادۃ فیہا خرز ۴ صحیح بخاری و مسلم باب تحریم بیع الخمر ۵ ابوداؤد باب اخذ الجزیہ ۶ تفسیر آیت واتقوا یوما (بقرہ)

سالِ اخیر حجۃ الوداع اختتامِ فرضِ نبوت

ذی الحجہ ۱۰ھ مطابق فروری ۶۳۲ء

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا — جب خدا کی مدد آگئی اور مکہ فتح ہو چکا اور تو نے دیکھ لیا کہ لوگ خدا کے دین میں فوج کی فوج داخل ہو رہے ہیں تو خدا کی حمد کی تسبیح پڑھ اور استغفار کر، خدا توبہ قبول کرنے والا ہے۔

بظاہر یہ خیال ہوتا ہے کہ نصرت اور فتح کے مقابلہ میں شکر کی ہدایت ہونی چاہیئے تھی، تسبیح اور استغفار کو فتح سے کیا مناسبت ہے؟ اس بنا پر ایک صحبت میں حضرت عمرؓ نے صحابہ سے اس آیت کے معنی پوچھے، لوگوں نے مختلف معنی بتائے۔ حضرت عمرؓ نے عبداللہ بن عباسؓ کی طرف دیکھا، وہ کم سن تھے اور جواب دیتے جھجکتے تھے، حضرت عمرؓ نے ان کی ڈھارس بندھائی، تو انھوں نے کہا کہ یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب وفات کا اعلان ہے کہ استغفار موت کے لئے مخصوص ہے۔

اس سورہ کے نازل ہونے کے بعد آپ کو معلوم ہو گیا تھا کہ رحلت کا زمانہ قریب آگیا ہے، اس لئے اب ضرورت تھی کہ تمام دنیا کے سامنے شریعت اور اخلاق کے تمام اصولِ اساسی کا مجمع عام میں اعلان کر دیا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے زمانہ سے اب تک فریضۂ حج ادا نہیں فرمایا تھا، ایک مدت تک تو قریش سدِ راہ رہے، صلح حدیبیہ کے بعد موقع ملا لیکن مصالح اس کی مقتضی تھے کہ یہ فرض سب سے آخر میں ادا کیا جائے۔

بہر حال ذوقعدہ ۱۰ھ میں اعلان ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حج کے ارادہ سے مکہ تشریف لے جا رہے ہیں، یہ خبر دفعۃً پھیل گئی اور شرفِ ہمرکابی کے لئے تمام عرب امنڈ آیا (سنیچر کے دن) ذوقعدہ کی ۲۶ تاریخ کو آپ نے

۱ صحیح بخاری تفسیر سورۂ اذا جاء، واحدی نے اسباب النزول میں لکھا ہے کہ یہ سورہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے دو برس پہلے اتری لیکن ابن قیم نے زاد المعاد میں لکھا ہے کہ ۱۰ھ میں اور عین ایام تشریق میں اتری (یہ دوسری روایت اصل میں بیہقی کی ہے) اور ابن حجر اور زرقانی نے تصریح کی ہے کہ اس کی سند ضعیف ہے، اس لئے واحدی کی روایت صحیح ہے، سیوطی نے بھی اسباب النزول میں مصنف عبدالرزاق کے حوالہ سے یہی روایت نقل کی ہے کہ یہ سورہ فتح مکہ کے بعد ہی فوراً نازل ہوئی، تصریحات اثر و اشارات حدیث کے علاوہ خود اس سورہ کے طرز بیان نے ظاہر کر دیا ہے کہ وہ فتح مکہ کے متصل ہی اتری ہے یعنی حجۃ الوداع سے تقریباً دو پونے دو برس پہلے جن روایتوں میں وفات سے چند روز پہلے اس سورہ کا نازل ہونا بیان ہوا ہے وہ روایت و درایت دونوں حیثیتوں سے ضعیف ہیں ۲ سنن ابن ماجہ میں ہے (باب حج النبی صلی اللہ علیہ وسلم) کہ ہجرت سے پہلے آپ نے دو حج فرمائے، بعض حدیثوں میں جو یہ ہے کہ آپ نے ایک ہی حج کیا تھا (ترمذی باب کم حج النبی اور ابوداؤد وقت الاحرام) اس سے مقصود بعد ہجرت ہے ۳ ابوداؤد اور صحیح مسلم میں حجۃ الوداع کا واقعہ نہایت تفصیل سے مذکور ہے جس کا شان نزول یہ ہے کہ

نے غسل فرمایا اور چادر اور تہمد باندھی، نماز ظہر کے بعد مدینہ سے باہر نکلے اور تمام ازواج مطہراتؓ کو ساتھ چلنے کا حکم دیا۔ مدینہ سے چھ میل کے فاصلہ پر ذوالحلیفہ ایک مقام ہے جو مدینہ کی میقات ہے، یہاں پہنچ کر رات بھر اقامت فرمائی، دوسرے دن دوبارہ غسل فرمایا، حضرت عائشہؓ نے اپنے ہاتھ سے آپ کے جسم مبارک پر عطر ملا، اس کے بعد آپ نے دو رکعت نماز ادا کی، پھر قصواء پر سوار ہو کر احرام باندھا اور بلند آواز سے یہ الفاظ کہے۔

لبیك اللھم لبیك لبیك لا شریك لك لبیك ان الحمد والنعمة لك والملك لك لا شریك لك۔

اے خدا ہم تیرے سامنے حاضر ہیں، اے خدا تیرا کوئی شریک نہیں ہم حاضر ہیں تعریف اور نعمت سب تیری ہی ہے اور سلطنت میں کوئی تیرا شریک نہیں۔

حضرت جابرؓ جو اس حدیث کے راوی ہیں اُن کا بیان ہے کہ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو آگے پیچھے داہنے بائیں جہاں تک نظر کام کرتی، آدمیوں کا جنگل نظر آتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب لبیک فرماتے تھے تو ہر طرف سے اسی صدائے غلغلہ انگیز کی آواز بازگشت آتی تھی اور تمام دشت وجبل گونج اُٹھتے تھے۔

فتح مکہ میں آپ نے جن منازل میں نماز ادا کی تھی، وہاں برکت کے خیال سے لوگوں نے مسجدیں بنالی تھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان مساجد میں نماز ادا کرتے جاتے تھے، سرف پہنچ کر غسل فرمایا، دوسرے روز اتوار کے روز ذوالحجہ کی چار تاریخ کو صبح کے وقت مکہ معظمہ میں داخل ہوئے، مدینہ سے مکہ تک کا یہ سفر نو دن میں طے ہوا خاندان ہاشم کے لڑکوں نے آمد آمد کی خبر سنی تو خوشی سے باہر نکل آئے۔ آپ نے فرط محبت سے اونٹ پر کسی کو آگے اور کسی کو پیچھے بٹھا لیا، کعبہ نظر پڑا تو فرمایا کہ "اے خدا! اس گھر کو اور زیادہ عزت اور شرف دے" پھر کعبہ کا طواف کیا، طواف سے فارغ ہو کر مقام ابراہیم میں دوگانہ ادا کیا اور یہ آیت پڑھی۔

وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى — اور مقام ابراہیم کو سجدہ گاہ بناؤ۔

صفا پر پہنچے تو یہ آیت پڑھی۔

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِن شَعَائِرِ اللَّهِ — صفا اور مروہ خدا کی نشانیاں ہیں۔

(یہاں سے) کعبہ نظر آیا تو یہ الفاظ فرمائے۔

لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریك لہ لہ الملك ولہ الحمد یحیی ویمیت وھو علی کل شیء

خدا کے سوا کوئی خدا نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں اس کے لئے سلطنت اور حمد ہے، مارتا اور جلاتا ہے اور وہ تمام

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) حضرت امام باقرؒ نے حضرت جابرؓ سے جب وہ نابینا ہو گئے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کا حال پوچھا، حضرت جابرؓ نے آل رسول کی محبت سے امام باقرؒ کے گریبان کے تکمے کھولے اور ان کے سینہ پر محبت سے ہاتھ رکھ کر کہا بھتیجے! پوچھو کیا پوچھتے ہو؟ پھر نہایت تفصیل سے حج نبویؐ کے تمام حالات بیان کئے۔ اوقات کی تعیین بھی بخاری و مسلم میں حضرت ابن عباسؓ، حضرت انسؓ اور حضرت عائشہؓ کی روایتوں میں ہے اور امام نسائی نے کتاب المناسک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وقت و تاریخ کے لئے خاص باب باندھا ہے، باب الوقت الذی خرج فیہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم [۱] صحیح بخاری و مسلم [۲] غسل کا ذکر طبقات ابن سعد ذکر حجۃ الوداع میں ہے (ص ۱۲۴) [۳] کم و بیش ایک لاکھ مسلمان شریک حج تھے [۴] نسائی باب استقبال الحج

قدیر لا الہ الا اللہ وحدہ انجز وعدہ ونصر عبدہ وھزم الاحزاب وحدہ۔

چیزوں پر قادر ہے کوئی خدا نہیں، مگر وہ اکیلا خدا، اس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اپنے بندہ کی مدد کی اور اکیلے تمام قبائل کو شکست دی۔

صفا سے اُتر کر مروہ پر تشریف لائے، یہاں بھی دعا و تہلیل کی۔ اہل عرب ایام حج میں عمرہ ناجائز سمجھتے تھے صفا و مروہ کے طواف وسعی سے فارغ ہو کر آپ نے ان لوگوں کو جن کے ساتھ قربانی کے جانور نہیں تھے عمرہ تمام کر کے احرام اتارنے کا حکم دیا۔ بعض صحابہ نے گزشتہ رسوم مالوفہ کی بنا پر اس حکم کی بجاآوری میں معذرت کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میرے ساتھ قربانی کے اونٹ نہ ہوتے تو میں بھی ایسا ہی کرتا۔ حضرت علیؓ کچھ پہلے یمن بھیجے گئے تھے اسی وقت وہ یمنی حاجیوں کا قافلہ لے کر مکہ میں وارد ہوئے۔ چونکہ ان کے ساتھ قربانی کے جانور تھے اس لئے انھوں نے احرام نہیں اتارا، جمعرات کے روز آٹھویں تاریخ کو آپ نے تمام مسلمانوں کے ساتھ منٰی میں قیام فرمایا دوسرے دن نویں ذی الحجہ کو جمعہ کے روز صبح کی نماز پڑھ کر منٰی سے روانہ ہوئے۔

قریش کا معمول تھا کہ جب مکہ سے حج کے لئے نکلتے تھے تو عرفات کے بجائے مزدلفہ میں قیام کرتے تھے جو حرم کے حدود میں تھا۔ ان کا خیال تھا کہ قریش نے اگر حرم کے سوا کسی اور مقام میں مناسک حج ادا کئے تو ان کی شان یکتائی میں فرق آجائے گا، لیکن اسلام کو جو مساوات عام قائم کرنی تھی اس کے لحاظ سے یہ تخصیص روا نہیں رکھی جاسکتی تھی، اس لئے خدا نے حکم دیا۔ ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ آپ بھی عام مسلمانوں کے ساتھ عرفات میں آئے اور یہ اعلان کرا دیا۔

قفوا علی مشاعرکم فانکم علی ارث من ارث ابیکم ابراھیم۔

اپنے مقدس مقامات میں ٹھہرے رہو کہ تم اپنے باپ ابراہیم کی وراثت پر ہو۔

یعنی عرفہ میں حاجیوں کا قیام حضرت ابراہیم کی یادگار ہے اور ان ہی نے اس مقام کو اس غرض خاص کے لئے متعین کیا ہے۔ عرفات میں ایک مقام نمرہ ہے۔ آپ نے ایک کمل کے خیمہ میں قیام فرمایا۔ دوپہر ڈھل گئی تو ناقہ پر (جس کا نام قصواء تھا) سوار ہو کر میدان میں آئے اور ناقہ کے اوپر ہی سے خطبہ پڑھا۔

آج پہلا دن تھا کہ اسلام اپنے جاہ و جلال کے ساتھ سود از ہوا اور جاہلیت کے تمام بے ہودہ مراسم کو مٹانا تھا اس لئے آپ نے فرمایا۔

الا کل شیء من امر الجاھلیۃ تحت قدمی موضوع (صحیح مسلم وابوداؤد)

ہاں جاہلیت کے تمام دستور میرے دونوں پاؤں کے نیچے ہیں۔

[۱] صحیح بخاری باب الوقوف بعرفۃ [۲] ابوداؤد موضع الوقوف بعرفۃ [۳] یہ اور اس کے بعد کے تمام عربی جملے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبے کے ٹکڑے ہیں (یہ جملے کسی حدیث میں یکجا نہیں ہوتے ہیں اس لئے ان کو مختلف ماخذوں سے جمع کرنا پڑا ہے) صحیح بخاری و صحیح مسلم (باب حجۃ النبی و باب الدیات) اور ابوداؤد (باب الاشہر الحرام و حجۃ النبی) وغیرہ میں یہ خطبہ حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن عمرؓ حضرت ابو امامہ باہلی، حضرت جابرؓ، حضرت ابوبکرؓ [illegible] کی روایتوں سے مذکور ہے، ان روایتوں میں بعض باتیں مشترک ہیں مثلاً ان دماءکم واموالکم حرام علیکم کحرمۃ الخ اور بعض [illegible] ہیں۔ بخاری و دیگر کتابوں میں کچھ اور باتیں بھی

تکمیلِ انسانی کی منزل میں سب سے بڑا سنگِ راہ امتیازِ مراتب تھا، جو دنیا کی تمام قوموں نے تمام مذاہب نے تمام ممالک نے مختلف صورتوں میں قائم رکھا تھا، سلاطین سایۂ یزدانی تھے جن کے آگے کسی کو چون و چرا کی مجال نہ تھی، ائمۂ مذاہب کے ساتھ کوئی شخص مسائلِ مذہبی میں گفتگو کا مجاز نہ تھا، شرفاء رذیلوں سے ایک بالاتر مخلوق تھی، غلام آقا کے ہمسر نہیں ہو سکتے تھے، آج یہ تمام فرقے، یہ تمام امتیازات، یہ تمام حد بندیاں دفعتاً ٹوٹ گئیں۔

ایها الناس الا ان ربکم واحد وان اباکم واحد الا لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی احمر الا بالتقوی (مسند احمد)

لوگو! بے شک تمہارا رب ایک ہے اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے، ہاں عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے۔

ان کل مسلم اخو المسلم وان المسلمین اخوة (مستدرک حاکم جلد ۱ ص ۹۳ و طبری و ابن اسحاق)

(ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور) اور مسلمان باہم بھائی بھائی ہیں۔

ارقاءکم ارقاءکم اطعموهم مما تاکلون واکسوهم مما تلبسون (ابن سعد)

تمہارے غلام تمہارے غلام! جو خود کھاؤ وہی ان کو کھلاؤ جو خود پہنو وہی ان کو پہناؤ۔

عرب میں کسی خاندان کا کوئی شخص کسی کے ہاتھ سے قتل ہوتا تو اس کا انتقام لینا خاندانی فرض ہو جاتا تھا، یہاں تک کہ سینکڑوں برس گزر جانے پر بھی یہ فرض باقی رہتا تھا اور اسی بنا پر لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم ہو جاتا تھا اور عرب کی زمین ہمیشہ خون سے رنگین رہتی تھی، آج سب سے قدیم رسمِ عرب کا سب سے مقدم فخر خاندان کا پُرفخر مشغلہ برباد کر دیا جاتا ہے (اور اس کے لئے نبوت کا منادی سب سے پہلا اپنا نمونہ آپ پیش کرتا ہے)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) مذکور ہیں، اصل یہ ہے کہ یہ ایک طویل خطبہ تھا، ہر ایک شخص کو جو فقرہ یاد رہ گیا جس کی اس نے روایت کی اس بنا پر مختلف ماخذوں سے ان ٹکڑوں کو جمع کر لیا گیا ہے اور اس کے جا بجا حوالے دیئے گئے ہیں، خطبہ کے بعض ضمنی الفاظ مصنف نے چھوڑ دیئے ہیں، روایتوں میں ایک اور اختلاف ہے، حضرت جابرؓ اپنی روایت میں اور ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ خطبہ کا دن یوم عرفہ یعنی ۹ ذی الحجہ اور حضرت ابو بکرہؓ اور حضرت ابن عباسؓ اور دوسری روایتوں میں یوم النحر یعنی ۱۰ ذی الحجہ بتاتے ہیں، بعض نے ایام التشریق کے خطبہ کی ہیں، ابن اسحاق نے اس کو مسلسل خطبہ کے طور پر نقل کیا ہے، ابن ماجہ، ترمذی اور مسند احمد میں خطبہ حجۃ الوداع کے چند فقرے منقول ہیں جن میں یہ تصریح نہیں کہ کس تاریخ کے خطبہ میں آپؐ نے یہ فرمایا، بہر حال صحاح ستہ اور مسانید کی تمام روایات یکجا کرنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ نے اس حج میں تین دفعہ خطبہ دیا۔ ۹ ذی الحجہ یوم عرفہ کو، ۱۰ ذی الحجہ یوم النحر کو اور تیسرا خطبہ ایام تشریق میں ۱۱ یا ۱۲ ذی الحجہ کو، ان خطبوں میں اصولی طور پر بعض باتیں مشترک ہیں اور بعض مختص المقام ہیں۔ یہ بہت ممکن ہے جیسا کہ بعض محدثین نے تصریح کی ہے کہ چونکہ مجمع بہت بڑا تھا اور آپ جو پیغام اپنی امت کو پہنچانا چاہتے ہیں وہ نہایت اہم تھا اس لئے آپؐ نے اپنی تقریر کے بعض بعض فقرے مکرر اعادہ فرمائے ہیں۔
[1] امام احمد نے مسند میں ابونضرۃ تابعی کے واسطہ سے اور تابعی مذکور نے ایک صحابی سے جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حجۃ الوداع کا خطبہ دیتے سنا تھا یہ فقرہ نقل کیا (بحوالہ منتقی الاخبار ابن تیمیہ مع نیل الاوطار)

ودماء الجاهلية موضوعة وان اول دم اضع من دمائنا دم ابن ربيعة ابن الحارث۔ (صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد بروایت جابر)

جاہلیت کے تمام خون (یعنی انتقام خون) باطل کر دیئے گئے اور سب سے پہلے میں (اپنے خاندان کا خون) ربیعہ[1] بن الحارث کے بیٹے کا خون باطل کرتا ہوں۔

تمام عرب میں سودی کاروبار کا ایک جال پھیلا ہوا تھا جس سے غرباء کا ریشہ ریشہ جکڑا ہوا تھا اور ہمیشہ کے لئے وہ اپنے قرض خواہوں کے غلام بن گئے تھے، آج وہ دن ہے کہ اس جال کا تار تار الگ ہوتا ہے، اس فرض کی تکمیل کے لئے بھی معلمِ حق سب سے پہلے اپنے خاندان کو پیش کرتا ہے۔

وربا الجاهلية موضوع واول ربا اضع ربانا ربا عباس بن عبد المطلب (صحیح مسلم و ابوداؤد)

جاہلیت کے تمام سود بھی باطل کر دیئے گئے اور سب سے پہلے اپنے خاندان کا سود (عباسؓ[2] بن عبد المطلب کا سود) باطل کرتا ہوں

آج تک عورتیں ایک جائیداد منقولہ تھیں جو قمار بازی میں داؤں پر چڑھا دی جا سکتی تھیں، آج پہلا دن ہے کہ یہ گروہ مظلوم، یہ صنفِ لطیف، یہ جوہر نازک قدر دانی کا تاج پہنتا ہے۔

فاتقوا الله فی النساء (صحیح مسلم و ابوداؤد)[3]

عورتوں کے معاملہ میں خدا سے ڈرو۔

ان لکم علی نساءکم حقا ولهن علیکم حقا (طبری، ابن ہشام وغیرہما)

تمہارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے۔

عرب میں جان و مال کی کچھ قیمت نہ تھی جو شخص چاہتا تھا قتل کر دیتا تھا اور جس کا مال چاہتا تھا چھین لیتا تھا، آج امن و سلامتی کا بادشاہ تمام دنیا کو صلح کا پیغام سناتا ہے۔

ان دماءکم واموالکم علیکم حرام کحرمة یومکم هذا فی شهرکم هذا فی بلدکم هذا الی یوم تلقون ربکم[4]

تمہارا خون اور تمہارا مال تا قیامت اسی طرح حرام ہے جس طرح یہ دن اس مہینہ میں اور اس شہر میں حرام ہے۔

اسلام سے پہلے بڑے بڑے مذاہب دنیا میں پیدا ہوئے لیکن ان کی بنیاد خود صاحبِ شریعت کے تحریری اصول پر نہ تھی، ان کو خدا کی طرف سے جو ہدایتیں ملی تھیں، بندوں کی ہوس پرستیوں نے ان کی حقیقت گم کر دی تھی، ابدی مذہب کا پیغمبر اپنی زندگی کے بعد ہدایاتِ الٰہی کا مجموعہ بھی، اپنے ہاتھ سے اپنی امت کو سپرد کرتا ہے اور تاکید کرتا ہے۔

وانی قد ترکت فیکم ما لن تضلوا بعده ان اعتصمتم به کتاب الله (صحاح)

میں تم میں ایک چیز چھوڑتا ہوں اگر تم نے اس کو مضبوط پکڑ لیا تو تم گمراہ نہ ہوگے وہ کیا چیز ہے؟ کتاب اللہ۔

[1] ربیعہ قریش کے خاندان سے تھے اور ان کے خون کا انتقام لینا میراث کے طور پر ایک فرض خاندانی چلا آتا تھا، ربیعہ بن حارث بن عبد المطلب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی تھے اور بعض روایتوں میں خود ان کے قتل کا ذکر ہے لیکن یہ صحیح نہیں، ربیعہ خلافتِ فاروقی تک زندہ رہے اور ۲۳ھ میں وفات پائی۔ صحیح یہ ہے کہ ربیعہ کا ایاس نام ایک بیٹا تھا وہ قبیلہ بنو سعد میں پرورش پا رہا تھا کہ ہذیل نے اس کو قتل کر ڈالا۔ دیکھو ابوداؤد و صحیح مسلم باب حجۃ النبی اور زرقانی جلد ۳ صفحہ ۲۱۲۔
[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباسؓ اسلام سے پہلے سود کا کاروبار کرتے تھے، بہت سے لوگوں کے ذمہ ان کا سود باقی تھا دیکھو تفسیر آیت ربو۔
[3] اس کے بعد آپ نے زن و شوہر کے فرائض کی تفصیل فرمائی۔
[4] صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد وغیرہ۔

اس کے بعد آپ نے چند اصولی احکام کا اعلان فرمایا۔[۱]

ان اللہ عزوجل قد اعطی کل ذی حق حقہ فلا وصیۃ لوارث۔ — خدا نے ہر حق دار کو (از روئے وراثت) اس کا حق دے دیا اب کسی کو وراثت کے حق میں وصیت جائز نہیں۔

الولد للفراش وللعاہر الحجر وحسابہم علی اللہ۔ — لڑکا اس کا ہے جس کے بستر پر پیدا ہوا زنا کار کے لئے پتھر ہے اور ان کا حساب خدا کے ذمہ ہے۔

من ادعی الی غیر ابیہ وانتمی الی غیر موالیہ فعلیہ لعنۃ اللہ۔ — جو لڑکا اس باپ کے علاوہ کسی اور کے نسب سے ہونے کا دعویٰ کرے اور جو غلام اپنے مولیٰ کے سوا کسی اور طرف اپنی نسبت کرے اس پر خدا کی لعنت ہے

الا لایحل لامرأۃ ان تعطی من مال زوجہا شیئاً الا باذنہ الدین مقضی والعاریۃ مؤداۃ والمنحۃ مردودۃ والزعیم غارم۔ — ہاں عورت کو اپنے شوہر کے مال میں سے اس کی اجازت کے بغیر کچھ دینا جائز نہیں، قرض ادا کیا جائے، عاریت واپس کی جائے، عطیہ لوٹایا جائے، ضامن تاوان کا ذمہ دار ہے۔

یہ فرما کر آپ نے مجمع عام کی طرف خطاب کیا۔

انتم مسئولون عنی فما انتم قائلون (صحیح مسلم و ابوداؤد) — تم سے خدا کے ہاں میری نسبت پوچھا جائے گا تم کیا جواب دو گے؟

صحابہ نے عرض کی ہم کہیں گے کہ آپ نے خدا کا پیغام پہنچا دیا اور اپنا فرض ادا کر دیا، آپ نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور تین بار فرمایا۔

اللہم اشہد (صحیح مسلم و ابوداؤد) — اے خدا تو گواہ رہنا۔

عین اس وقت جب آپ یہ فرض نبوت ادا کر رہے تھے یہ آیت اتری۔[۲]

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ — آج میں نے تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لئے مذہب اسلام کو انتخاب کر لیا۔

نہایت حیرت انگیز اور عبرت خیز منظر یہ تھا کہ شاہنشاہ عالم جس وقت لاکھوں آدمیوں کے مجمع میں فرمان ربانی کا اعلان کر رہا تھا، اس کے تخت شاہنشاہی کا مسند و بالیں کجاوہ اور عرق گیر (ایک روپیہ سے زیادہ قیمت کا نہ تھا۔[۳]

خطبہ سے فارغ ہو کر آپ نے حضرت بلالؓ کو اذان کا حکم دیا اور ظہر اور عصر کی نماز ایک ساتھ ادا کی، پھر ناقہ پر سوار ہو کر موقف تشریف لائے اور وہاں کھڑے ہو کر دیر تک قبلہ رو دعا میں مصروف رہے۔ جب آفتاب ڈوبنے لگا تو آپ نے وہاں سے چلنے کی تیاری کی، حضرت اسامہ بن زیدؓ کو اونٹ پر پیچھے بٹھا لیا، آپ ناقہ کی زمام کھینچے

[۱] سنن ابن ماجہ باب الوصایا و مسند ابوداؤد طیالسی، بروایت ابی امامۃ الباہلی، ابوداؤد کتاب الوصایا میں مختصراً ہے ابن سعد اور ابن اسحاق نے بھی اس کو بسند روایت کی ہے کہ عرفہ کے خطبہ میں آپ نے فرمایا۔ [۲] صحیح بخاری و صحیح مسلم و ابوداؤد وغیرہ، ابن سعد میں تصریح خاص ہے تہ طبقات ابن سعد صفحہ ۔ [۳] کتاب الشمائل للترمذی و ابن ماجہ۔

ہوتے تھے، یہاں تک کہ اس کی گردن کجاوے میں آکر لگتی تھی، لوگوں کے ہجوم سے ایک اضطراب سا پیدا ہو گیا تھا۔ لوگوں کو دست راست سے اور بخاری میں ہے کہ کوڑے سے آپ اشارہ کرتے جاتے تھے کہ آہستہ آہستہ اور زبان مبارک سے ارشاد فرما رہے تھے۔

السکینۃ یا ایہا الناس السکینۃ یا ایہا الناس۔ — لوگو! سکون کے ساتھ، لوگو! سکون کے ساتھ۔

اثنائے راہ میں ایک جگہ اتر کر طہارت کی، اسامہؓ نے کہا یا رسول اللہ! نماز کا وقت تنگ ہو رہا ہے، فرمایا نماز کا موقع آگے آتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ تمام قافلہ کے ساتھ مزدلفہ پہنچے، یہاں پہلے مغرب کی نماز پڑھی، اس کے بعد لوگوں نے اپنے اپنے پڑاؤ پر جا کر سواریوں کو بٹھایا، ابھی سامان کھولنے بھی نہیں پائے تھے کہ فوراً ہی عشا کی تکبیر ہوئی، نماز سے فارغ ہو کر آپ لیٹ گئے اور صبح تک آرام فرمایا، بیچ میں روزانہ دستور کے خلاف عبادت شبانہ کے لئے بیدار نہ ہوئے، محدثین نے لکھا ہے کہ یہی ایک شب ہے جس میں آپ نے نماز تہجد ادا نہیں فرمائی۔ صبح سویرے اٹھ کر باجماعت فجر کی نماز پڑھی، کفار قریش مزدلفہ سے اس وقت کوچ کرتے تھے، جب آفتاب پورا نکل آتا تھا اور آس پاس کے پہاڑوں کی چوٹیوں پر دھوپ چمکنے لگتی تھی، اس وقت آواز بلند کہتے تھے، کوہ ثبیر دھوپ سے چمک جا! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رسم کے ابطال کے لئے سورج نکلنے سے پہلے یہاں سے کوچ فرمایا، یہ ذی الحجہ کی دسویں تاریخ اور سنیچر کا دن تھا۔

فضل بن عباسؓ آپ کے برادر عم زاد ناقہ پر ساتھ تھے، اہل حاجت داہنے بائیں حج کے مسائل دریافت کرنے کے لئے آ رہے تھے، آپ جواب دیتے تھے اور زور زور سے مناسک حج کی تعلیم دیتے جاتے تھے۔[۱] وادی محسر کے راستہ سے آپ جمرہ کے پاس آئے، ابن عباسؓ سے جو اس وقت کم سن تھے، فرمایا مجھے کنکریاں چن کر دو، آپ نے کنکریاں پھینکیں اور لوگوں کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا۔[۲]

ایاکم والغلو فی الدین فانما اہلک من قبلکم الغلو فی الدین (ابن ماجہ و نسائی) — مذہب میں غلو اور مبالغہ سے بچو، کیونکہ تم سے پہلی قومیں اسی سے برباد ہوئیں۔

اسی اثنا میں آپ یہ بھی فرماتے۔

لتاخذوا مناسککم فانی لا ادری لعلی لا احج بعد حجتی ہذہ (مسلم و ابوداؤد) — حج کے مسائل سیکھ لو، میں نہیں جانتا شاید کہ اس کے بعد مجھے دوسرے حج کی نوبت نہ آئے۔

یہاں سے فارغ ہو کر منیٰ کے میدان میں تشریف لائے، داہنے بائیں، آگے پیچھے، تقریباً ایک لاکھ مسلمانوں کا مجمع تھا، مہاجرین قبلہ کے داہنے، انصار بائیں اور بیچ میں عام مسلمانوں کی صفیں تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ناقہ پر سوار تھے، حضرت بلال کے ہاتھ میں ناقہ کی مہار تھی، حضرت اسامہ بن زیدؓ پیچھے پیچھے کپڑا تان کر سایہ کئے ہوئے تھے، آپ نے نظر اٹھا کر اس عظیم الشان مجمع کی طرف دیکھا تو فرائض نبوت کے ۲۳ سالہ نتائج نگاہوں کے سامنے تھے زمین سے آسمان تک قبول و اعتراف حق کا نور ضوفشاں تھا، دیوان قضا میں انبیائے سابقینؑ کے فرائض تبلیغ کے

[۱] بخاری و مسلم و ابوداؤد [۲] صحیح بخاری و ابوداؤد [۳] ابوداؤد و نسائی۔

کارناموں پر ختمِ رسالت کی مہر ثبت ہو رہی تھی اور دنیا اپنی تخلیق کے لاکھوں برس کے بعد دینِ فطرت کی تکمیل کا مژدہ کائنات کے ذرہ ذرہ کی زبان سے سُن رہی تھی، عین اسی عالم میں زبانِ حق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کام و دہن میں زمزمہ پرداز ہوئی۔

اب ایک نئی شریعت ایک نئے نظام اور ایک نئے عالم کا آغاز تھا، اسی بنا پر ارشاد فرمایا۔

ان الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق اللہ السموات والارض (بروایت ابوبکرہ)

ابتداء میں جب خدا نے آسمان و زمین کو پیدا کیا تھا زمانہ پھر پھرا کے آج پھر اسی نقطہ پر آگیا۔

ابراہیم خلیل کے طریق عبادت (حج) کا موسم اپنی جگہ سے ہٹ گیا تھا اس کا سبب یہ ہے کہ اس زمانہ میں کسی قسم کی خونریزی جائز نہیں تھی[1]، اس لئے عربوں کے خون آشام جذبات حیلۂ جنگ کے لئے اس کو کبھی گھٹا کبھی بڑھا دیتے تھے۔ آج وہ دن آیا کہ اس اجتماعِ عظیم کے اشہرِ حرم کی تعیین کر دی جائے۔ آپؐ نے فرمایا۔

السنۃ اثنا عشر شہرا منہا اربعۃ حرم ثلاثۃ متوالیات ذوالقعدہ و ذوالحجۃ ومحرم ورجب شہر مضر الذی بین جمادی وشعبان (بروایت ابوبکرہ)

سال کے بارہ مہینے ہیں جن میں چار مہینے قابلِ احترام ہیں تین تو متواتر مہینے ہیں ذوقعدہ، ذوالحجہ اور محرم اور چوتھا رجب مضر کا مہینہ جو جمادی الثانی اور شعبان کے بیچ میں ہے۔

دنیا میں عدل و انصاف اور جور و ستم کا محور صرف تین چیزیں ہیں، جان، مال اور آبرو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کل کے خطبہ میں گو اُن کے متعلق ارشاد فرما چکے تھے، لیکن عرب کے صدیوں کے زنگ دُور کرنے کے لئے مکرر تاکید کی ضرورت تھی، آج آپؐ نے اس کے لئے عجیب بلیغ انداز اختیار فرمایا۔

لوگوں سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ کچھ معلوم ہے آج کون سا دن ہے؟ لوگوں نے عرض کی کہ خدا اور اُس کے رسول کو زیادہ علم ہے۔ آپؐ دیر تک خاموش رہے۔ لوگ سمجھے کہ شاید آپؐ اس دن کا کوئی اور نام رکھیں گے۔ دیر تک سکوت کے بعد فرمایا۔ کیا آج قربانی کا دن نہیں ہے؟ لوگوں نے کہا ہاں بے شک ہے۔ پھر ارشاد ہوا۔ یہ کونسا مہینہ ہے؟ لوگوں نے پھر اسی طریقہ سے جواب دیا۔ آپؐ نے پھر دیر تک سکوت کیا اور فرمایا۔ کیا یہ ذوالحجہ نہیں ہے؟ لوگوں نے کہا۔ ہاں بے شک ہے۔ پھر پوچھا۔ یہ کون سا شہر ہے؟ لوگوں نے بدستور جواب دیا۔ آپؐ نے اسی طرح دیر تک سکوت کے بعد فرمایا۔ کیا یہ بلدۃ الحرام نہیں ہے؟ لوگوں نے کہا۔ ہاں بے شک ہے۔ جب سامعین کے دل

[1] حج کے ان مہینوں کے احترام اور بزرگی کا تخیل عرب میں نہایت قدیم زمانہ سے چلا آتا تھا اور عرب کے تمام فرقے خواہ یہودی یا عیسائی یا کسی اور مذہب کے پیرو ہوں سب برابر ان کی عزت کرتے تھے، ان مہینوں میں جنگ و جدال اور لڑائی بھڑائی حرام جانتے تھے قدیم اشعارِ عرب میں ان کا بیان نہایت کثرت سے ہے۔ رومیوں کی تاریخ میں بھی عربوں کے اس عقیدہ کا ذکر ہے ۵۴۱ء میں رومیوں کو شام اور فلسطین میں کوئی جنگی کارروائی کرنی تھی اور ساتھ ہی عربوں کے حملہ کا خوف لگا تھا، سپہ سالارِ روم جو عربوں کے اندرونی حالات سے واقف تھا اس نے جواب دیا کہ اس زمانہ میں عربوں سے کوئی خوف نہیں، کیونکہ عنقریب وہ دو مہینے آرہے ہیں جن میں اہلِ عرب عبادتوں میں مشغول رہتے ہیں اور کسی قسم کا ہتھیار نہیں لگاتے۔ نتائج الافہام محمود پاشا فلکی ص ۳۵ بحوالہ فرنچ ایشیاٹک سوسائٹی جرنل اپریل ۱۸۵۸ء ص

میں یہ خیال پوری طرح جاگزین ہو چکا کہ حج کا دن بھی، مہینہ بھی اور خود شہر بھی محترم ہے، یعنی اس دن اس مقام میں جنگ اور خون ریزی جائز نہیں، تب فرمایا۔

فان دماءکم واموالکم واعراضکم علیکم حرام لحرمۃ یومکم ھذا فی شہرکم ھذا فی بلدکم ھذا (بروایت ابوبکرہ)

تو تمہارا خون، تمہارا مال اور تمہاری آبرو (تا قیامت) اسی طرح محترم ہے جس طرح یہ دن، اس مہینہ میں اور اس شہر میں محترم ہے۔

قوموں کی بربادی ہمیشہ آپس کے جنگ و جدال اور باہمی خونریزیوں کا نتیجہ رہی ہے، وہ پیغمبر جو ایک لازوال قومیت کا بانی بن کر آیا تھا اس نے اپنے پیروؤں سے باآواز بلند کہا۔

الا لا ترجعوا بعدی ضلالا یضرب بعضکم رقاب بعض وستلقون ربکم فیسئلکم عن اعمالکم (بروایت ابوبکرہ)

ہاں میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ خود ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو، تم کو خدا کے سامنے حاضر ہونا پڑے گا اور وہ تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس کرے گا۔

ظلم و ستم کا ایک عالمگیر پہلو یہ تھا کہ اگر خاندان میں کسی ایک شخص سے کوئی گناہ سرزد ہوتا تو اس خاندان کا ہر شخص اس جرم کا قانونی مجرم سمجھا جاتا تھا اور اکثر اصلی مجرم کے روپوش یا فرار ہو جانے کی صورت میں بادشاہ کا اس خاندان میں سے جس پر قابو چلتا تھا اس کو سزا دیتا تھا، باپ کے جرم میں بیٹے کو سولی دی جاتی تھی اور بیٹے کے جرم کا خمیازہ باپ کو اٹھانا پڑتا تھا، یہ سخت ظالمانہ قانون تھا جو مدت سے دنیا میں حکمران تھا، اگرچہ قرآن مجید نے لا تزر وازرۃ وزر اخریٰ کے وسیع قانون کی رو سے اس ظلم کی ہمیشہ کے لئے بیخ کنی کر دی تھی، لیکن اس وقت جب دنیا کا آخری پیغمبر ایک نیا نظامِ سیاست ترتیب دے رہا تھا، اس اصول کو فراموش نہیں کر سکتا تھا، آپؐ نے فرمایا۔

الا لا یجنی جان الا علی نفسہ الا لا یجنی جان علی ولدہ ولا مولود علی والدہ (ابن ماجہ و ترمذی)

ہاں مجرم اپنے جرم کا آپ ذمہ دار ہے، ہاں باپ کے جرم کا ذمہ دار بیٹا نہیں اور بیٹے کے جرم کا جواب دہ باپ نہیں۔

عرب کی بدامنی اور نظامِ ملک کی بے ترتیبی کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ ہر شخص اپنی خداوندی کا آپ مدعی تھا، اور دوسرے کی ماتحتی اور فرمانبرداری کو اپنے لئے ننگ اور عار جانتا تھا۔ ارشاد ہوا۔

ان امر علیکم عبد مجدع اسود یقودکم بکتاب اللہ فاسمعوا لہ واطیعوا (صحیح مسلم)

اگر کوئی حبشی بریدہ غلام بھی تمہارا امیر ہو اور وہ تم کو خدا کی کتاب کے مطابق لے چلے تو اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کرو۔

ریگستانِ عرب کا ذرہ ذرہ اس وقت اسلام کے نُور سے منور ہو چکا تھا اور خانہ کعبہ ہمیشہ کے لئے ملتِ ابراہیم کا مرکز بن چکا تھا اور فتنہ پردازانہ قوتیں پامال ہو چکی تھیں، اس بنا پر آپؐ نے ارشاد فرمایا۔

الا ان الشیطان قد ایس ان یعبد فی بلدکم ھذا ابدا ولکن ستکون لہ طاعۃ فیما تحتقرون من اعمالکم فسیرضی بہ (ابن ماجہ و ترمذی)

ہاں شیطان اس بات سے مایوس ہو چکا کہ اب تمہارے اس شہر میں اس کی پرستش قیامت تک نہ کی جائے گی لیکن البتہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں اس کی پیروی کرو گے اور وہ اس پر خوش ہوگا۔

سب سے آخر میں آپؐ نے اسلام کے فرض ادنیٰ یاد دلائے۔

اعبدوا ربکم وصلوا خمسکم وصوموا شھرکم واطیعوا اذا امرکم تدخلوا جنۃ ربکم۔

اپنے پروردگار کو پوجو، پانچوں وقت کی نماز پڑھو، مہینہ کے روزے رکھا کرو، اور میرے احکام کی اطاعت کرو، خدا کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

(مسند احمد ج ۵ ص ۲۵۱ و مستدرک حاکم ج ۱ ص ۳۸۹، ص ۴۷۳)

یہ فرما کر آپؐ نے مجمع کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا۔

الا ھل بلغت۔ — کیوں میں نے پیغام خداوندی سنا دیا۔

سب بول اٹھے، ہاں: فرمایا۔

اللّٰھم اشھد۔ — اے خدا تو گواہ رہنا۔

پھر لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا۔

فلیبلغ الشاھد الغائب۔ — جو لوگ اس وقت موجود ہیں وہ ان کو سنا دیں جو موجود نہیں۔

خطبہ[1] کے اختتام پر آپؐ نے تمام مسلمانوں کو الوداع کہا۔

اس کے بعد آپؐ قربان گاہ کی طرف تشریف لے گئے اور فرمایا کہ قربانی کے لئے منیٰ کی کچھ تخصیص نہیں ہے بلکہ منیٰ اور مکہ کی ایک ایک گلی میں قربانی ہو سکتی ہے۔ آپؐ کے ساتھ قربانی کے سو اونٹ تھے کچھ تو آپؐ نے خود اپنے ہاتھ سے ذبح کئے اور باقی حضرت علیؓ کے سپرد کر دیئے کہ وہ ذبح کریں اور حکم دیا کہ گوشت پوست جو کچھ ہو سب خیرات کر دیا جائے۔ یہاں تک کہ قصاب کی مزدوری بھی اس سے ادا نہ کی جائے بلکہ الگ سے دی جائے۔

قربانی سے فارغ ہو کر آپؐ نے معمر بن عبداللہ کو بلوایا اور سر کے بال منڈوائے اور فرطِ محبت سے کچھ بال خود اپنے دستِ مبارک سے ابو طلحہؓ انصاری اور ان کی بیوی ام سلیم اور بعض ان لوگوں کو جو پاس بیٹھے تھے عنایت فرمائے اور باقی ابو طلحہؓ نے اپنے ہاتھ سے تمام مسلمانوں میں ایک ایک دو دو کر کے تقسیم کر دیئے۔ اس کے بعد آپؐ مکہ معظمہ تشریف لائے، خانہ کعبہ کا طواف کیا، اس سے فارغ ہو کر چاہ زمزم کے پاس آئے۔

چاہ زمزم سے حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمت خاندانِ عبدالمطلب سے متعلق تھی، چنانچہ اس وقت اسی خاندان کے لوگ پانی نکال نکال کر لوگوں کو پلا رہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا "یا بنی مطلب اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ مجھ کو ایسا کرتے دیکھ کر اور لوگ بھی تمہارے ہاتھ سے ڈول چھین کر خود اپنے ہاتھ سے پانی نکال کر پئیں گے تو میں خود اپنے ہاتھ سے پانی نکال کر پیتا۔"

حضرت عباسؓ نے ڈول میں پانی نکال کر پیش کیا۔ آپؐ نے قبلہ رُخ ہو کر کھڑے کھڑے پانی پیا، پھر یہاں سے

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطبہ بہت بڑا تھا، صحیح مسلم (حج) میں روایت ہے کہ قال قولا کثیرا، آپؐ نے بہت سی باتیں فرمائیں۔ صحیح بخاری (حجۃ الوداع) میں ہے کہ آپؐ نے اس میں دجال کا ذکر بھی فرمایا تھا لیکن یہ تعین نہیں کہ کس دن کے خطبہ میں یہ فرمایا تھا۔ صحیح بخاری باب الخطبہ ایام منیٰ، صحیح مسلم و ابو داؤد۔

منیٰ واپس تشریف لے گئے اور وہیں نماز ظہر ادا فرمائی[1]۔

بقیہ ایام التشریق یعنی ۱۲ ذی الحجہ تک آپؐ نے مستقل اقامت منیٰ ہی میں فرمائی۔ ہر روز زوال کے بعد رمی جمار کی غرض سے تشریف لے جاتے اور پھر واپس آ جاتے۔ ابو داؤد (باب الخطبہ یمنی) میں ایک حدیث ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے ۱۲ ذی الحجہ کو بھی منیٰ میں ایک خطبہ دیا تھا جس کے الفاظ مختصراً وہی ہیں جو پہلے خطبہ میں گزر چکے ہیں۔ ۱۳ ذی الحجہ کو سہ شنبہ کے دن زوال کے بعد آپؐ نے یہاں سے نکل کر وادی محصّب میں قیام کیا اور شب کو اسی مقام پر آرام فرمایا۔ پچھلے پہر اُٹھ کر مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور خانہ کعبہ کا آخری طواف کر کے وہیں صبح کی نماز ادا کی۔ اس کے بعد قافلہ اسی وقت اپنے اپنے مقام کو روانہ ہو گیا اور آپؐ نے مہاجرین و انصار کے ساتھ مدینہ کی طرف مراجعت فرمائی۔ راہ میں ایک مقام خم پڑا، جو جحفہ سے تین میل پر ہے، یہاں ایک تالاب ہے۔ عربی میں تالاب کو غدیر کہتے ہیں اور اس لئے اس مقام کا نام عام روایتوں میں غدیر خم آتا ہے۔ آپؐ نے یہاں تمام صحابہ کو جمع کر کے ایک مختصر سا خطبہ دیا۔

اما بعد الا ایھا الناس فانما انا بشر یوشك ان یاتی رسول اللہ فاجیب و انا تارك فیکم الثقلین اولھما کتاب اللہ فیہ الھدی والنور فخذوا کتاب اللہ واستمسکو بہ واھل بیتی اذکرکم اللہ فی اھل بیتی۔

حمد و ثنا کے بعد اے لوگو! میں بھی بشر ہوں، ممکن ہے کہ خدا کا فرشتہ جلد آ جائے اور مجھے قبول کرنا پڑے (یعنی موت) میں تمہارے درمیان دو بھاری چیزیں چھوڑتا ہوں، ایک خدا کی کتاب جس کے اندر ہدایت اور روشنی ہے خدا کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑو اور دوسری چیز میرے اہل بیت ہیں میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تمہیں خدا کو یاد دلاتا ہوں۔

آخری جملہ کو آپؐ نے تین دفعہ مکرر فرمایا۔ یہ صحیح مسلم (مناقب حضرت علیؓ) کی روایت ہے، نسائی، مسند امام احمد، ترمذی، طبرانی، طبری، حاکم وغیرہ میں کچھ اور فقرے بھی ہیں جن میں حضرت علیؓ کی منقبت ظاہر کی گئی ہے، ان روایتوں میں ایک فقرہ اکثر مشترک ہے۔

من کنت مولاہ فعلی مولاہ اللّٰھم وال من والاہ وعاد من عاداہ۔

جس کو میں محبوب ہوں علی بھی اس کو محبوب ہونا چاہیئے، الٰہی جو علی سے محبت رکھے اس سے تو بھی محبت رکھ اور جو علی سے عداوت رکھے اس سے تو بھی عداوت رکھ۔

احادیث میں خاص یہ تصریح نہیں کہ ان الفاظ کے کہنے کی ضرورت کیا پیش آئی؟ بخاری میں ہے کہ اسی زمانے میں حضرت علیؓ یمن بھیجے گئے جہاں سے واپس آ کر وہ حج میں شامل ہوئے تھے، یمن میں انہوں نے اپنے

---

[1] حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث بخاری و مسلم دونوں میں ہے کہ آپؐ نے ظہر کی نماز حسب دستور اس دن منیٰ میں پڑھی، لیکن حضرت جابرؓ کی جو طویل حدیث قصہ حجۃ الوداع میں ہے، اس میں تعیین ہے کہ آپؐ نے مکہ میں نماز ظہر پڑھی، حضرت عائشہؓ کی ایک روایت سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے، اس بنا پر محدثین میں ان دونوں قولوں کی باہمی ترجیح اور وجہ ترجیح میں اختلاف ہے۔ علامہ ابن حزم نے دوسری روایت کو ترجیح دی ہے اور علامہ ابن قیم نے زاد المعاد میں پہلے قول کو مرجح ثابت کیا ہے، فریقین کے موازنہ دلائل کے بعد ہم نے ابن قیم کا فیصلہ قبول کیا ہے۔ (۲) اسی کا دوسرا نام ابطح اور خیف بن کنانہ ہے۔

اختیار سے ایک ایسا واقعہ کیا تھا جس کو اُن کے بعض ہمراہیوں نے پسند نہیں کیا۔ ان میں سے ایک صاحب نے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی۔ آپ نے فرمایا "علی کو اس سے زیادہ کا حق تھا" عجب نہیں کہ اس قسم کے شکوک رفع کرنے کے لئے اس موقع پر آپ نے یہ الفاظ فرمائے۔

مدینہ کے قریب پہنچ کر ذوالحلیفہ میں شب بسر کی۔ صبح کے وقت ایک طرف سے آفتاب نکلا اور دوسری طرف کوکبۂ نبوی مدینہ منورہ میں داخل ہوا۔ سوادِ مدینہ پر نظر پڑی تو یہ الفاظ فرمائے[2]

اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک ولہ الحمد وھو علیٰ کل شیٔ قدیر، آئبون تائبون عابدون وساجدون لربنا حامدون صدق اللہ وعدہ ونصر عبدہ وھزم الاحزاب وحدہ۔	خدا بزرگ و برتر ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں کوئی اس کا شریک نہیں، بس اسی کی سلطنت ہے اسی کے لئے مدح و ستائش ہے وہ ہر بات پر قادر ہے۔ لوٹتے آرہے ہیں توبہ کرتے ہوئے فرمانبردارانہ زمین پر پیشانی رکھ کر اپنے پروردگار کی مدح و ستائش میں معروف ہو کر، خدا نے اپنا وعدہ سچا کیا، اپنے بندہ کی نصرت کی اور تمام قبائل پر تنہا شکست دی۔

*

له صحیح بخاری بعث علی الی الیمن والترمذی مناقب حضرت علیؓ۔
٢ه حجۃ الوداع کے تمام تر واقعات صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد و نسائی سے لئے گئے ہیں۔ ہر واقعہ کے لئے ان کتابوں میں کتاب الحج کے مختلف ابواب دیکھو۔

وفات

إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُم مَّيِّتُونَ (زمر)

ربیع الاول ۱۱ھ مطابق مئی ۶۳۲ء

روحِ قدسی کو عالمِ جسمانی میں اسی وقت تک رہنے کی ضرورت تھی کہ تکمیلِ شریعت اور تزکیۂ نفوس کا عظیم الشان کام درجۂ کمال تک پہنچ جائے۔ حجۃ الوداع میں یہ فرضِ اہم ادا ہو چکا، توحیدِ کامل اور مکارمِ اخلاق کے اصول عملاً قائم کر کے عرفات کے مجمعِ عام میں اعلان کر دیا گیا کہ۔

الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي۔	آج کے دن میں نے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور اپنی نعمتیں پوری کر دیں۔

سورۂ فتح کا نزول خاص خاص صحابہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قربِ وفات کی اطلاع دے چکا تھا[1] آپ حکمِ ربانی فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ (فتح) کے مطابق زیادہ تر اوقات تسبیح و تہلیل میں بسر فرماتے تھے آپ عموماً ہر سال رمضان مبارک میں دس دن اعتکاف میں بیٹھتے تھے لیکن رمضان ۱۰ھ میں بیس دن اعتکاف میں بیٹھے، سال میں ایک دفعہ ماہِ رمضان میں آپ پورا قرآن ناموسِ اکبر کی زبانی سنتے تھے لیکن وفات کے سال دو دفعہ یہ شرف حاصل ہوا[2] حجۃ الوداع کے موقع پر مناسکِ حج کی تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ نے یہ اعلان بھی فرمایا کہ مجھے امید نہیں کہ آئندہ سال تم سے مل سکوں۔ بعض روایتوں میں یہ الفاظ اس طرح وارد ہوئے ہیں۔ شاید میں اس کے بعد حج نہ کر سکوں[3]۔ غدیرِ خم کے خطبوں میں بھی اسی قسم کے الفاظ ادا ہوئے۔

غزوۂ احد کے بیان میں گزر چکا ہے کہ شہدائے اُحد کے جنازہ کی نماز نہیں پڑھی گئی تھی، تمام غزوات میں صرف غزوۂ اُحد ہی ایک ایسا غزوہ ہے جس میں مسلمانوں نے سب سے زیادہ بے کسی کے ساتھ جان دی، اس لئے ان کی یاد آپ کے دل میں اس وقت بھی موجود تھی۔

حجۃ الوداع کے موقع پر تمام مسلمانوں کو اپنے فیضِ دیدار سے مشرف فرمایا اور ان کو حسرت کے ساتھ الوداع کیا شہدائے اُحد جو بَلْ هُمْ أَحْيَاءٌ کے مژدہ جانفزا سے فیض یاب تھے، آٹھ برس کے بعد آخری دفعہ آپ نے ان کو بھی اپنی زیارت سے مشرف کرنا ضروری سمجھا چنانچہ اسی زمانہ میں ان کی قبر پر تشریف لے گئے اور ان کے لئے دعائے خیر فرمائی اور اس رقت انگیز طریقہ سے ان کو الوداع کیا کہ جس طرح ایک مرنے والا اپنے زندہ اعزہ

له صحیح بخاری تفسیر اذا جاء نصر اللہ، اس قسم کی روایتیں گو طبری، ابن خزیمہ اور ابن مردویہ میں ہیں لیکن مختصراً صحیح بخاری تفسیر اذا جاء میں بھی مذکور ہیں۔ ٢ه صحیح بخاری باب الاعتکاف و باب تالیف القرآن۔ ٣ه مسلم و ابوداؤد و نسائی، کتاب الحج۔

کو وداع کرتا ہے۔ اس کے بعد ایک خطبہ دیا جس میں فرمایا۔ میں تم سے پہلے حوض پر جا رہا ہوں، اس کی وسعت اتنی ہے جتنی ایلہ سے جحفہ تک، مجھ کو تمام دنیا کے خزانوں کی کنجی دی گئی ہے، مجھے خوف نہیں ہے کہ میرے بعد تم شرک کرو گے، لیکن اس سے ڈرتا ہوں کہ دنیا میں مبتلا نہ ہو جاؤ اور اس کے لئے آپس میں کشت وخون نہ کرو، تو پھر اسی طرح ہلاک ہو جاؤ جس طرح تم سے پہلی قومیں ہلاک ہوئیں۔ راوی کا بیان ہے کہ یہ آخری دفعہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطبہ دیتے ہوئے سنا۔

غزوات میں گزر چکا ہے کہ حضرت زیدؓ بن حارثہ کو حدودِ شام کے عربوں نے شہید کر ڈالا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے اس کا قصاص لینا چاہتے تھے، آغازِ علالت سے ایک روز پہلے آپؐ نے اسامہ ابن زیدؓ کو مامور کیا کہ وہ فوج لے کر جائیں اور ان شریروں سے اپنے باپ کا انتقام لیں۔ (۱۸ یا ۱۹) صفر ۱۱ھ میں آدھی رات کو آپؐ

له صحیح بخاری کتاب الجنائز وصحیح مسلم باب اثبات الحوض دمه واقدی اور ابن اسحاق کا بیان ہے کہ اس غزوہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ کو بھی جانے کا حکم دیا تھا، لیکن یہ روایتیں بے سند ہیں، اس لئے علامہ ابن تیمیہ نے اس سے شدت کے ساتھ انکار کیا ہے، حضرت عمرؓ کے متعلق تو نہیں کہا جا سکتا لیکن حضرت ابوبکرؓ کو آپؐ نے ایام علالت میں امام نماز مقرر فرمایا اور یہ صحیح روایت سے ثابت ہے اس بنا پر اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ پہلے حضرت ابوبکرؓ کو جانے کا حکم ہوا تھا تو معلوم ہوتا ہے کہ بعد کو آپؐ نے مستثنیٰ کر لیا۔ سه آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائے مرض کے دن مدت علالت اور تاریخ وفات کی تعیین میں روایات مختلف ہیں، امر مختلف فیہ سے پہلے ان امور کو بتا دینا چاہئے جن پر تمام روایات کا اتفاق ہے اور جن پر گویا محدثین اور ارباب سیر کا اجماع عام ہے اور وہ یہ ہیں (۱) سال وفات ۱۱ھ ہے (۲) مہینہ ربیع الاول کا تھا (۳) یکم سے ۱۲ تک کوئی تاریخ تھی (۴) دوشنبہ کا دن تھا (صحیح بخاری ذکر وفات کتاب الجنائز) زیادہ تر روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کل ۱۳ دن بیمار رہے، اس بنا پر اگر یہ تحقیقی طور سے متعین ہو جائے کہ آپؐ نے کس تاریخ کو وفات پائی تو تاریخ آغاز مرض بھی متعین کی جا سکتی ہے، حضرت عائشہؓ . . بروایت صحیح ۱۸ روز (ایک دوشنبہ سے دوسرے دوشنبہ تک) بیمار رہے اور میں ہی وفات فرمائی اس لئے ایام علالت کی مدت ۸ روز یقینی ہے، عام روایات کی رو سے پانچ دن اور چاہئیں اور یہ قرائن سے بھی معلوم ہوتا ہے اس لئے ۱۳ دن مدت علالت صحیح ہے، علالت کے ۵ دن آپؐ نے دوسری ازواج کے حجروں میں بسر فرمائے۔ اس حساب سے علالت کا آغاز چہار شنبہ سے ہوتا ہے۔

تاریخ وفات کی تعیین میں راویوں کا اختلاف ہے کتب حدیث کا تمام تر دفتر چھان ڈالنے کے بعد بھی تاریخ وفات کی بابت کوئی روایت احادیث میں نہیں مل سکی۔ ارباب سیر کے ہاں تین روایتیں ہیں یکم ربیع الاول، دوم ربیع الاول اور ۱۲ ربیع الاول، ان تینوں روایتوں میں باہم ترجیح دینے کے لئے اصول روایت ودرایت دونوں سے کام لینا ہے اور روایت دوم ربیع الاول کی روایت ہشام بن محمد بن سائب کلبی اور ابو مخنف کے واسطے سے مروی ہے (طبری ص ۱۸۰۱) اس روایت کو گو اکثر قدیم مورخوں (مثلاً یعقوبی و مسعودی وغیرہ) نے قبول کیا ہے، لیکن محدثین کے نزدیک یہ دونوں مشہور دروغ گو اور غیر معتبر ہیں، یہ روایت واقدی سے بھی ابن سعد وطبری نے نقل کی ہے (جزء وفات) لیکن واقدی کی مشہور ترین روایت جس کو اس نے متعدد اشخاص سے نقل کیا ہے وہ ۱۲ ربیع الاول کی ہے، البتہ بیہقی نے دلائل میں سند صحیح سلیمان التیمی سے دوم ربیع الاول کی روایت نقل کی ہے (زرقانی بحوالہ ابن سید الناس، وفات) لیکن یکم ربیع الاول کی روایت ثقہ ترین ارباب سیر موسیٰ بن عقبہ سے اور مشہور محدث امام لیث مصری سے

جنت البقیع میں جو عام مسلمانوں کا قبرستان تھا تشریف لے گئے۔ وہاں سے واپس تشریف لاتے تو مزاج ناساز ہوا۔ یہ حضرت میمونہؓ کی باری کا دن تھا اور روز چہار شنبہ تھا۔ پانچ دن تک آپؐ اس حالت میں بھی ازراہ عدل وکرم باری باری ایک ایک بیوی کے حجرہ میں تشریف لے جاتے رہے، دوشنبہ کے دن امرض میں شدت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) مروی ہے (فتح الباری وفات) امام سہیلی نے روض الانف میں اسی روایت کو اقرب الی الحق لکھا ہے (جلد دوم وفات) اور سب سے پہلے امام مذکور ہی نے درایۃً اس نکتہ کو دریافت کیا کہ ۱۲ ربیع الاول کی روایت قطعاً ناقابل تسلیم ہے، کیونکہ دو باتیں یقینی طور پر ثابت ہیں، روز وفات دوشنبہ کا دن تھا (صحیح بخاری ذکر وفات وصحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ) اس سے تقریباً تین مہینے پہلے ذی الحجہ ۱۰ھ کی نویں تاریخ کو جمعہ کا دن تھا (صحاح قصہ حجۃ الوداع، صحیح بخاری تفسیر الیوم اکملت لکم دینکم) ذی الحجہ ۱۰ھ روز جمعہ سے ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ تک حساب لگاؤ۔ ذی الحجہ، محرم، صفر ان تینوں مہینوں کو خواہ ۲۹، ۲۹ خواہ ۳۰، ۳۰ خواہ بعض ۳۰ کسی حالت اور کسی شکل سے ۱۲ ربیع الاول کو دوشنبہ کا دن نہیں پڑ سکتا، اس لئے درایۃً بھی یہ تاریخ قطعاً غلط ہے۔ دوم ربیع الاول کو حساب سے اس وقت دوشنبہ پڑ سکتا ہے جب تینوں مہینے ۲۹ کے ہوں، جب دو پہلی صورتیں نہیں ہیں تو اب صرف تیسری صورت رہ گئی ہے جو کثیر الوقوع ہے یعنی یہ کہ دو مہینے ۲۹ کے اور ایک مہینہ تیس کا لیا جائے۔ اس حالت میں ۲۹ ربیع الاول کو دوشنبہ کا روز واقع ہو گا اور یہی ثقہ اشخاص کی روایت ہے۔ ذیل کے نقشہ سے معلوم ہو گا کہ ۹ ذی الحجہ کو جمعہ ہو تو اوائل ربیع الاول میں اس حساب سے دوشنبہ کس کس دن واقع ہو سکتا ہے۔

نمبر شمار	صورت مفروضہ	دوشنبہ	دوشنبہ	دوشنبہ
۱	ذی الحجہ، محرم اور صفر سب ۳۰ دن کے ہوں۔	۶	۱۳	
۲	ذی الحجہ، محرم اور صفر سب ۳۰ دن کے ہوں۔	۲	۱۹	۱۶
۳	ذی الحجہ، ۲۹ محرم ۲۹ اور صفر ۳۰ کا ہو۔	۱	۸	۱۵
۴	ذی الحجہ ۳۰ محرم ۲۹ اور صفر ۲۹ کا ہو۔	۱	۸	۱۵
۵	ذی الحجہ ۲۹ محرم ۳۰ اور صفر ۲۹ کا ہو۔	۱	۸	۱۵
۶	ذی الحجہ، ۳۰ محرم ۲۹ اور صفر ۳۰ کا ہو۔	۷	۱۴	
۷	ذی الحجہ، ۳۰ محرم ۳۰ اور صفر ۲۹ کا ہو۔	۷	۱۴	
۸	ذی الحجہ، ۲۹ کا اور محرم وصفر ۳۰ کے ہوں۔	۷	۱۴	

ان مفروضہ تاریخوں میں سے ۶۔۷۔۸۔۱۳۔۱۹۔۱۴۔۱۵ خارج از بحث ہیں کہ علاوہ اور وجوہ کے ان کی تائید میں کوئی روایت نہیں، رہ گئیں یکم اور دوم تاریخیں۔ دوم تاریخ صرف ایک صورت میں پڑ سکتی ہے جو خلاف اصول ہے، یکم تاریخ تین صورتوں میں واقع ہو سکتی ہے اور تینوں کثیر الوقوع ہیں اور روایت ثقات ان کی تائید میں ہیں اس لئے وفات نبوی کی صحیح تاریخ ہمارے نزدیک یکم ربیع الاول ۱۱ھ ہے اس روایت میں فقط رویت ہلال کا اعتبار کیا گیا ہے، جس پر اسلامی قمری مہینوں کی بنیاد ہے۔ اصول فلکی سے ممکن ہے کہ اس پر خدشات وارد ہو سکتے ہوں۔ کتب تفسیر میں آیت الیوم اکملت لکم دینکم، حضرت ابن عباسؓ سے

له ابن سعد وعبدالرزاق بسند صحیح وصحیح مسلم باب الامامۃ

ہوتی تو ازواجِ مطہرات سے اجازت لی کہ حضرت عائشہؓ کے گھر قیام فرمائیں، خلقِ عظیم کی بنا پر اجازت بھی صاف اور اعلانیہ نہیں طلب کی بلکہ پوچھا کہ کل میں کس کے گھر رہوں گا۔ دوسرا دن (دوشنبہ) حضرت عائشہؓ کے یہاں قیام فرمانے کا تھا، ازواجِ مطہرات نے مرضی سمجھ کر عرض کی کہ آپ جہاں چاہیں قیام فرمائیں، ضعف اس قدر ہو گیا تھا کہ چلا نہیں جاتا تھا حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ دونوں بازو تھام کر بمشکل حضرت عائشہؓ کے حجرے میں لائے۔

آمد و رفت کی قدرت جب تک رہی آپؐ مسجد میں نماز پڑھانے کی غرض سے تشریف لاتے رہے، سب سے آخری نماز جو آپ نے پڑھائی وہ مغربؒ کی نماز تھی، سر میں درد تھا، اس لئے سر میں رومال باندھ کر آپؐ تشریف لائے اور نماز ادا کی جس میں سورۂ والمرسلات عرفاً قرأت فرمائی، عشاء کا وقت آیا تو دریافت فرمایا کہ نماز ہو چکی؟ لوگوں نے عرض کی کہ سب کو حضورؐ کا انتظار ہے، لگن میں پانی بھروا کر غسل فرمایا، پھر اٹھنا چاہا کہ غش آ گیا،

افاقہ کے بعد پھر فرمایا کہ نماز ہو چکی؟ لوگوں نے پھر وہی پہلا جواب دیا۔ آپؐ نے پھر غسل فرمایا اور پھر جب اٹھنا چاہا تو غش آ گیا، افاقہ ہوا تو پھر دریافت فرمایا اور لوگوں نے وہی جواب دیا، تیسری دفعہ جسم مبارک پر پانی ڈالا پھر جب اٹھنے کا ارادہ کیا تو پھر غشی طاری ہو گئی، جب افاقہ ہوا تو ارشاد فرمایا کہ ابوبکر نماز پڑھائیں، حضرت عائشہؓ نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مروی ہے کہ اس آیت کے یوم نزول (۹ ذی الحجہ سنہ ۱۰ھ) سے روز وفات تک کے ۸۱ دن ہیں (دیکھو ابن جریر، ابن کثیر و بغوی وغیرہ) ہمارے حساب سے ۹ ذی الحجہ سنہ ۱۰ھ سے لے کر یکم ربیع الاول تک دو ۲۹ اور ایک مہینہ ۳۰ لے کر جو ہماری مفروضہ صورت ہے پورے ۸۱ دن ہوتے ہیں، ابونعیم نے بھی دلائل میں بسند یکم ربیع الاول تک تاریخ وفات نقل کی ہے، ص ۲۱۳۔ (ش)

[1] صحیح بخاری ذکر وفات، ابن سعد نے بروایات صحیحہ نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حضرت فاطمہ زہراؓ نے اجازت طلب کی تھی (ش) [2] یہ حدیث بخاری و مسلم و ابوداؤد و ترمذی اور نسائی باب القراۃ میں مذکور ہے، آئندہ حضرت عائشہؓ کی روایت آئے گی جس میں مذکور ہو گا کہ آخری نماز مسجد میں ظہر کی آپ نے پڑھائی، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ان دونوں میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ مغرب کا واقعہ اندرون حجرۂ نبوی کا واقعہ ہے جیسا کہ نسائی میں ہے (جلد ۲ صفحہ ۱۴۴) لیکن آگے چل کر حافظ موصوف کی نظر ترمذی کی روایت پر پڑی جس میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باہر نکل کر نماز پڑھائی، اس کی تاویل ان کو یہ کرنی پڑی کہ اس سے مقصود یہ ہے کہ خواب گاہ سے باہر آ کر (جلد ۸ صفحہ ۲۰۰) لیکن ہمارے نزدیک یہ تاویل صحیح نہیں کہ اول تو حجرۂ نبوی میں اتنی جگہ نہ تھی کہ کوئی بڑی جماعت ہو سکے، دوسرے یہ کہ خواب گاہ کے علاوہ حجرۂ نبوی میں اور جگہ کہاں تھی، علاوہ ازیں احادیث میں صلی بنا کے یہی معنی ہر جگہ آئے ہیں کہ تمام مسلمانوں کے امام بن کر نماز پڑھائی، گھر کی نماز پر یہ لفظ صادق نہیں آتا، اس لئے صحیح یہ ہے کہ نماز مسجد نبوی میں پڑھی گئی جیسا کہ عام روایت کا اشارہ ہے آخری نماز مغرب تھی یا ظہر اس کی تطبیق یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مسلسل امامت کا انقطاع مغرب کی نماز مذکور پر ہوا جیسا کہ آگے عشاء کی نماز کے ذکر میں آئے گا، ظہر کی نماز جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں آ کر ادا فرمائی وہ اتفاقی تھی، اصل میں امام پہلے سے حضرت ابوبکرؓ تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آ کر بعد کو شریک ہو گئے تھے۔ یہ نماز مسجد میں آپ کی آخری نماز تھی، بعض میں یہ سے مذکور ہے کہ آخری نماز صبح کی تھی یہ درحقیقت ان کا اپنا واقعہ ہے یعنی آخری بار یہی موقع ملا۔ (ش)

[3] صحیح بخاری و مسلم میں بروایت حضرت عائشہؓ یہ تخصیص ہے، دیکھو کتاب الصلوٰۃ اور وفات۔

معذرت کی کہ یا رسول اللہ! ابوبکر نہایت رقیق القلب ہیں، آپ کی جگہ ان سے کھڑا نہ ہوا جائے گا، آپ نے پھر یہی حکم دیا کہ ابوبکر نماز پڑھائیں، چنانچہ کئی دن تک حضرت ابوبکرؓ نے نماز پڑھائی۔

وفات سے چار دن پہلے (جمعرات) کو آپ نے فرمایا کہ دوات کاغذ لاؤ، میں تمہارے لئے ایک تحریر لکھ دوں جس کے بعد تم گمراہ نہ ہو گے، بعض صحابہ نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مرض کی شدت ہے (اغلبہ الوجع) اور تمہارے پاس قرآن مجید موجود ہے جو ہمارے لئے کافی ہے۔ اس پر حاضرین میں اختلاف پیدا ہوا، بعض کہتے تھے کہ تعمیل ارشاد کی جائے، بعض کچھ اور کہتے تھے۔ اختلاف اور شور و غل زیادہ ہوا تو بعض نے کہا اھجر استفھموہ خود آپ سے دریافت کر لو، لوگ جب پوچھنے لگے تو آپ نے فرمایا، مجھے چھوڑ دو میں جس مقام میں ہوں وہ اس سے بہتر ہے جس کی طرف تم مجھے بلاتے ہو۔

[1] بخاری باب الامامۃ ج ا ص ۹۴) میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ تین دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز نہیں پڑھائی اور حضرت ابوبکرؓ نے آپ کی قائم مقامی کا آغاز شب جمعہ کی نماز عشاء سے کیا ہے (بخاری و مسلم کتاب الصلوٰۃ) اور اختتام دوشنبہ کی صبح کی نماز پر ہوا (بخاری باب رجع القہقری فی الصلوٰۃ ص ۱۶۰) کل یہ تین دن میں ۱۷ وقت کی نمازیں ہوئیں، ابن سعد نے واقدی سے بعینہٖ یہی روایتیں کی ہیں ایک میں ہے کہ ۳ دن امامت کی دوسری میں ہے کہ ۱۷ وقت کی۔ (ش)

[2] یہ روایت صحیح بخاری موقع وفات کی ہے، صحیح بخاری میں یہ حدیث مختلف ابواب میں مذکور ہے اور ہر جگہ الفاظ میں کچھ نہ کچھ اختلاف ہے صحیح مسلم کتاب الوصیۃ میں یہ روایتیں یکجا ہیں جن صحابی نے قلم دوات لانے میں گفتگو کی، بخاری میں ان کا نام نہیں، لیکن حدیث کی اور کتابوں میں (مثلاً صحیح مسلم) بہ تصریح حضرت عمرؓ کا نام ہے، صحیح مسلم میں (راوی کے) یہ الفاظ ہیں۔

قد غلب علیه الوجع وعندکم القرآن حسبنا کتاب الله۔ — آپ کو مرض کی شدت ہے، ہمارے پاس قرآن موجود ہے خدا کی کتاب ہمارے لئے کافی ہے۔

(صحیح مسلم کی دوسری روایتوں کے یہ الفاظ ہیں۔

(۱) فقالوا ان رسول الله صلی الله علیه وسلم یهجر — تو لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بخار سی (ہجر) کی باتیں کرتے ہیں

(۲) فقالوا اهجر استفهموه۔ — (تو لوگوں نے کہا کیا آپ بخار کی کی باتیں کرتے ہیں، آپ سے خود پوچھو تو)

اس بنا پر یہ روایت شیعہ و سُنی کا بڑا معرکہ آرا میدان بن گئی ہے، شیعہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کی خلافت کا فرمان لکھوانا چاہتے تھے سنی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو واقعی تکلیف تھی اور یہ معلوم تھا کہ شریعت کے متعلق کوئی نکتہ باقی نہیں رہا، خود قرآن مجید میں الیوم اکملت لکم نازل ہو چکی تھی اس لئے حضرت عمرؓ نے آپ کو تکلیف دینا مناسب نہیں سمجھا، اگر کوئی ضروری حکم ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے روکنے سے کیونکر رک سکتے تھے، اس واقعہ کے بعد چار دن (آپ زندہ رہے) اس وقت بھی بعد کو لکھوا دیا ہوتا اور یہ کیونکر معلوم ہوا کہ آپ کیا لکھوانا چاہتے تھے، بخاری میں ہے کہ آپ عبداللہ بن ابی بکر کو بلا کر حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا فرمان لکھوانا چاہتے تھے، پھر آپ نے ضروری نہیں سمجھا اور فرمایا کہ خود خدا اور اہل اسلام ابوبکر کے سوا کسی اور کو پسند نہ کریں گے، اس اختلاف کے بعد آپ نے لوگوں کو زبانی تین وصیتیں فرمائیں، جو ضروری بات آپ کاغذ پر لکھوانا چاہتے تھے ممکن ہے وہ یہی ہوں، یا اگر وہ اس کے علاوہ بھی ہوں تو آپ اس کو ان عام وصیتوں کے ساتھ زبانی بھی فرما سکتے تھے، اس کے بعد مجمع عام میں جو خطبہ دیا اس میں اس کا اظہار

(اس کے بعد آپؐ نے تین) وصیتیں فرمائیں۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ کوئی مشرک عرب میں رہنے نہ پائے دوسری یہ کہ سفراء کا اسی طرح احترام کیا جائے جس طرح آپؐ کے زمانہ میں دستور تھا، تیسری وصیت راوی کو یاد نہیں رہی[1]

اسی دن ظہر کی نماز کے وقت آپؐ کی طبیعت کچھ سکون پذیر ہوئی۔ آپؐ نے حکم دیا کہ پانی کی سات مشکیں آپؐ پر ڈالی جائیں غسل فرما چکے تو حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ تھام کر مسجد میں لائے، جماعت کھڑی ہو چکی تھی اور حضرت ابوبکرؓ نماز پڑھا رہے تھے۔ آہٹ پا کر حضرت ابوبکرؓ پیچھے ہٹے، آپؐ نے اشارہ سے روکا اور ان کے پہلو میں بیٹھ کر نماز پڑھائی آپؐ کو دیکھ کر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کو دیکھ کر اور لوگ ارکان ادا کرتے جاتے تھے۔

(نماز کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک خطبہ دیا، جو آپؐ کی زندگی کا سب سے آخری خطبہ تھا، آپؐ نے فرمایا۔

"خدا نے اپنے ایک بندہ کو اختیار عطا فرمایا ہے کہ خواہ دنیا کی نعمتوں کو قبول کرے یا خدا کے پاس (آخرت) میں جو کچھ ہے اس کو قبول کرے، لیکن اس نے خدا ہی کے پاس کی چیزیں قبول کیں۔ یہ سُن کر حضرت ابوبکرؓ رو پڑے۔ لوگوں نے اُن کی طرف تعجب سے دیکھا کہ آپؐ تو ایک شخص کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ یہ رونے کی کون سی بات ہے، لیکن رازدارِ نبوت سمجھ چکا تھا کہ وہ بندہ خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، آپؐ نے اپنی تقریر کا سلسلہ آگے بڑھایا اور فرمایا۔ سب سے زیادہ میں جس کی دولت اور صحبت کا ممنون ہوں ابوبکرؓ ہیں۔ اگر میں دنیا میں کسی کو اپنی امت میں سے اپنا دوست بنا سکتا تو ابوبکر کو بناتا، لیکن اسلام کا رشتہ دوستی کے لئے کافی ہے، مسجد کے رُخ کوئی دریچہ ابوبکر کے دریچہ کے سوا باقی نہ رکھا جائے۔ ہاں تم سے پہلی قوموں نے اپنے پیغمبروں اور بزرگوں کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا ہے، دیکھو تم ایسا نہ کرنا میں منع کر جاتا ہوں[2]۔"

زمانۂ علالت میں انصار آپؐ کی عنایات اور مہربانیوں کو یاد کر کے روتے تھے۔ ایک دفعہ اسی حالت میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عباسؓ کا گزر ہوا، انہوں نے انصار کو روتے دیکھا تو وجہ دریافت کی، انہوں نے بیان کیا کہ حضورؐ کی صحبتیں یاد آتی ہیں۔ اُن میں سے ایک صاحب نے جا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ واقعہ بیان کیا۔ آج اس کی تلافی کا موقعہ تھا۔ اس لئے اس کے بعد آپؐ نے انصار کی نسبت لوگوں کی طرف خطاب کر کے فرمایا۔ یایھا الناس! میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) فرماتے تھے "س" مجھ کو احتیاط کرنی چاہیئے کہ کتاب تاریخ کی حیثیت سے نکل کر علم کلام کے دائرہ میں نہ آ جائے تاہم جو میری ذاتی تحقیق ہے، میں الفاروق میں لکھ چکا ہوں۔

[1] صحیح بخاری ذکر وفات و صحیح مسلم کتاب الوصیۃ [2] روایتوں میں بالتصریح یہ مذکور نہیں ہے کہ کس دن کے ظہر کا واقعہ ہے لیکن صحیح مسلم باب النہی عن بناء المساجد علی القبور میں حضرت جندبؓ کی روایت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی شان میں جو الفاظ آپؐ نے فرمائے تھے جن کا بیان آگے آتا ہے، وہ وفات سے پانچ روز پیشتر فرمائے تھے اور چونکہ مرض الموت کا خطبہ اسی نماز ظہر کے بعد آپ نے فرمایا تھا۔ جیسا کہ صحیح بخاری و صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے اس لئے یہ وفات سے پانچ روز پہلے جمعرات کا واقعہ تھا۔ حافظ ابن حجر نے بھی فتح الباری میں یہی فیصلہ کیا ہے۔ "س" [3] صحیح بخاری و مسلم مناقب ابی بکرؓ، اخیر ٹکڑا صحیح مسلم باب النہی عن بناء المساجد علی القبور میں ہے۔

انصار کے معاملہ میں تم کو وصیت کرتا ہوں، عام مسلمان بڑھتے جائیں گے لیکن انصار اس طرح کم ہو کر رہ جائیں گے جیسے کھانے میں نمک، وہ اپنی طرف سے اپنا فرض ادا کر چکے اب تمہیں ان کا فرض ادا کرنا ہے، وہ میرے جسم میں بمنزلہ معدہ کے ہیں جو تمہارے نفع و نقصان کا متولی ہو (یعنی جو خلیفہ ہو)، اس کو چاہیئے کہ ان میں جو نیکوکار ہوں ان کو قبول کرے اور جن سے خطا ہوئی ہے ان کو معاف کرے[1]۔

اوپر گزر چکا ہے کہ رومیوں کی طرف جس فوج کو بھیجنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تجویز کیا تھا اس کی سرداری اسامہؓ بن زید کو تفویض فرمائی تھی۔ اس پر لوگوں نے (ابن سعد نے تصریح کی ہے کہ وہ منافقین تھے) شکایت کی کہ بڑے بوڑھوں کے ہوتے نوجوان کو یہ منصب کیوں عطا ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلہ کی نسبت ارشاد فرمایا۔

"اگر اسامہ کی سرداری پر تم کو اعتراض ہے تو اس کے باپ زید کی سرداری پر بھی تم معترض تھے، خدا کی قسم! وہ اس منصب کا مستحق تھا اور وہ مجھے سب سے زیادہ محبوب تھا اور اب اس کے بعد یہ سب سے زیادہ محبوب ہے[2]"

اسلام اور دیگر مذاہب میں ایک نہایت دقیق فرق یہ ہے کہ اسلام شریعت کے تمام احکام کا واضع اور حاکم براہِ راست خدائے پاک کو قرار دیتا ہے۔ پیغمبر کا صرف اسی قدر فرض ہے کہ احکام الٰہی کو اپنے قول و عمل کے ذریعہ سے بندوں تک پہنچا دے، چونکہ دوسرے مذاہب میں یہ غلط فہمی شرک و کفر تک منجر ہو چکی تھی اور اس کے نتائج پیش نظر تھے، اس لئے ارشاد فرمایا۔

حرام و حلال کی نسبت میری طرف نہ کی جائے، میں نے وہی حلال کی ہے جو خدا نے اپنی کتاب میں حلال کی ہے اور وہی چیز حرام کی ہے جو خدا نے حرام کی ہے۔

انسان کی جزا و سزا کی بنیاد خود اس کے ذاتی عمل پر ہے، آپؐ نے فرمایا۔

"اے پیغمبرِ خدا کی بیٹی فاطمہ! اور اے پیغمبرِ خدا کی پھوپھی صفیہ! خدا کے ہاں کے لئے کچھ کر لو، میں تمہیں خدا سے نہیں بچا سکتا[3]۔"

خطبہ سے فارغ ہو کر آپؐ حجرۂ عائشہ میں واپس تشریف لائے۔

آپؐ کو حضرت فاطمہ زہراؓ سے بے حد محبت تھی (اثنائے علالت میں) ان کو بلا بھیجا تشریف لائیں تو اُن سے کچھ کان میں باتیں کیں، وہ رونے لگیں، پھر بلا کر کچھ کان میں کہا تو ہنس پڑیں، حضرت عائشہؓ نے دریافت کیا تو کہا پہلی دفعہ آپؐ نے فرمایا کہ میں اسی مرض میں انتقال کروں گا، جب میں رونے لگی تو فرمایا کہ میرے خاندان میں سب سے

[1] صحیح بخاری مناقب انصار [2] صحیح بخاری بعث اسامہ و مناقب زید بن حارثہ [3] یہ اور اس کے اوپر کی حدیث مسند امام شافعی باب استقبال القبلہ کتاب الام امام شافعی اور ابن سعد جز الوفات میں بسند حسن مروی ہے، لیکن ان روایتوں میں مذکور ہے کہ صبح کی نماز کے بعد آپ نے یہ فرمایا، لیکن بخاری کے حوالہ سے گزر چکا ہے کہ آپ نے ظہر کی نماز میں شرکت فرمائی تھی اور اس کے بعد خطبہ دیا تھا دوسری غلطی مسند اور ابن سعد کی روایتوں میں یہ ہے کہ وہ دوشنبہ کی صبح یعنی روز وفات واقعہ اس کو بیان کرتے ہیں، حالانکہ بروایت صحیح ثابت ہے کہ دوشنبہ کی صبح کو آپ نے صرف پردہ اٹھا کر جھانکا تھا اور نہ باہر تشریف لائے، اور نہ نماز میں شرکت فرمائی۔ "س"

پہلے تم ہی مجھ سے آکر ملوگی[1] تو ہنسنے لگی۔

یہود و نصاریٰ نے انبیاء کے مزارات اور یادگاروں کی تعظیم میں جو افراط کی تھی وہ بُت پرستی کی حد تک پہنچ گئی تھی، اسلام کا فرضِ اولین بت پرستی کی رگ و ریشہ کا استیصال کرنا تھا، اس لئے حالتِ مرض میں جو چیز سب سے زیادہ آپؐ کے پیشِ نظر تھی یہی تھی۔ اتفاق سے بعض ازواجِ مطہراتؓ نے جو حبشہ ہو آئی تھیں اسی حالت میں وہاں کے عیسائی معبدوں[2] کا اور اُن کے مجسموں اور تصویروں کا تذکرہ کیا۔ آپؐ نے فرمایا ان لوگوں میں جب کوئی نیک آدمی مرجاتا ہے[3] تو اس کے مقبرہ کو عبادت گاہ بنالیتے ہیں اور اس کا بُت بنا کر اس میں کھڑا کرتے ہیں، قیامت کے روز اللہ عزوجل کی نگاہ میں یہ لوگ بدترین مخلوق ہوں گے[4]۔ عین کرب کی شدت میں جب کہ چادر کبھی منہ پر ڈال لیتے تھے اور کبھی گرمی سے گھبرا کر اُلٹ دیتے تھے حضرت عائشہؓ نے زبانِ مبارک سے یہ الفاظ سُنے۔

لعنۃ اللہ علی الیھود والنصاریٰ اتخذوا قبور انبیائھم مساجد[5]۔ — یہود و نصاریٰ پر خدا کی لعنت ہو انھوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو عبادت گاہ بنالیا۔

(اسی کرب اور بے چینی میں یاد آیا کہ حضرت عائشہؓ کے پاس کچھ اشرفیاں رکھوائی تھیں، دریافت فرمایا کہ عائشہؓ! وہ اشرفیاں کہاں ہیں؟ محمد خدا سے بدگمان ہو کر ملے گا؟ جاؤ اُن کو خدا کی راہ میں خیرات کردو[6])

(وفات سے ایک دن پہلے اتوار کو) لوگوں نے دوا پلانی چاہی، چونکہ گوارا نہ تھی، آپؐ نے انکار فرمایا، اسی حالت میں غشی طاری ہوگئی، لوگوں نے منہ کھول کر دوا پلادی۔ افاقہ کے بعد آپ کو احساس ہوا تو فرمایا کہ سب کو دوا پلائی جائے، معلوم ہوا جن لوگوں نے زبردستی دوا پلائی تھی ان میں حضرت عباسؓ شامل نہ تھے، اس لئے وہ اس حکم[7] سے مستثنیٰ رہے محدثین اس واقعہ کو لکھ کر لکھتے ہیں کہ یہ بشریت کا اقتضا تھا، یعنی جس طرح بیماروں میں نازک مزاجی آجاتی ہے، آپؐ نے بھی اسی طرح یہ حکم دیا تھا، لیکن ہمارے نزدیک تو یہ تنگ مزاجی نہیں بلکہ لطفِ طبع تھا۔

مرض میں اشتداد اور تخفیف ہوتی رہتی تھی، جس دن وفات ہوئی (یعنی دوشنبہ کے روز) بظاہر طبیعت کو سکون تھا، حجرۂ مبارک مسجد سے ملا ہوا تھا، آپؐ نے (صبح کے وقت) پردہ اٹھا کر دیکھا تو لوگ (فجر کی) نماز میں مشغول تھے، دیکھ کر مسرت سے ہنس پڑے، لوگوں نے آہٹ پاکر خیال کیا کہ آپ باہر آنا چاہتے ہیں، فرطِ مسرت سے تمام لوگ بے قابو ہوگئے اور قریب تھا کہ نمازیں ٹوٹ جائیں، حضرت ابوبکرؓ نے جو امام تھے چاہا کہ پیچھے ہٹ جائیں آپؐ نے اشارہ سے روکا اور حجرۂ شریف میں داخل ہوکر پردے[8] ڈال دیئے (صحیح مسلم میں ہے کہ اس قدر ضعف تھا کہ آپؐ پردے بھی اچھی طرح نہ ڈال سکے[9]) یہ سب سے آخری موقع تھا کہ صحابہ نے جمالِ اقدس کی زیارت کی حضرت

۱ صحیح بخاری ذکر وفات ۲ کوئی رومن کیتھولک گرجا ہوگا جس میں حضرت عیسیٰؑ، حضرت مریمؑ اور ولیوں اور شہیدوں کے مجسمے اور تصویریں ہوتی ہیں ۳ جن کو عیسائی سینٹ کہتے ہیں ۴ صحیح بخاری وصحیح مسلم باب النہی عن بناء المساجد علی القبور ۵ صحیح بخاری ذکر وفات وصحیح مسلم باب مذکور سابق ۶ مسند ابن حنبل ج ۶ ص ۴۹ وابن سعد جزء الوفات بروایت متعددہ ۷ ابن سعد وفات ۸ صحیح بخاری ذکر وفات وصحیح مسلم (التداوی باللدود) ۹ صحیح بخاری ذکر وفات وکتب صحاح کتاب الصلوٰۃ ۱۰ صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ ص ۱۶۷۔

انسؓ بن مالک کہتے ہیں کہ آپؐ کے چہرہ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ مصحف کا کوئی ورق ہے[1] یعنی سپید ہوگیا تھا،

دن جیسے جیسے چڑھتا جاتا تھا آپؐ پر بار بار غشی طاری ہوتی تھی اور پھر افاقہ ہو جاتا تھا۔ حضرت فاطمہ زہراؓ یہ دیکھ کر بولیں "واکرب اباہ" ہائے میرے باپ کی بے چینی! آپؐ نے فرمایا۔ تمہارا باپ آج کے بعد بے چین نہ ہو گا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپؐ جب تندرست تھے تو فرمایا کرتے تھے کہ پیغمبروں کو اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ خواہ موت کو قبول کریں یا حیاتِ دنیا کو ترجیح دیں۔ اس حالت میں اکثر آپؐ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوتے رہے۔

مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ۔ — ان لوگوں کے ساتھ جن پر خدا نے انعام کیا۔

اور کبھی یہ فرماتے۔

اَللّٰھُمَّ فِی الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی۔ — خداوندا! بڑے رفیق میں۔

وہ سمجھ گئیں کہ اب صرف رفاقتِ الٰہی مطلوب ہے۔

وفات سے ذرا پہلے حضرت ابوبکرؓ کے صاحبزادے عبدالرحمٰن خدمتِ اقدس میں آئے۔ آپؐ حضرت عائشہؓ کے سینہ پر سر ٹیک کر لیٹے تھے، عبدالرحمٰن کے ہاتھ میں مسواک تھی، مسواک کی طرف نظر جما کر دیکھا، حضرت عائشہؓ سمجھیں کہ آپ مسواک کرنا چاہتے ہیں۔ عبدالرحمٰن سے مسواک لے کر دانتوں سے نرم کی اور خدمتِ اقدس میں پیش کی، آپؐ نے بالکل تندرستوں کی طرح مسواک کی۔ آپؐ کی وفات کا وقت قریب آرہا تھا[2] سہ پہر تھی، سینہ میں سانس کی گھرگھراہٹ محسوس ہوتی تھی، اتنے میں لبِ مبارک ہلے تو لوگوں نے یہ الفاظ سُنے[3]۔

الصلوٰۃ وما ملکت ایمانکم۔ — نماز اور غلام

پاس پانی کی لگن تھی۔ اس میں بار بار ہاتھ ڈالتے اور چہرہ پر ملتے (چادر کبھی منہ پر ڈال لیتے اور کبھی ہٹا دیتے تھے، اتنے میں ہاتھ اٹھا کر (انگلی سے) اشارہ کیا اور تین دفعہ فرمایا۔

بل الرفیق الاعلٰی۔ — اب کوئی نہیں بلکہ وہ بڑا رفیق درکار ہے۔

یہی کہتے کہتے ہاتھ لٹک آئے، آنکھیں پھٹ کر چھت سے لگ گئیں اور روحِ پاک عالمِ قدس میں پہنچ گئی۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ صَلٰوۃً کَثِیْرًا۔

۱ صحیح مسلم باب الصلوٰۃ، حضرت انسؓ بن مالک کی روایت میں جو صحیح مسلم (کتاب الصلوٰۃ ص ۱۶۷) میں ہے، بیان ہے کہ تین دن کے بعد آپؐ اس وقت صبح کی نماز کے وقت برآمد ہوئے تھے، لیکن جماعت میں شریک نہ ہوسکے اور واپس گئے۔ امام شافعی نے کتاب الام میں اور ابن سعد نے جزء الوفات میں ابن ابی سبرہ سے روایت کی ہے کہ آپؐ اس نماز میں شریک جماعت ہوئے لیکن یہ درحقیقت راوی کا سہو ہے، صحیح بخاری ومسلم وغیرہ میں بتصریح مذکور ہے کہ آپؐ شریک جماعت نہ ہوسکے اور واپس گئے راوی کو گزشتہ نماز ظہر کا التباس ہوا (تین دن کے بعد سے مراد جمعرات کے روز جس دن آپؐ نے خطبہ دیا تھا اس کے بعد سے جمعہ سنیچر اور اتوار کے دن ہیں) ۲ ابن اسحاق نے سیرت میں لکھا ہے کہ دوپہر کو وفات ہوئی لیکن حضرت انسؓ بن مالک سے بخاری اور مسلم میں روایت ہے کہ آخر یوم یعنی دوشنبہ کے آخر وقت وفات پائی۔ حافظ ابن حجر نے دو روایتوں میں اسی طرح تطبیق دی ہے کہ دوپہر ڈھل چکی تھی اور سہ پہر کا وقت تھا ۳ ادب المفرد امام بخاری ص ۴۲ مصر سنن ابن ماجہ کتاب الوصایا اور ابن سعد جزء الوفات بسند صحیح۔

تجہیز و تکفین

تجہیز و تکفین کا کام دوسرے دن سہ شنبہ ۱۳ ربیع الاول کو شروع ہوا، اس تاخیر کے متعدد اسباب تھے (۱) عقیدت مندوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ حضورؐ نے اس دنیا کو الوداع کہا، چنانچہ حضرت عمرؓ نے تلوار کھینچ لی کہ جو یہ کہے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی اس کا سر اڑا دوں گا۔

لیکن حضرت ابوبکرؓ آئے اور انہوں نے تمام صحابہ کے سامنے خطبہ دیا کہ حضورؐ کا اس جہان سے تشریف لے جانا یقینی تھا اور قرآن مجید کی آیتیں پڑھ کر سنائیں، تو لوگوں کی آنکھیں کھلیں اور اس ناگزیر واقعہ کا یقین آیا۔

(۲) اس کے بعد اتنا وقت نہیں رہا تھا کہ غروب آفتاب سے پہلے تجہیز و تکفین سے فراغت ہو سکے۔

(۳) قبر کنی کا کام غسل و کفن کے بعد شروع ہوا، اس لئے دیر تک انتظار کرنا پڑا۔

(۴) جس حجرہ میں آپؐ نے وفات پائی تھی وہیں لوگ علی الترتیب تھوڑے تھوڑے کر کے جاتے اور نماز جنازہ ادا کرتے تھے اس لئے بھی بڑی دیر لگی اور سہ شنبہ کا دن گزر کر رات کو فراغت ملی۔[1]

تجہیز و تکفین کی خدمت خاص اعزہ و اقارب نے انجام دی، فضل بن عباسؓ اور اسامہ بن زیدؓ نے پردہ کیا اور حضرت علیؓ نے غسل دیا حضرت عباسؓ بھی موقع پر موجود تھے اور بعض روایتوں میں ہے کہ ان ہی نے پردہ بھی کیا تھا چونکہ اس شرف میں ہر شخص شریک ہونا چاہتا تھا، اس لئے حضرت علیؓ نے اندر سے کواڑ بند کر لئے تھے، انصار نے دروازہ پر آواز دی کہ خدا کے لئے ہمارے حقوق کا بھی خیال رکھئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گزاری میں ہمارا بھی حصہ ہے، حضرت ابوبکرؓ نے جیسا کہ واقدی کا بیان ہے، فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں کسی کا حق نہیں ہے اس لئے اگر سب کو اجازت دی گئی تو کام رہ جائے گا، لیکن انصار کے اصرار پر، حضرت علیؓ نے اوس ابن خولی انصاری کو جو اصحاب بدر میں تھے اندر بلا لیا، وہ پانی کا گھڑا بھر بھر کر لاتے تھے حضرت علیؓ نے جسم مبارک کو سینے سے لگا رکھا تھا حضرت عباسؓ اور اُن کے دونوں صاحبزادے قثم اور فضل جسم مبارک کی کروٹیں بدلتے تھے، اور اسامہ بن زیدؓ اوپر سے پانی ڈالتے تھے۔[2]

کفن کے لئے پہلے جو کپڑا انتخاب کیا گیا تھا، وہ حضرت ابوبکرؓ کے صاحبزادے عبداللہ کی یمن کی بنی ہوئی ایک چادر تھی لیکن بعد کو اتار لی گئی،[3] اور تین سوتی سفید کپڑے جو سحول کے بنے ہوئے تھے کفن میں دیئے گئے ان میں قمیص اور عمامہ نہ تھا۔

غسل و کفن کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ آپ کو دفن کہاں کیا جائے؟ حضرت ابوبکرؓ نے کہا نبی جس مقام پر وفات پاتا ہے، وہیں دفن بھی ہوتا ہے، چنانچہ نعش مبارک اٹھا کر اور بستر الٹ کر حجرۂ عائشہؓ میں اسی مقام پر قبر کھودنا تجویز ہوا، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ آپ کو کسی میدان میں اس لئے دفن نہیں کیا گیا کہ آخری لمحوں میں آپ کو یہ خیال تھا کہ لوگ فرط عقیدت سے میری قبر کو بھی عبادت گاہ نہ بنا لیں، میدان میں اس کی دار و گیر مشکل تھی[4]، اس لئے حجرہ کے اندر دفن کیا گیا)

مدینہ میں دو صاحب قبر کھودنے میں ماہر تھے، حضرت ابو عبیدہؓ جراح اور ابو طلحہؓ، حضرت ابو عبیدہؓ اہل مکہ کے دستور کے مطابق صندوقی قبر کھودتے تھے اور ابو طلحہؓ مدینہ کے رواج کے مطابق لحدی، لوگوں میں اختلاف پیش آیا کہ کس قسم کی قبر کھودی جائے، حضرت عمرؓ نے کہا اختلاف مناسب نہیں، دونوں صاحبوں کے پاس آدمی بھیجا جائے جو پہلے آجائے، لوگوں نے اس رائے کو پسند کیا، حضرت عباسؓ نے دونوں صاحبوں کے پاس آدمی بھیجے، اتفاق یہ کہ حضرت ابو عبیدہؓ گھر پر موجود نہ تھے، ابو طلحہؓ آئے اور ان ہی نے مدینہ کے رواج کے مطابق قبر کھودی جو لحدی یعنی بغلی تھی، چونکہ زمین نم تھی اس لئے جس بستر پر آپؐ نے وفات پائی تھی وہ قبر میں بچھا دیا گیا۔

جنازہ تیار ہو گیا تو لوگ نماز کے لئے ٹوٹے (جنازہ حجرے کے اندر تھا، باری باری سے لوگ تھوڑے تھوڑے کر کے جاتے تھے) پہلے مردوں نے، پھر عورتوں نے اور پھر بچوں نے نماز پڑھی لیکن کوئی امام نہ تھا[5]

جسم مبارک کو حضرت علیؓ، فضل بن عباسؓ (اسامہ بن زیدؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف) نے قبر میں اتارا۔[6]

*

---

[1] یہ تمام واقعات صحیح بخاری ذکر وفات کے مختلف ابواب میں مذکور ہیں [2] ابن سعد وغیرہ کی بعض روایتوں میں ہے کہ چہار شنبہ کو تدفین ہوئی لیکن یہ تمام تر کذب اور جھوٹ ہے، خود ابن سعد میں صحیح روایتیں یہ ہیں کہ سہ شنبہ کو تدفین ہوئی، البتہ چہار شنبہ کی شام شروع ہو گئی تھی، ابن ماجہ کی روایت ہے (کتاب الجنائز) فلما فرغوا من جهازه يوم الثلاثاء جب سہ شنبہ کے دن تجہیز و تکفین سے فرصت ہوئی [3] طبقات ابن سعد ص ۶۲، ۶۳، جزء الوفات طبری (مختصرا) ابو داؤد کتاب الجنائز میں بھی ان صاحبوں کے نام ہیں، نیز ابن ماجہ کتاب الجنائز (۴) صحیح مسلم ص ۲۰ کتاب الجنائز (۵) صحیح بخاری و مسلم و ابو داؤد کتاب الجنائز۔

[1] ابن سعد جزء الوفات بروایات صحیحہ و ابن ماجہ کتاب الجنائز ذکر وفات نبوی [2] صحیح بخاری کتاب الجنائز باب الوفات [3] ابن ماجہ کتاب الجنائز [4] ابن سعد بروایت صحیح جزء الوفات (۵) ابو داؤد کتاب الجنائز، ابن ماجہ اور ابن سعد میں اسامہ بن زیدؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے بجائے قثم بن عباس اور شقران (غلام خاص) کے نام ہیں، ارباب نظر جانتے ہیں کہ ان دو روایتوں میں ترجیح کس کو ہو سکتی ہے!

متروکات

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب انتقال فرمایا تو اپنے مقبوضات و جائیداد میں سے کیا کیا چیزیں ترکہ میں چھوڑیں؟ اس سوال کا جواب تو یہ ہے کہ آپ خود اپنی زندگی میں اپنے پاس کیا رکھتے تھے جو مرنے کے بعد چھوڑ جاتے اور اگر کچھ تھا بھی تو اس کے متعلق عام اعلان فرما چکے تھے۔

لا نورث ما ترکنا صدقۃ۔	ہم (انبیاء) کا کوئی وارث نہیں ہوتا جو چھوڑا عام مسلمانوں کا حق ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے وارث اشرفی بانٹ کر نہیں پائیں گے (یعنی نہ ہوگی نہ پائیں گے) چنانچہ یاد ہوگا کہ وفات کے وقت چند دینار حضرت عائشہؓ کے پاس امانت تھے، آپؐ نے اسی وقت نکلوا کر خیرات کرا دیئے۔

عمرؓو بن حویرث سے جو ام المومنین جویریہؓ کے بھائی تھے، بخاری میں روایت ہے۔

ما ترک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عند موتہ درھما ولا دینارا ولا عبدا ولا امۃ ولا شیئا الا بغلتہ البیضاء وسلاحہ وارضا جعلھا صدقۃ	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مرتے وقت کچھ نہ چھوڑا، نہ درہم، نہ دینار، نہ غلام، نہ لونڈی اور نہ کچھ اور صرف اپنا سفید خچر اور ہتھیار اور کچھ زمین جو عام مسلمانوں پر صدقہ کر گئے۔[1]

ابوداؤد میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے۔

ما ترک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دینارا ولا درھما ولا بعیرا ولا شاۃ۔	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ دینار چھوڑا، نہ درہم، نہ اونٹ نہ بکری۔

بہر حال متروکات میں اگر تھیں تو یہی تین چیزیں تھیں، کچھ زمین، سواری کے جانور اور ہتھیار۔

زمین حضرت عمرؓو بن حویرث نے جس زمین کا ذکر کیا ہے وہ مدینہ، خیبر اور فدک کے چند باغ تھے، مدینہ کی جائیداد سے، بنو نضیر کی جائیداد مراد ہے یا مخیریق نام ایک یہودی نے ۳ھ میں (غزوۂ احد کے موقع پر) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چند باغ وصیۃً ہبہ کئے تھے، وہ مراد ہیں، لیکن صحیح روایتوں سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ باغ اسی وقت مستحقین کو تقسیم کر دیئے تھے۔[2]

فدک اور خیبر کی نسبت ابتداء ہی سے شیعہ اور اہل سنت میں اختلاف ہے، شیعہ کہتے ہیں کہ یہ آپ کی ذاتی جائیداد تھی اور وراثت کے طور پر اہل بیت میں تقسیم ہونی چاہیئے تھی، اہل سنت کہتے ہیں کہ یہ بطور والیت اسلامی

[1] یہ فقرہ تمام حدیث کی کتابوں میں ہے، بخاری میں متعدد مقامات میں ہے، کتاب الوصایا، کتاب الفرائض، باب فرض الخمس [2] صحیح بخاری کتاب الوصایا [3] بخاری باب فرض الخمس میں ہے وصدقۃ بالمدینۃ یہ ان ہی باغوں کے متعلق ہے، تفصیل کیلئے فتح الباری ۶ صفحہ ۱۴۰ دیکھو نیز صحیح بخاری میں کتاب المغازی ذکر خیبر

آپ کے قبضہ میں تھی اور ذاتی ہو بھی تو آپ نے خود فرما دیا تھا کہ ہمارا جو ترکہ ہو، وہ صدقہ ہے۔

اصل یہ ہے کہ یہ اختلاف خود صحابہ کے وقت میں پیدا ہو چکا تھا، حضرت عباسؓ (آپ کے چچا) حضرت فاطمہؓ (صاحبزادی) اور اکثر ازواج مطہرات مدعی تھیں کہ اس جائیداد کو بطور وراثت تقسیم ہونا چاہیئے۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور دیگر اکابر صحابہ نے کہا کہ یہ وقف عام ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی زندگی میں جس طرح اور جن مصارف میں ان کی آمدنی صرف کرتے تھے اس میں تغیر نہ ہوگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانۂ حیات میں ان تینوں جائیدادوں کی آمدنی مختلف مدوں میں متعین کر دی تھی، بنو نضیر کی جائیداد کی آمدنی ناگہانی ضروریات کے لئے مخصوص تھی۔ فدک کی آمدنی مسافروں کے لئے وقف تھی، خیبر کی آمدنی کو آپؐ تین حصول میں تقسیم فرماتے تھے۔ دو حصے عام مسلمانوں کے لئے تھے، ایک حصہ ازواج مطہرات کو سالانہ مصارف کے لئے ملتا تھا اس میں سے بھی جو بچ جاتا وہ غریب مہاجرین کی اعانت میں کام آتا۔ آخر میں حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کے اصرار پر مدینہ کی جائیداد ان دونوں کی تولیت میں دے دی تھی لیکن حضرت علیؓ نے اس پر قبضہ کر لیا تھا، خیبر اور فدک حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانہ تک خلفاء کے ہاتھ میں رہے۔[2]

جانور ارباب سیر نے آپ کے اسپ خاصہ اور مویشی اور دواب کی تفصیل اس طرح لکھی ہے جس سے ایک والی ملک کے اصطبل اور دواب خانہ کا دھوکا ہوتا ہے۔

طبری نے ان تمام جانوروں کے نام اور حالات تفصیل سے لکھے ہیں، اور اگر وہ قابل اعتبار ہوتے تو حقیقت میں نہایت دلچسپ تھے، لیکن اس کے متعلق طبری کی جس قدر روایتیں ہیں، سب بلا استثناء واقدی سے ماخوذ ہیں۔ پچھلے مصنفین جن میں بڑے بڑے محدثین ہیں، مثلاً یعمری، مغلطائی، حافظ عراقی وغیرہ نے بھی یہ تفصیل لکھی ہے اور چونکہ یہ مصنفین اکثر سلسلۂ سند نہیں لکھتے۔ اس لئے اکثر لوگ ان کے مستند ہونے کی بناء پر اس واقعہ کو صحیح خیال کرتے ہیں، لیکن جب تفتیش کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی تمام روایتوں کا سلسلۂ سند واقدی سے آگے نہیں بڑھتا۔

حضرت عائشہؓ کی روایت اوپر گزر چکی ہے۔

ما ترک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دینارا ولا درھما ولا بعیرا ولا شاۃ۔	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ دینار چھوڑا، نہ درہم، نہ اونٹ نہ بکری۔

صحیح بخاری (کتاب الجہاد) میں عمرؓو بن حویرث (ام المومنین جویریہ کے بھائی تھے) سے روایت ہے۔

ما ترک النبی صلی اللہ علیہ وسلم الا بغلتہ البیضاء وسلاحہ وارضا ترکھا صدقۃ۔	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ نہیں چھوڑا بجز اپنے سفید خچر اور ہتھیار اور ایک زمین کے جو وقف عام ہو گئی۔

[1] صحیح بخاری کتاب الفرائض [2] یہ صحیح بخاری کے متعدد ابواب میں مذکور ہے، دیکھو کتاب الفرائض [3] سنن ابی داؤد، باب صفایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم [4] حوالۂ مذکورہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے باغ فدک سادات کو دے دیا تھا۔

ان روایتوں سے معلوم ہوگا کہ متروکاتِ خاصہ میں صرف ایک جانور تھا۔ ان صحیح اور مسلم روایات کے ہوتے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسباب اور دواب کی اتنی بڑی فہرست جو طبری وغیرہ نے درج کی ہے اور جو ایک تاجدارِ سلطنت کے شایانِ حال ہے کیونکر تسلیم کی جا سکتی ہے۔

احادیثِ صحیحہ کے استقراء سے اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ عمروؓ بن حویرث کی مختصر فہرست سے زائد چیزیں بھی آپؐ کے قبضہ میں آئیں لیکن اس سے عمرو کی روایت پر اثر نہیں پڑ سکتا۔ کیونکہ عمرو صرف اس بات کے مدعی ہیں کہ وفات کے وقت یہی سرمایہ تھا۔ ممکن ہے کہ یہ چیزیں وفات سے پہلے آپؐ نے حسبِ عادت ہبہ یا خیرات کر دی ہوں، بہرحال (از روئے روایاتِ صحیحہ مختلف اوقات میں) حسبِ ذیل جانور آپؐ کے دائرہ مِلک میں آئے۔

لحیف۔ ایک گھوڑا جو ابی بن عباس کے باغ میں بندھتا تھا۔ بخاری نے کتاب الجہاد میں اس کا ذکر کیا ہے۔

عفیرہ۔ ایک گدھا تھا، حضرت معاذؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو اپنے ساتھ اس پر بٹھایا تھا (بخاری کتاب الجہاد)

عضباء و قصواء۔ نہایت تیز اونٹنی تھی، قصواء بھی اسی کا نام ہے (طبری صفحہ ۱۸۴۲) میں ہے کہ اسی کو آپؐ نے ہجرت کے وقت حضرت ابوبکرؓ سے خریدا تھا اور اسی پر سوار ہو کر آپؐ نے ہجرت فرمائی تھی اور مدینہ پہنچ کر حضرت ابوایوبؓ کے مکان کے پاس جا کر بیٹھ گئی تھی[1]۔ حجۃ الوداع کا خطبہ بھی آپؐ نے اسی کی پشت پر دیا تھا[2] یہ ہر معرکہ میں بازی لے جاتی تھی، ایک دفعہ ایک بدو باہر سے آیا۔ اس کی سواری میں ایک اونٹ تھا جو ابھی جوان بھی نہیں ہوا تھا عضباء کا اس سے مقابلہ ہوا اور وہ آگے نکل گیا، صحابہ کو ملال ہوا۔ آپؐ نے فرمایا کہ "یہ خدا کا فرض ہے کہ دنیا کی کوئی چیز جب سر اٹھائے تو اس کو پست کر دے" (بخاری باب الجہاد)

تیسرا۔ دُلدل جس کا ذکر اکثر روایتوں میں ہے اسی خچر کا نام ہے جس کا ذکر عمروؓ بن حویرث کی روایت میں ہے چنانچہ بخاری کے شارحین نے تصریح کی ہے۔ یہ خچر مقوقس مصری نے آپؐ کو تحفہ میں بھیجا تھا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ابن العلماء (رئیس ایلہ) نے بھی آپؐ کو ایک سفید خچر (غزوہ تبوک کے موقع پر[3]) تحفۃً بھیجا تھا۔

غزوہ حنین میں جس سفید خچر پر آپؐ سوار تھے وہ فروہ بن نفاثہ جذامی نے ہدیۃً بھیجا تھا، اربابِ سیر نے اس خچر کو دلدل سمجھا ہے، لیکن یہ غلط ہے، صحیح مسلم میں اس کی تصریح موجود ہے[4]

اسلحہ اس زہد و قناعت کے ساتھ جہاد کی ضرورت سے توشہ خانہ مبارک میں حسبِ ذیل سامان تھا۔ نو عدد تلواریں تھیں جن کے نام یہ ہیں، ماثور، عضب، ذوالفقار، قلعی، بتار، حتف، مخذم، رسوب، قضیب۔

ماثور، والد ماجد سے میراث میں ملی تھی، ذوالفقار بدر میں ہاتھ آئی تھی، تلوار کا قبضہ چاندی کا تھا۔ فتح مکہ میں جو تلوار آپؐ کے ہاتھ میں تھی، اس کا قبضہ زرین تھا، سات زرہیں تھیں۔ ذات الفضول، ذات الوشاح، ذات الحواشی،

---

[1] صحیح مسلم ذکر ہجرت [2] صحیح مسلم و ابو داؤد ذکر حجۃ الوداع [3] کتاب الجہاد بغلۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم [4] فتح الباری ذکر غزوہ حنین جلد ۸ ص ۲۴ [5] اسد الغابہ غزوہ حنین

سعدیہ، فضہ، تبراء، خرنق، ذات الفضول وہی زرہ تھی جو تیس صاع پر ایک یہودی کے ہاں سال بھر کے لئے آپؐ نے رہن رکھی تھی[1]۔ زرہیں سب لوہے کی تھیں، اگرچہ عرب میں چمڑے کی زرہیں بھی ہوتی تھیں۔

چھ کمانیں تھیں، زوراء، روحاء، صفراء، بیضاء، کتوم، شداد۔ کتوم وہ کمان تھی جو غزوہ احد میں ٹوٹ گئی تھی اور آپؐ نے قتادہ کو دے دی تھی، ایک ترکش تھا جس کو کافور کہتے تھے۔ چمڑے کی ایک پیٹی تھی جس میں چاندی کے تین حلقے تھے۔ لیکن ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ کسی حدیث سے مجھ کو یہ نہیں پتہ لگا کہ آپؐ نے کبھی پیٹی لگائی بھی تھی۔ ایک ڈھال تھی جس کا نام زلوق تھا، پانچ برچھیاں تھیں، لوہے کا ایک مغفر تھا جس کا نام موشح تھا ایک اور مغفر تھا جس کو سبوغ کہتے تھے۔ تین جبے تھے جن کو آپؐ لڑائی میں پہنتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ان میں سے ایک دیبائے سبز کا تھا ایک سیاہ علم تھا جس کا نام عقاب تھا اور بھی زرد و سفید علم تھے۔

آثارِ متبرکہ ان متروکات کے علاوہ بعض یادگاریں بھی تھیں جو لوگوں نے تبرکاً اپنے پاس رکھ چھوڑی تھیں حجۃ الوداع کے موقع پر آپؐ نے عقیدت مندوں کو موئے مبارک عطا فرمائے تھے جو زیادہ تر حضرت ابو طلحہ انصاریؓ کے ہاتھ آئے تھے[2]۔ حضرت انسؓ بن مالک کے پاس بھی موئے مبارک تھے۔ اُن کے پاس دو اور چیزیں تھیں، نعلین مبارک اور ایک لکڑی کا ٹوٹا ہوا پیالہ جو چاندی کے تاروں سے جوڑ دیا گیا تھا۔ ذوالفقار جو حضرت علیؓ کے پاس تھی اُن کے بعد اُن کے خاندان میں یادگار رہی، امام حسینؓ کی شہادت کے بعد وہ حضرت علی بن حسینؓ کے ہاتھ آئی۔ بعض صحابہ نے آکر اُن کی خدمت میں عرض کی کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ یادگار آپ سے نہ چھن جائے، اگر مجھے عنایت ہو تو یہ میری جان کے ساتھ رہے لیکن انھوں نے یہ ایثار گوارا نہ کیا۔

حضرت عائشہؓ کے پاس وہ کپڑے تھے جن میں آپؐ نے انتقال فرمایا تھا۔ استحقاق خلافت کی بنا پر خاتم مہر اور عصائے مبارک جن کا احادیث میں ذکر ہے۔ پہلے حضرت ابوبکرؓ، پھر حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے قبضہ میں آئے۔ لیکن ان ہی کے عہد میں یہ دونوں چیزیں ضائع ہو گئیں، انگوٹھی تو حضرت عثمانؓ کے ہاتھ سے ایک کنوئیں میں گر گئی اور عصائے مبارک کو جہجاہ غفاریؓ نے توڑ ڈالا۔ (امام بخاری نے ان آثار مبارکہ کے ذکر کے لئے ایک خاص باب باندھا ہے۔

مسکنِ مبارک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کم سن تھے کہ والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا، اپنے دادا اور چچا کے گھروں میں پرورش پائی اور یہیں سنِ رشد کو پہنچے، پچیس سال کی عمر میں حضرت خدیجہؓ سے شادی کی، یہ تحقیقی طور پر نہیں معلوم کہ اس کے بعد آپؐ نے اپنے موروثی مکان میں اقامت فرمائی یا حضرت خدیجہؓ ہی کے گھر رہے لیکن آپؐ کے حصہ کا ایک پدری مکان مکہ میں موجود تھا جس پر عقیل نے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی اور حضرت علیؓ کے حقیقی بھائی تھے اور اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، قبضہ کر لیا تھا، چنانچہ فتح مکہ کے موقع پر جب

---

[1] صحیح بخاری کتاب البیوع، کتاب الرہن [2] صحیح مسلم حجۃ الوداع [3] صحیح بخاری کتاب الطہارت [4] ان تمام آثار مذکورہ بالا کا ذکر صحیح بخاری کتاب الخمس میں ہے [5] خاتم کا ذکر کتاب الخمس کے علاوہ بخاری کی کتاب اللباس میں ہے، عصائے مبارک کا حال فتح الباری ج ۶ ص ۱۴۸ سے ماخوذ ہے۔ ش۔

آپؐ مکہ تشریف لائے تو لوگوں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! آپؐ کہاں قیام فرمائیں گے؟ کیا اپنے دولت خانہ پر ٹھہریں گے، آپؐ نے فرمایا عقیل نے ہمارے لئے گھر کہاں چھوڑا؟[1]

مدینہ منورہ میں تشریف آوری کے بعد چھ مہینے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوایوب انصاریؓ کے گھر قیام فرما رہے اس اثنا میں آپؐ تنہا تھے، اہل و عیال مکہ ہی میں تھے۔ جب آپؐ نے مسجد نبویؐ کی بنیاد ڈالی تو اس کے اطراف میں چھوٹے چھوٹے حجرے تیار فرمائے اور اس وقت آپؐ نے آدمی بھیج کر بچے، اہل و عیال کو بلوالیا اور ان ہی حجروں میں اتارا۔[2]

آخر ایام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نو بیویاں تھیں اور الگ الگ حجروں میں رہتی تھیں۔ جن میں نہ صحن تھا نہ دالان تھے، نہ ضرورت کے الگ الگ کمرے تھے۔ ہر حجرہ کی وسعت عموماً چھ سات ہاتھ سے زیادہ نہ تھی۔ دیواریں مٹی کی تھیں جو اس قدر کمزور تھیں کہ ان میں شگاف پڑ گیا تھا۔ ان سے اندر دھوپ آتی تھی۔ چھت کھجور کی شاخوں اور پتیوں سے چھائی تھی۔ بارش سے بچنے کے لئے بال کے کمبل لپیٹ دیئے جاتے تھے، بلندی اتنی تھی کہ آدمی کھڑا ہو کر چھت کو ہاتھ سے چھو سکتا تھا۔ گھر کے دروازوں پر پردہ یا ایک پٹ کا کواڑ ہوتا تھا۔[3] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ باری باری سے ایک ایک شب ایک ایک حجرہ میں بسر فرماتے تھے۔ دن کو عموماً اصحاب کی مجلس میں تشریف رکھتے جو گویا ان حجروں کا صحن یا گھر کی مردانہ نشست گاہ تھی۔

ان حجروں کے علاوہ ایک بالاخانہ بھی تھا جس کو احادیث میں "مشربہ" کہا گیا ہے۔ ۹ھ میں جب آپؐ نے ایلاء کیا تھا اور نیز گھوڑے پر سے گر کر چوٹ کھائی تھی، تو ایک مہینہ اسی پر اقامت فرمائی تھی۔[4] اس بالاخانہ پر سامان آرائش کیا تھا۔ ایک چٹائی کا بستر، چمڑے کا ایک تکیہ جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی اور ادھر ادھر چند کھالیں لٹکی ہوئی تھیں۔[5]

کاشانۂ نبوت گو انوار الٰہی کا مظہر تھا، تاہم اس میں رات کو چراغ تک نہیں ہوتا تھا۔[6] گھر کی دنیاوی اور ظاہری آرائش بھی پسند خاطر نہ تھی، ایک بار حضرت عائشہؓ نے دیواروں پر دھاری دار رنگین کپڑے منڈھے تو آپؐ سخت ناخوش ہوئے اور فرمایا ہم کو اینٹ اور پتھر کو لباس پہنانے کے لئے مال نہیں دیا گیا ہے۔[7]

یہ حجرۂ مبارک آپؐ کی وفات کے بعد ازواج مطہراتؓ کے قبضہ میں رہے۔ ان میں جب کسی کا انتقال ہو جاتا تو وہ حجرہ ان کے اعزہ کی ملکیت ہو جاتا جن سے حضرت معاویہؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں حجروں کو خرید لیا تھا۔[8]

حضرت عمرؓ کے عہد تک یہ تمام حجرے اپنے حال پر قائم رہے، حضرت عثمانؓ کے زمانے میں بعض حجرے توڑ کر مسجد نبویؐ میں داخل کر لئے گئے، تاہم ولید بن عبدالملک کے زمانہ تک بہت سے حجرے باقی تھے، ۸۸ھ میں جب حضرت عمر بن عبدالعزیز مدینہ کے والی تھے، تمام حجرے بجز حجرۂ عائشہؓ کے کہ وہ مدفن نبویؐ ہے توڑ کر

(1) بخاری فتح مکہ (2) ابن سعد (3) یہ پوری تفصیل ادب المفرد بخاری باب التطاول فی البنیان والبناء میں ہے (4) ابو داؤد باب امامۃ القاعد (5) صحیح بخاری صفحہ ۸۶۹ باب ما کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یتجوز من اللباس والبسط (6) صحیح بخاری ج ۱ صفحہ ۳، باب التطوع خلف المراۃ (7) ابو داؤد ج ۲، کتاب اللباس باب فی الصور (8) ابن سعد جز نساء۔

مسجد نبویؐ میں ملا دیئے گئے، جس دن یہ حجرے ٹوٹے ہیں تمام مدینہ میں کہرام مچا ہوا تھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اور یادگار مٹ گئی۔[1]

دایہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو ترکہ والد سے ملا تھا اس میں ایک حبشیہ کنیز بھی تھیں جن کا نام ام ایمنؓ تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی انا یا دائیہ وہی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک زندہ رہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ ان کو ماں کہہ کر پکارتے تھے اور جب ان کو دیکھتے تو فرمایا کرتے کہ اب یہی میری خاندان کی یادگار رہ گئی ہیں۔ جب آپؐ نے حضرت خدیجہؓ سے عقد کیا تو ان کو آزاد کر کے حضرت زیدؓ سے جو آپؐ کے متبنی اور محبوب خاص اور حضرت خدیجہؓ کے غلام تھے شادی کر دی۔ اسامہ انہی کے بطن سے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاح کا واقعہ جو کتابوں میں منقول ہے کہ ایک عورت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک اونٹ مانگا، آپؐ نے فرمایا تمہیں اونٹ کا بچہ دوں گا۔ بولی کہ بچہ لے کر کیا کروں گی۔ آپؐ نے فرمایا کہ "جتنے اونٹ ہیں، اونٹ کے بچے ہی ہوتے ہیں۔" ان ہی کا واقعہ ہے۔

یہ اکثر غزوات میں شریک رہیں، جنگ احد میں سپاہیوں کو پانی پلاتیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتیں، جنگ خیبر میں بھی شریک تھیں۔[3]

غلام خاص

صحابہ میں سے بعض عقیدت مند ایسے تھے جو دنیا کے سب کام کاج چھوڑ کر ہمہ وقت خدمت اقدس میں حاضر رہتے اور خاص خاص کام انجام دیتے ان کے نام حسب ذیل ہیں۔

(۱) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ مشہور صحابی ہیں، فقہ حنفی کے بانی اول گویا وہی ہیں، امام ابوحنیفہؒ کی فقہ کا سلسلہ ان ہی کی روایات اور استنباطات پر منتہی ہوتا ہے۔ مکہ معظمہ میں قرآن مجید کی اشاعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی زمانے میں ان ہی نے کی، ستر سورتیں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سن کر یاد کی تھیں۔

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے راز دار بھی تھے اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں جاتے تو خواب گاہ، وضو اور مسواک کا اہتمام ان ہی کے متعلق ہوتا۔ جب آپؐ مجلس سے اٹھتے تو جوتیاں پہناتے، راہ میں آگے آگے عصا لے کر چلتے، جب آپؐ کہیں کسی مجلس میں جا کر بیٹھتے تو نعلین مبارک اتار کر رکھ لیتے، پھر اٹھنے کے وقت سامنے لا کر رکھ دیتے۔ جلوت و خلوت میں ساتھ رہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات کا نمونہ بن گئے تھے۔[4]

(۲) حضرت بلالؓ۔ دنیا ان کو مؤذن کے لقب سے جانتی ہے (یہ حبشی نژاد غلام تھے، مکہ میں ایمان لائے

(1) ابن سعد جز ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم (2) صحیح مسلم باب رد المہاجرین الی الانصار منائحہم (3) یہ تمام حالات طبقات ابن سعد جز ثامن تذکرہ ام ایمن سے ماخوذ ہیں (4) پوری تفصیل طبقات ابن سعد میں ہے (مجملاً بخاری باب مناقب عبداللہ بن مسعود میں بھی یہ مذکور ہے)

تھے اور جس جوش و خروش سے ایمان لائے تھے، اُس کا مختصر ذکر آغاز کتاب میں گزر چکا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اُن کو خرید کر آزاد کرا دیا تھا۔ اس وقت سے برابر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہے۔ آپ کا خانگی انتظام ان ہی کے سپرد تھا۔ بازار سے سودا سلف لانا، قرض دام لینا، پھر ادا کرنا، مہمانوں کے کھانے پینے کا انتظام کرنا۔ یہ تمام باتیں ان ہی سے متعلق تھیں[1]۔

(۳) حضرت انسؓ بن مالک بھی آپ کے خادم خاص تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو وہ نہایت کم سن تھے۔ اُن کی ماں خدمتِ اقدس میں ان کو لائیں اور عرض کی یا رسول اللہ! یہ میرا بیٹا ہے لائی ہوں کہ خدمت گزاری کرے[2]۔

حضرت انسؓ نے دس برس تک آپؐ کی خدمت کی۔ لوگوں کے پاس آنا جانا، چھوٹے چھوٹے کام کرنا، وضو کا پانی لانا، اُن کے فرائض تھے، چونکہ ابھی کم سن تھے، اُن کو کام کرنے نہیں آتے تھے۔ لیکن آپؐ نے کبھی اُن سے بازپرس نہ فرمائی[3]۔

*

[1] ابوداؤد ج۲ ص۲۷ باب قبول ہدایا المشرکین۔ [2] صحیح مسلم فضائل انسؓ۔ [3] ابوداؤد کتاب الادب۔

شمائل

شکل و لباس و طعام و مذاق طبیعت

حُلیۂ اقدس

آپ میانہ قد اور موزوں اندام تھے، رنگ سفید سرخ تھا، پیشانی چوڑی اور ابرو پیوستہ تھے بینی مبارک درازی مائل تھی، چہرہ ہلکا یعنی بہت پُر گوشت نہ تھا۔ دہانہ کشادہ تھا، دندان مبارک بہت پیوستہ نہ تھے، گردن اونچی، سر بڑا اور سینہ کشادہ اور فراخ، سر کے بال نہ بہت پیچیدہ تھے، نہ بالکل سیدھے تھے، ریشِ مبارک گھنی تھی، چہرہ کھڑا کھڑا تھا، آنکھیں سیاہ و سُرگیں اور پلکیں بڑی بڑی تھیں۔ شانے پُر گوشت تھے، مونڈھوں کی ہڈیاں بڑی تھیں، سینہ مبارک میں ناف تک بالوں کی ہلکی تحریر تھی، شانوں اور کلائیوں پر بال تھے، ہتھیلیاں پُر گوشت اور چوڑی کلائیاں لمبی اور پاؤں کی ایڑیاں نازک اور ہلکی تھیں۔ پاؤں کے تلوے بیچ سے ذرا خالی تھے، نیچے سے پانی نکل جاتا تھا[1]۔

صحابہ پر آپ کے حسن و خوبروئی کا بہت اثر پڑتا تھا۔ حضرت عبداللہؓ بن سلام جو پہلے یہودی تھے۔ پہلے پہل جب چہرۂ اقدس پر اُن کی نظر پڑی ہے تو بولے خدا کی قسم! یہ جھوٹے کا چہرہ نہیں[2]۔ جابرؓ بن سمرہ ایک صحابی ہیں، اُن سے کسی نے پوچھا آپ کا چہرہ تلوار سا چمکتا تھا۔ بولے "نہیں ماہ و خورشید کی طرح"[3]۔ یہی صحابی روایت کرتے ہیں کہ ایک شب کو جب مطلق ابر نہ تھا اور چاند نکلا تھا، میں کبھی آپ کو دیکھتا اور کبھی چاند کو دیکھتا تھا، تو آپ مجھے چاند سے زیادہ خوبرو معلوم ہوتے تھے[4]۔ حضرت براؓ صحابی کہتے ہیں کہ میں نے کسی جوڑے والے کو سرخ (خط) کے لباس میں آپ سے زیادہ خوبصورت نہیں دیکھا[5]۔

آپ کے پسینہ میں ایک طرح کی خوشبو تھی[6]۔ چہرہ مبارک پر پسینہ کے قطرے موتی کی طرح[7] ڈھلکتے تھے۔ جسم مبارک کی جلد نہایت نرم تھی۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ آپ کا رنگ نہایت کھلتا تھا۔ آپ کا پسینہ موتی معلوم ہوتا تھا، میں نے دیبا اور حریر بھی آپ کی جلد سے زیادہ نرم نہیں دیکھے اور مشک و عنبر میں بھی آپ کے بدن سے زیادہ خوشبو نہ تھی[8]۔

عام طور پر مشہور ہے کہ آپ کے سایہ نہ تھا، لیکن اس کی کوئی سند نہیں ہے۔

مُہرِ نبوت

شانوں کے بیچ میں کبوتر کے انڈے کے برابر خاتم نبوت تھی۔ یہ بظاہر سُرخ ابھرا ہوا گوشت سا تھا۔ (صحیح مسلم اور) شمائل ترمذی میں حضرت جابر بن سمرہ سے روایت ہے۔

[1] یہ حلیہ بہ تفصیل شمائل ترمذی و مسند ابن حنبل ج۱ ص۱۱۶، ۱۱۷ میں اور مختصراً بخاری و مسلم باب صفۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی ہے [2] ترمذی ابواب الزہد ص۴۰۹ [3] مشکوٰۃ باب صفۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بحوالہ مسلم [4] مشکوٰۃ باب مذکور بحوالہ ترمذی و دارمی [5] صحیح مسلم باب مذکور [6] ایضاً [7] بخاری واقعہ افک [8] مشکوٰۃ باب مذکور بحوالہ بخاری و مسلم۔

لہ رایت الخاتم بین کتفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غدۃ حمراء مثل بیضۃ الحمامۃ۔ | میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں شانوں کے بیچ میں خاتم کو دیکھا جو کبوتر کے انڈے کے برابر سرخ غدہ تھا۔

لیکن ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بائیں شانہ کے پاس چند مہاسوں کی مجموعی ترکیب سے ایک مستدیر شکل پیدا ہو گئی تھی، اسی کو مہر نبوت کہتے تھے۔ تمام صحیح روایات کی تطبیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دونوں شانوں کے درمیان ایک ذرا ابھرا ہوا گوشت کا حصہ تھا جس پر تل تھے اور بال اُگے ہوئے تھے۔

موئے مبارک سر کے بال اکثر شانے تک لٹکے رہتے تھے۔ فتح مکہ میں لوگوں نے دیکھا تو شانوں پر چار گیسو پڑے تھے۔ مشرکین عرب بالوں میں مانگ نکالتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ کفار کے مقابلہ میں اہل کتاب کی موافقت پسند کرتے تھے، ابتداء میں آپ بھی اہل کتاب کی طرح بال چھوٹے ہوئے رکھتے تھے، پھر مانگ نکالنے لگے، یہ شمائل ترمذی کی روایت ہے، معلوم ہوتا ہے کہ جب مشرکین کا وجود نہ رہا تو ان کی مشابہت کا احتمال بھی جاتا رہا، اخیر زمانہ میں مانگ نکالنے لگے۔

(بالوں میں اکثر تیل ڈالتے تھے، اور ایک دن بیچ کنگھی کرتے تھے، ریش مبارک میں گنتی کے چند بال سفید ہونے پائے تھے)

رفتار بہت تیز تھی، چلتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ ڈھلوان زمین پر اُتر رہے ہیں، ضعیف روایتوں میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ نہ تھا، یعنی زمین پر جسم اقدس کا سایہ نہیں پڑتا تھا، لیکن محدثین کے نزدیک یہ روایتیں صحت سے خالی اور ناقابل اعتبار ہیں۔

گفتگو اور خندہ و تبسم گفتگو نہایت شیریں اور دلآویز تھی، بہت ٹھہر ٹھہر کر گفتگو فرماتے تھے، ایک ایک فقرہ الگ ہوتا کہ سننے والوں کو یاد رہ جاتا، معمول تھا کہ ایک ایک بات کو تین تین دفعہ فرماتے جس بات پر زور دینا ہوتا بار بار اس کا اعادہ فرماتے، حالتِ گفتگو میں اکثر نگاہ آسمان کی طرف ہوتی تھی، آواز بلند تھی حضرت ام ہانیؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ میں قرآن پڑھتے تھے اور ہم لوگ گھروں میں پلنگوں پر لیٹے لیٹے سنتے تھے۔

حضرت خدیجہؓ کے پہلے شوہر سے ایک صاحبزادے تھے جن کا نام ہند تھا اور وہ نہایت خوش تقریر تھے جس چیز کا بیان کرتے اس کی تصویر کھینچ دیتے، حضرت امام حسن علیہ السلام نے ان سے پوچھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیونکر تقریر فرماتے تھے؟ انہوں نے کہا آپ ہمیشہ متفکر رہتے تھے، اکثر چپ رہتے اور بے ضرورت کبھی گفتگو نہ فرماتے ایک ایک فقرہ الگ اور صاف اور واضح ہوتا تھا۔ ہاتھ سے اشارہ کرتے تو پورا ہاتھ اٹھاتے، کسی بات پر تعجب کرتے

لہ صحیح مسلم (باب اثبات النبوۃ) مشہور ہے کہ پشت پر جو خاتم نبوت تھی اس میں گویا قدرتی طور پر کلمہ طیبہ تحریر تھا، یہ بالکل بے سند بات ہے احادیث سے اس کا کوئی ثبوت نہیں، محدثین نے تصریح کر دی ہے کہ ان میں سے بعض روایتیں باطل اور بہت سی ضعیف ہیں حافظ ابن حجر فرماتے ہیں لم یثبت منہا شیئ۔ زرقانی بر مواہب جلد اول صفحہ ۱۸۳، البتہ کلمہ اس نقرئی خاتم میں منقوش تھا جو انگشت مبارک میں خطوط پر مہر کرنے کی غرض سے آپ پہنا کرتے تھے لوگوں نے غلطی سے اس کو خاتم نبوت کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ تہ ابن ماجہ باب ما جاء فی القراءۃ فی صلاۃ اللیل۔

تو ہتھیلی کا رُخ پلٹ دیتے، تقریر میں کبھی ہاتھ پر ہاتھ مارتے، بات کرتے کرتے جب کبھی مسرت کی کیفیت طاری ہوتی تو آنکھیں نیچی ہو جاتیں، ہنستے بہت کم تھے، ہنسی آتی تو مسکرا دیتے اور یہی آپ کی ہنسی تھی۔ جریر بن عبداللہ کا بیان ہے کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو دیکھا ہو اور مسکرا نہ دیا ہو، روایتوں میں آیا ہے کہ کبھی کبھی جب آپ کو زیادہ ہنسی آتی تو داڑھ کے دانت (نواجذ) نظر آنے لگتے، لیکن ابن القیم وغیرہ نے لکھا ہے کہ یہ طرز ادا کا مبالغہ ہے ورنہ کبھی آپ اس زور سے نہیں ہنسے کہ نواجذ نظر آئیں۔

لباس لباس کے متعلق کسی قسم کا التزام نہ تھا، عام لباس چادر، قمیص اور تہمد تھی، پاجامہ کبھی استعمال نہیں فرمایا لیکن امام احمد اور اصحاب سنن اربعہ نے روایت کی ہے کہ آپ نے منیٰ کے بازار میں پاجامہ خریدا تھا، حافظ ابن قیم نے لکھا ہے کہ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ استعمال بھی فرمایا ہوگا، موزوں کی عادت نہ تھی لیکن نجاشی نے جو سیاہ موزے بھیجے تھے، آپ نے استعمال فرمائے، بظاہر روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چرمی تھے، عمامہ کا شملہ کبھی دوشِ مبارک پر، کبھی دونوں شانوں کے بیچ میں پڑا رہتا تھا، کبھی تحت الحنک کے طور پر لپیٹ لیتے تھے عمامہ اکثر سیاہ رنگ کا ہوتا تھا، عمامہ کے نیچے سر سے لپٹی ہوئی ٹوپی ہوتی تھی، اونچی ٹوپی کبھی استعمال نہیں فرمائی (عمامہ کے نیچے ٹوپی کا التزام تھا، فرماتے تھے کہ ہم میں اور مشرکین میں یہی امتیاز ہے کہ ہم ٹوپیوں پر عمامہ باندھتے ہیں)

چادر لباس میں سب سے زیادہ یمن کی دھاری دار چادریں پسند تھیں، جن کو عربی میں حبرہ کہتے ہیں۔

عبا بعض اوقات شامی عبا استعمال کی ہے جس کی آستین اس قدر تنگ تھی کہ وضو کرنا چاہا تو چڑھ نہ سکی اور ہاتھ کو آستین سے نکالنا پڑا، نوشیروانی قبا بھی جس کی جیب اور آستینوں پر دیبا کی سنجاف تھی استعمال کی ہے۔

کمبل جب انتقال ہوا تو حضرت عائشہؓ نے کمبل جس میں پیوند لگے ہوئے تھے اور گاڑھے کی ایک تہمد نکال کر دکھائی کہ ان ہی کپڑوں میں آپ نے وفات پائی۔

حلۂ حمراء روایتوں میں آیا ہے کہ آپ نے حلۂ حمراء بھی استعمال کیا ہے، حمراء کے معنی سرخ کے ہیں، اس لئے اکثر محدثین نے وہی عام معنی لئے ہیں، لیکن ابن القیم نے اصرار کے ساتھ دعویٰ کیا ہے کہ سرخ لباس آپ نے کبھی نہیں پہنا اور نہ مردوں کے لئے اس کو جائز رکھتے تھے، حلۂ حمراء ایک قسم کی یمنی چادر تھی جس میں سرخ دھاریاں بھی ہوتی تھیں، اس بنا پر اس کو حمراء کہتے تھے اور یہی کبھی کبھی استعمال کرتے تھے، عام محدثین کہتے ہیں کہ اس تخصیص کا کوئی ثبوت نہیں، زرقانی میں یہ بحث نہایت تفصیل سے مذکور ہے، مختلف روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے سیاہ، سرخ، سبز، زعفرانی ہر رنگ کے کپڑے پہنے ہیں، لیکن سفید رنگ بہت مرغوب تھا، بعض اوقات اس قسم کی چادر بھی استعمال فرمائی ہے جس پر کجاوے کی شکل بنی ہوئی تھی، نعلین مبارک اس طرح کے تھے جس کو اس ملک میں چپل کہتے ہیں، یہ صرف ایک تلا ہوتا تھا جس میں تسمے لگے ہوتے تھے، بچھونا چمڑے کا گدا ہوتا تھا جس میں روئی کے بجائے کھجور کے پتے بھرے ہوتے تھے، چارپائی بان کی بنی ہوئی تھی جس سے اکثر جسم پر بدھیاں پڑ جاتی تھیں۔

لہ شمائل ترمذی تہ ابوداؤد کتاب اللباس تہ صحیح بخاری باب اللباس تہ ابوداؤد ج ۲ کتاب اللباس، مسند ابن حنبل ۱۲۰، ۴۳۴

تہ ابوداؤد ج ۲ کتاب اللباس لبس الصوف والشعر۔

انگوٹھی جب آپؐ نے نجاشی اور قیصر روم کو خط لکھنا چاہا تو لوگوں نے عرض کی کہ سلاطین مُہر کے بغیر کوئی تحریر قبول نہیں کرتے، اس بنا پر چاندی کی انگوٹھی بنوائی جس میں اوپر تلے تین سطروں میں محمد رسول اللہ لکھا ہوا تھا بعض صحابہؓ سے روایت ہے کہ آپؐ صرف مہر لگانے کے وقت اس کا استعمال فرماتے تھے اور داہنے ہاتھ کی انگلی میں پہنتے تھے۔

خود و زِرہ لڑائیوں میں زِرہ اور مغفر بھی پہنتے تھے۔ اُحد کے معرکہ میں جسم مبارک پر دو زرہیں تھیں، تلوار کا قبضہ کبھی چاندی کا بھی ہوتا تھا۔

غذا اور طریقۂ طعام اگرچہ ایثار اور قناعت کی وجہ سے لذیذ اور پرتکلف کھانے کبھی نصیب نہ ہوتے یہاں تک کہ (جیسا کہ صحیح بخاری کتاب الاطعمہ میں ہے) تمام عمر آپؐ نے چپاتی کی صورت تک نہیں دیکھی تاہم بعض کھانے آپؐ کو نہایت مرغوب تھے۔

مرغوب کھانے سرکہ، شہد، حلوہ، روغن زیتون، کدو خصوصیت کے ساتھ پسند تھے، سالن میں کدو ہوتا تو پیالہ میں اس کی قاشیں انگلیوں سے ڈھونڈتے۔ ایک دفعہ امّ ہانیؓ کے گھر تشریف لے گئے اور پوچھا کہ کچھ کھانے کو ہے؟ بولیں کہ سرکہ ہے۔ فرمایا کہ جس گھر میں سرکہ ہو اس کو نادار نہیں کہہ سکتے۔ عرب میں ایک کھانا ہوتا ہے جس کو حیس کہتے ہیں، یہ گھی میں پنیر اور کھجور ڈال کر پکایا جاتا ہے، آپؐ کو یہ بہت مرغوب تھا۔

ایک دفعہ حضرت امام حسن علیہ السلام اور عبد اللہ بن عباسؓ سلمٰی کے پاس گئے اور کہا آج ہم کو وہ کھانا پکا کر کھلاؤ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت مرغوب تھا۔ بولیں تم کو وہ کیا پسند آئے گا؟ لوگوں نے اصرار کیا تو انھوں نے جو کا آٹا پیس کر ہانڈی میں چڑھا دیا۔ اوپر سے روغن زیتون اور زیرہ اور کالی مرچیں ڈالیں، پک گیا تو لوگوں کے سامنے رکھا کہ یہ آپؐ کی محبوب ترین غذا تھی۔

گوشت کے اقسام میں سے آپؐ نے دُنبہ، مرغ، بٹیر (حباری) اونٹ، بکری، بھیڑ، گورخر، خرگوش، مچھلی کا گوشت کھایا ہے، دست کا گوشت بہت پسند تھا۔ شمائل ترمذی میں حضرت عائشہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ دست کا گوشت فی نفسہٖ آپؐ کو چنداں مرغوب نہ تھا، بات یہ تھی کہ کئی کئی دن تک گوشت نصیب نہیں ہوتا تھا، اس لئے جب کبھی مل جاتا تو آپؐ چاہتے تھے کہ جلد پک کر تیار ہو جائے۔ دست کا گوشت جلدی گل جاتا ہے اس لئے آپؐ اسی کی فرمائش کرتے لیکن متعدد روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ یوں بھی آپؐ کو یہ گوشت پسند تھا۔

حضرت صفیہؓ کے نکاح میں جب آپؐ نے ولیمہ کا کھانا کھلایا تھا تو صرف کھجور اور ستو تھا، تربوز کو کھجور کے ساتھ ملا کر کھاتے تھے۔ پتلی ککڑیاں پسند تھیں۔ ایک دفعہ معوذ بن عفراءؓ کی صاحبزادی نے کھجور اور پتلی ککڑیاں خدمت میں پیش کیں (بعض اوقات روٹی کے ساتھ بھی کھجور تناول فرمائی ہے)

پانی، دودھ، شربت ٹھنڈا پانی نہایت مرغوب تھا، دودھ کبھی خالص نوش فرماتے، کبھی اس میں پانی ملا دیتے کشمش، کھجور، انگور، پانی میں بھگو دیا جاتا، کچھ دیر کے بعد وہ پانی نوش جاں فرماتے۔ کھانے کے ظروف میں ایک لکڑی کا پیالہ تھا جو لوہے کے تاروں سے بندھا ہوا تھا، روایت میں اسی قدر ہے۔ قرینہ سے

معلوم ہوتا ہے کہ ٹوٹ گیا ہوگا، اس لئے تاروں سے جوڑ دیا ہوگا۔

معمولاتِ طعام دسترخوان پر جو کھانا آتا اگر ناپسند ہوتا تو اس میں ہاتھ نہ ڈالتے، لیکن اُس کو بُرا نہ کہتے، جو سالن سامنے ہوتا اسی میں ہاتھ ڈالتے، اِدھر اُدھر ہاتھ نہ بڑھاتے اور اس سے اوروں کو بھی منع فرماتے کھانا کبھی مسند یا تکیہ پر ٹیک لگا کر نہ کھاتے اور اس کو ناپسند فرماتے، میز یا خوان پر کبھی نہیں کھایا، خوان زمین سے کسی قدر اونچی میز ہوتی تھی، عجم اسی پر کھانا رکھ کر کھاتے تھے، چونکہ یہ بھی فخر اور امتیاز کی علامت تھی، یعنی امراء اور اہل جاہ کے لئے مخصوص تھی، اس لئے آپؐ نے اس پر کھانا پسند نہیں فرمایا۔ کھانا صرف انگلیوں سے کھاتے۔ گوشت کو کبھی کبھی چھری سے کاٹ کر بھی کھاتے۔ صحیح بخاری میں یہ روایت موجود ہے۔ ابوداؤد میں ایک حدیث ہے کہ گوشت چھری سے نہ کاٹو، کیونکہ یہ اہل عجم کا شعار ہے لیکن ابوداؤد نے خود اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ اس حدیث کے راوی ابومعشر نجیح ہیں، جن کی نسبت بخاری نے لکھا ہے کہ وہ منکر الحدیث ہیں اور ان ہی منکرات میں حدیث مذکور بھی ہے۔

خوش لباسی گو تکلف اور جاہ پسندی سے آپؐ کو نفرت تھی، لیکن کبھی کبھی آپؐ نہایت قیمتی اور خوشنما لباس بھی زیب تن فرماتے تھے، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ جب حروریہ کے پاس سفیر بنا کر بھیجے گئے تو وہ یمن کے نہایت قیمتی کپڑے پہن کر گئے۔ حروریہ نے کہا کیوں ابن عباس یہ کیا لباس ہے؟ بولے کہ تم اس پر معترض ہو، میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہتر سے بہتر کپڑوں میں دیکھا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نہایت متقشف تھے۔ ایک دفعہ بازار سے ایک شامی حلہ مول لیا، گھر پر آ کر دیکھا تو اس میں سُرخ دھاریاں تھیں جا کر واپس کر آئے۔ کسی نے یہ واقعہ حضرت اسماءؓ (حضرت عائشہؓ کی بہن) سے کہا انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جبہ منگوا کر لوگوں کو دکھایا جس کی جیبوں اور آستینوں اور دامن پر دیبا کی سنجاف تھی (بعض امراء و سلاطین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بیش قیمت کپڑے ہدیہ بھیجے۔ آپؐ نے قبول فرمایا اور کبھی زیب تن کئے۔

مرغوب رنگ رنگوں میں زرد رنگ بہت پسند تھا، حدیثوں میں آیا ہے کہ کبھی کبھی آپؐ تمام کپڑے یہاں تک کہ عمامہ بھی اسی رنگ کا رنگوا کر پہنتے تھے (سفید رنگ بھی بہت پسند تھا فرماتے تھے کہ یہ رنگ سب رنگوں میں اچھا ہے)

نامرغوب رنگ سُرخ لباس ناپسند فرماتے تھے۔ ایک دفعہ عبد اللہ بن عمروؓ سُرخ کپڑے پہن کر آئے تو فرمایا یہ کیا لباس ہے؟ عبد اللہ نے جا کر آگ میں ڈال دیا، آپؐ نے سُنا تو فرمایا کہ جلانے کی ضرورت نہ تھی کسی عورت کو دے دیا ہوتا۔

عرب میں سُرخ رنگ کی مٹی ہوتی ہے جس کو مغرہ کہتے ہیں اس سے کپڑے رنگا کرتے تھے، یہ رنگ آپؐ کو نہایت ناپسند تھا، ایک دفعہ حضرت زینبؓ اس سے کپڑے رنگ رہی تھیں۔ آپؐ گھر میں آئے اور دیکھا تو واپس چلے

غذا کے متعلق زیادہ تر واقعات شمائل ترمذی اور زاد المعاد ابن قیم سے ماخوذ ہیں۔ کتاب الاطعمہ باب القطع بالسکین۔ قسطلانی شرح صحیح بخاری ج ۲ ص ۲۰۵
معرکہ ابوداؤد کتاب اللباس باب لبس الصوف والشعر۔ ابوداؤد باب الرخصۃ فی العلم وخط الحریر۔ ابوداؤد باب فی المصبوغ۔ ابوداؤد باب فی الحمرۃ

گئے۔ حضرت زینبؓ سمجھ گئیں، کپڑے دھو ڈالے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دوبارہ تشریف لائے اور جب دیکھ لیا کہ اس رنگ کی کوئی چیز نہیں تب گھر میں قدم رکھا۔[1]

ایک دن ایک شخص سرخ پوشاک پہن کر آیا تو آپ نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا۔ ایک دفعہ صحابہؓ نے سواری کے اونٹوں پر سرخ رنگ کی چادریں ڈال دی تھیں، آپ نے فرمایا میں یہ دیکھنا نہیں چاہتا کہ یہ رنگ تم پر چھا جائے۔ فوراً صحابہ نہایت تیزی سے دوڑے اور چادریں اتار کر پھینک دیں۔[2]

خوشبو کا استعمال

خوشبو آپ کو بہت پسند تھی، کوئی خوشبو کی چیز ہدیۃً بھیجتا تو کبھی رد نہ فرماتے۔ ایک خاص قسم کا خوشبو یا عطر ہوتا ہے جس کو سُکّہ کہتے ہیں، یہ ہمیشہ آپ کے استعمال میں رہتا تھا۔ صحابہ کہتے ہیں کہ جس گلی کوچہ سے آپ نکل جاتے وہ معطر ہو جاتا۔ اکثر فرمایا کرتے مردوں کی خوشبو ایسی ہونی چاہیئے کہ خوشبو پھیلے اور رنگ نظر نہ آئے اور عورتوں کی ایسی کہ خوشبو نہ پھیلے اور رنگ نظر آئے۔[3]

لطافت اور نفاست پسندی

مزاج میں لطافت تھی، ایک شخص کو میلے کپڑے پہنے دیکھا تو فرمایا کہ اس سے اتنا نہیں ہوتا کہ کپڑے دھو لیا کرے۔[4] ایک دفعہ ایک شخص خراب کپڑے پہنے ہوئے خدمت میں حاضر ہوا، آپ نے پوچھا تم کو کچھ مقدور ہے؟ بولا، ہاں۔ ارشاد ہوا کہ خدا نے نعمت دی ہے تو صورت سے بھی اس کا اظہار ہونا چاہیئے۔[5] عرب تہذیب و تمدن سے کم آشنا تھے، مسجد میں آتے تو عین نماز میں دیواروں پر یا سامنے زمین پر تھوک دیتے۔ آپ اس کو نہایت ناپسند فرماتے، دیواروں پر تھوک کے دھبوں کو خود چھڑی کی نوک سے کھرچ کر مٹاتے، ایک دفعہ تھوک کا دھبہ دیوار پر دیکھا تو اس قدر غصہ آیا کہ چہرہ مبارک سرخ ہو گیا، ایک انصاری عورت نے دھبہ کو مٹایا اور اس جگہ خوشبو لا کر ملی، آپ نہایت خوش ہوئے اور اس کی تحسین کی۔[6]

کبھی کبھی مجلس عالی میں خوشبو کی انگیٹھیاں جلائی جاتیں جن میں اگر اور کبھی کبھی کافور ہوتا۔[7] ایک دفعہ ایک عورت نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ خضاب لگانا کیسا ہے؟ بولیں کچھ مضائقہ نہیں، لیکن میں اس لئے ناپسند کرتی ہوں کہ میرے حبیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حنا کی بو ناگوار تھی۔[8]

اکثر مشک اور عنبر کا استعمال فرماتے۔

ایک شخص کے بال پریشان دیکھے تو فرمایا کہ اس سے اتنا نہیں ہو سکتا کہ بالوں کو درست کر لے۔[9] ایک دفعہ اون کی چادر اوڑھی، پسینہ آیا تو اتار کر رکھ دی۔[10] ایک دن لوگ مسجد نبوی میں آئے، چونکہ مسجد تنگ تھی اور کاروباری لوگ میلے کپڑوں میں چلے آتے تھے، پسینہ آیا تو تمام مساجد میں بو پھیل گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نہا کر آتے تو اچھا ہوتا۔ اسی دن سے غسل جمعہ ایک حکم شرعی بن گیا۔[11]

مسجد نبوی میں جھاڑو دینے کا التزام تھا، ام محجن نام ایک عورت جھاڑو دیا کرتی تھی۔ ابن ماجہ میں روایت ہے

[1] ابوداؤد [2] یہ تمام روایتیں ابوداؤد کتاب اللباس میں ہیں [3] شمائل ترمذی [4] ابوداؤد کتاب اللباس باب ما جاء فی غسل الثوب [5] ابوداؤد کتاب اللباس [6] نسائی کتاب المساجد [7] نسائی صفحہ ۲۴۷، مطبوعہ نظامی باب البخور [8] نسائی صفحہ ۷۵، باب کراہیۃ ریح الحناء [9] ابوداؤد کتاب اللباس [10] ایضاً [11] اس مضمون میں متعدد حدیثیں بخاری شریف (غسل جمعہ) میں باختلاف الفاظ و واقعات مذکور ہیں۔

کہ آپ نے حکم دیا کہ مساجد میں بچے اور مجنوں نہ جانے پائیں اور خرید و فروخت نہ ہونے پائے اور یہ بھی حکم دیا کہ مساجد میں جمعہ کے دن خوشبو کی انگیٹھیاں جلائی جائیں۔ اہل عرب بدویت کے اثر سے لطافت اور صفائی کا نام نہ جانتے تھے، اس بنا پر اس خاص باب میں آپ کو نہایت اہتمام کرنا پڑتا تھا۔

عرب کی عادت تھی اور آج بھی بدویوں میں عموماً پائی جاتی ہے کہ راستہ میں بول و براز کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو نہایت ناپسند فرماتے اور اس سے منع کرتے تھے۔ احادیث میں کثرت سے روایتیں موجود ہیں کہ آپ نے ان لوگوں پر لعنت کی ہے جو راستہ میں یا درختوں کے سایہ میں بول و براز کرتے ہیں۔ امراء کا دستور ہے کہ کاہلی کی وجہ سے کسی برتن میں پیشاب کر لیا کرتے ہیں اس سے بھی منع فرماتے تھے۔[1]

عرب میں پیشاب کے بعد استنجا کرنے یا پیشاب سے کپڑوں کے بچانے کا مطلق دستور نہ تھا، آپ ایک دفعہ راہ میں جا رہے تھے، دو قبریں نظر آئیں۔ فرمایا کہ ان میں سے ایک پر اس لئے عذاب ہو رہا ہے کہ وہ اپنے کپڑوں کو پیشاب سے محفوظ نہیں رکھتا تھا۔[2]

ایک دفعہ آپ مسجد میں تشریف لائے، دیواروں پر جا بجا دھبے تھے، آپ کے ہاتھ میں کھجور کی ٹہنی تھی، اس سے کھرچ کھرچ کر تمام دھبے مٹائے، پھر لوگوں کی طرف خطاب کر کے غصہ کے لہجہ میں فرمایا، کیا تم پسند کرتے ہو کہ کوئی شخص تمہارے سامنے آ کر تمہارے منہ پر تھوک دے، جب کوئی شخص نماز پڑھتا ہے تو خدا اس کے سامنے اور فرشتہ اس کے داہنے جانب ہوتے ہیں، اس لئے انسان کو سامنے یا داہنی جانب تھوکنا نہیں چاہیئے۔[3]

ایک صحابی نے عین نماز میں (جب کہ وہ امام نماز تھے) تھوک دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دیکھ رہے تھے فرمایا کہ یہ شخص اب نماز نہ پڑھائے، نماز کے بعد یہ صاحب خدمت اقدس میں آئے اور پوچھا کہ کیا آپ نے یہ حکم دیا؟ فرمایا کہ ہاں تم نے خدا اور پیغمبر کو اذیت دی۔[4]

بودار چیزوں مثلاً پیاز، لہسن اور مولی سے نفرت تھی، حکم تھا کہ یہ چیزیں کھا کر لوگ مسجد میں نہ آئیں۔ بخاری میں حدیث ہے کہ جو شخص پیاز، لہسن کھائے وہ ہمارے پاس نہ آئے اور ہمارے ساتھ نماز نہ پڑھے۔ اپنے زمانہ خلافت میں ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے خطبہ میں کہا کہ تم لوگ پیاز لہسن کھا کر مسجد میں آتے ہو حالانکہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا کہ کوئی شخص یہ چیزیں کھا کر مسجد میں آتا تو آپ حکم دیتے کہ مسجد سے نکال کر بقیع میں پہنچا دیا جائے۔[5]

سواری کا شوق

گھوڑے کی سواری آپ کو نہایت مرغوب تھی، آپ فرمایا کرتے الخیل معقود فی نواصیھا الخیر[6] گھوڑوں کے علاوہ گدھے، خچر، اونٹ پر آپ نے سواری فرمائی ہے۔ آپ کے خاص سواری کے گھوڑے کا نام لحیف تھا، گدھے کا نام عفیر اور خچر کا نام دُلدل اور تیہ اور اونٹنیوں کا نام قصواء اور غضباء تھا)

اسپ دوانی

مدینہ سے باہر ایک میدان تھا جس کی سرحد حصباء سے ثنیۃ الوداع تک ۶ میل تھی یہاں گھوڑ دوڑ کی مشق کرائی جاتی تھی، گھوڑے جو مشق کے لئے تیار کرائے جاتے تھے ان کی تیاری کا یہ طریقہ تھا کہ

[1] ترغیب و ترہیب کتاب الطہارۃ [2] صحیح بخاری عذاب القبر [3] ترغیب و ترہیب [4] ایضاً باب البصاق فی المسجد [5] مسلم و نسائی و ابن ماجہ [6] نسائی صفحہ ۵۶، باب حب الخیل۔

پہلے ان کو خوب دانا گھاس کھلاتے تھے، جب وہ موٹے تازے ہو جاتے تو ان کی غذا کم کرنی شروع کرتے اور گھر میں باندھ کر چار جامہ کستے، پسینہ آتا اور خشک ہوتا، روزانہ یہ عمل جاری رہتا، رفتہ رفتہ جس قدر گوشت چڑھ گیا تھا خشک ہو کر ہلکا پھلکا، چھریرا بدن نکل آتا، یہ مشق چالیس دن میں ختم ہوتی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری کا ایک گھوڑا تھا جس کا نام سبحہ تھا۔ ایک دفعہ اس کو آپؐ نے بازی میں دوڑایا، اس نے بازی جیتی تو آپؐ کو خاص مسرت ہوئی۔[1]

گھوڑ دوڑ کا اہتمام حضرت علیؓ کے سپرد تھا، انہوں نے اپنی طرف سے سراقہ بن مالک کو یہ خدمت سپرد کی اور اس کے چند قاعدے مقرر کیے، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔[2]

(۱) گھوڑوں کی صفیں قائم کی جائیں اور تین دفعہ پکار دیا جائے کہ جس کو لگام درست کرنی یا بچہ کو ساتھ رکھنا یا زین الگ کر دینی ہو الگ کر لے۔

(۲) جب کوئی آواز نہ دے تو تین دفعہ تکبیریں کہی جائیں، تیسری تکبیر پر گھوڑے میدان میں ڈال دیئے جائیں۔

(۳) گھوڑے کے کان آگے نکل جائیں تو سمجھ لیا جائے گا کہ وہ آگے نکل گیا۔

حضرت علیؓ خود میدان کے انتہائی سرے پر بیٹھ جاتے اور ایک خط کھینچ کر دو آدمیوں کو دونوں کناروں پر کھڑا کر دیتے۔ گھوڑے ان ہی دونوں کے درمیان سے ہو کر نکلتے۔

اونٹوں کی دوڑ بھی ہوتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص سواری کا ناقہ عضباء ہمیشہ بازی لے جاتا۔ ایک دفعہ ایک بدو اونٹ پر سوار آیا اور مسابقت میں عضباء سے آگے نکل گیا، تمام مسلمانوں کو سخت صدمہ ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا پر حق ہے کہ دنیا کی جو چیز گردن اٹھائے اس کو نیچا دکھائے۔[3]

رنگوں میں صندلی، مشکی اور کمیت بہت پسند تھا۔[4] گھوڑوں کی دم کاٹنے سے منع فرمایا کہ مکھی ہانکنے کا مورچھل ہے۔[5]

*

---

[1] دارقطنی ج ۲ ص ۵۵۲ وکتاب السبق بین الخیل مسند احمد اور بیہقی میں بھی یہ واقعہ مذکور ہے) [2] یہ پوری تفصیل دارقطنی ص ۵۵۳،۵۵۲ وکتاب السبق بین الخیل میں ہے، لیکن محدثانہ حیثیت سے یہ روایت ضعیف ہے [3] صحیح بخاری ونسائی ودارقطنی ومسند احمد عن انس باب الرہان والسبق [4] نسائی مطبوعہ نظامی ص ۵۶۰ (باب ما یستحب من شیمۃ الخیل) [5] کتب سنن کتاب الادب۔

معمولات

(ترمذی نے شمائل میں حضرت علیؓ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اوقات کے تین حصے کر دیئے تھے، ایک عبادت الٰہی کے لئے، دوسرا عام خلق کے لئے اور تیسرا اپنی ذات کے لئے۔

صبح سے شام تک کے معمولات

معمول تھا کہ نماز فجر پڑھ کر جا نماز پر، آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے یہاں تک کہ آفتاب اچھی طرح نکل آتا[1] اور یہی وقت دربار نبوت کا ہوتا۔ لوگ پاس آکر بیٹھتے اور آپؐ ان کو مواعظ و نصائح تلقین فرماتے،

اکثر صحابہ سے پوچھتے کہ کسی نے کوئی خواب دیکھا ہے؟ کسی نے دیکھا ہوتا تو عرض کرتے۔ آپؐ اس کی تعبیر بیان فرماتے، کبھی خود اپنا خواب بیان فرماتے۔[2] اس کے بعد ہر قسم کی گفتگو ہوتی۔ لوگ جاہلیت کے قصے بیان کرتے، شعر پڑھتے، ہنسی خوشی کی باتیں کرتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف مسکرا دیتے۔ اکثر اسی وقت مال غنیمت اور وظائف و خراج وغیرہ کی تقسیم فرماتے۔[3]

بعض روایتوں میں ہے کہ جب دن کچھ چڑھ جاتا تو چاشت کی کبھی چار کبھی آٹھ رکعت نماز ادا فرماتے، گھر جا کر گھر کے دھندے میں مشغول رہتے، پھٹے کپڑوں کو سیتے، جوتا ٹوٹ جاتا تو اپنے ہاتھ سے گانٹھ لیتے، دودھ دوہتے۔[4]

نماز عصر پڑھ کر ازواج مطہرات میں سے ایک ایک کے پاس جاتے اور ذرا ذرا دیر ٹھہرتے، پھر جس کی باری ہوتی وہیں رات بسر فرماتے، تمام ازواج مطہرات وہیں جمع ہو جاتیں، عشاء تک صحبت[5] رہتی، پھر نماز عشاء کے لئے مسجد میں تشریف لے جاتے اور واپس آکر سو رہتے۔ ازواج رخصت ہو جاتیں۔ نماز عشاء کے بعد بات چیت کرنی ناپسند فرماتے۔

خواب

عام معمول یہ تھا کہ آپؐ اول وقت نماز عشاء پڑھ کر آرام فرماتے تھے، سوتے وقت التزاماً قرآن مجید کی کوئی سورت (بنی اسرائیل، زمر، حدید، حشر، صف، تغابن، جمعہ) پڑھ کر سوتے۔ شمائل ترمذی میں ہے کہ آرام فرماتے وقت یہ الفاظ فرماتے۔

اللھم باسمک اموت واحیٰ — خدایا تیرا نام لے کر مرتا ہوں اور زندہ رہتا ہوں

جاگتے تو فرماتے۔

الحمد للہ الذی احیانا بعد ما اماتنا والیہ النشور۔ — اس خدا کا شکر جس نے موت کے بعد زندہ کیا اور اسی کی طرف حشر ہوگا۔

---

[1] صحیح مسلم باب تبسم صلعم وابوداؤد ص ۳۱۸ [2] جامع ترمذی [3] صحیح مسلم کتاب التعبیر [4] صحیح بخاری کتاب التعبیر [5] نسائی باب قعود الامام فی مصلاہ [6] بخاری اور حدیث کی کتابوں میں متعدد جزئی واقعات مذکور ہیں [7] صحیح بخاری باب ما یکون الرجل فی مہنۃ ومسند حنبل ومسند عائشہؓ [8] صحیح مسلم باب القسم بین الزوجات [9] بخاری صلوٰۃ العشاء۔

آدھی رات یا پہر رات رہے جاگ اٹھتے، مسواک ہمیشہ سرہانے رہتی تھی، اٹھ کر پہلے مسواک فرماتے، پھر وضو کرکے اور عبادت میں مشغول ہوتے۔ آپ کی سجدہ گاہ[1] آپ کے سرہانے ہوتی تھی، ہمیشہ داہنی کروٹ اور دایاں ہاتھ رخسار کے نیچے رکھ کر سوتے، لیکن جب کبھی سفر میں پچھلے پہر منزل پر اُتر کر آرام فرماتے تو معمول تھا کہ دایاں ہاتھ اونچا کرکے چہرہ اس پر ٹیک کر سوتے کہ گہری نیند آجاتے۔ نیند میں کسی قدر خراٹے کی آواز آتی تھی۔

بچھونے میں کوئی التزام نہ تھا، کبھی معمولی بستر پر، کبھی کھال پر، کبھی چٹائی اور کبھی خالی زمین پر آرام فرماتے۔

عبادت شبانہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خانگی معمولات اور اوراد سے حضرت عائشہؓ کے برابر کوئی واقف نہ تھا، اُن سے مروی ہے کہ جب سورہ مزمل کی ابتدائی آیتیں نازل ہوئیں تو آپ نے اس قدر نمازیں پڑھیں کہ پاؤں پر ورم آگیا، بارہ مہینے تک باقی آیتیں رکی رہیں، سال بھر کے بعد جب بقیہ آیتیں اتریں تو قیام لیل جو اب تک فرض تھا نفل رہ گیا۔

شب کو آٹھ رکعت متصل پڑھتے جن میں صرف آٹھویں رکعت میں قعدہ کرتے پھر ایک اور رکعت پڑھتے اور اس میں بھی جلسہ کرتے، پھر دو رکعت اور ادا کرتے، اس طرح ۱۱ رکعتیں ہو جاتیں، لیکن جب عمر زیادہ ہوگئی اور جسم ذرا بھاری ہوگیا تو سات رکعتیں پڑھتے جن کے بعد دو رکعتیں اور ادا کرتے، کبھی کبھی رات کو اتفاقاً نیند کا غلبہ ہوتا اور اس معمول میں فرق آتا تو دن میں ۱۲ رکعتیں پڑھ لیتے تھے۔[2]

ابوداؤد میں حضرت عائشہؓ سے ایک اور روایت ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

"عشا کی نماز جماعت سے پڑھ کر گھر میں چلے آتے اور یہاں چار رکعتیں پڑھ کر خواب راحت فرماتے، وضو کا پانی اور مسواک سرہانے رکھ دی جاتی، سو کر اٹھتے پہلے مسواک فرماتے پھر وضو کرتے اور جائے نماز پر آکر آٹھ رکعتیں ادا کرتے۔"[3]

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک دن میں اپنی خالہ میمونہؓ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں تھیں) کے یہاں خاص اس غرض سے رہا کہ دیکھوں آپ رات کو کس طرح نماز پڑھتے ہیں، زمین پر فرش بچھا ہوا تھا، آپ نے اس پر آرام فرمایا، میں سامنے پڑا سو رہا، قریباً آدھی رات ڈھلے آپ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے۔ آل عمران کی اخیر دس آیتیں پڑھیں، پانی کی مشک لٹکی ہوئی تھی اس سے وضو کیا، پھر نماز شروع کی، میں بھی وضو کرکے بائیں پہلو میں کھڑا ہوگیا، آپ نے ہاتھ پکڑ کر داہنی جانب پھیر دیا، ۱۲ رکعتیں پڑھ کر آپ سو رہے، یہاں تک کہ سانس کی آواز آنے لگی، صبح ہوتے حضرت بلالؓ نے اذان دی، آپ اٹھے، فجر کی سنتیں ادا کیں، پھر مسجد میں تشریف لے گئے۔

معمولات نماز

ابتداء میں آپ ہر نماز کے لئے نیا وضو کرتے تھے، لیکن جب یہ گراں گزرنے لگا تو صرف پنجوقتہ مسواک رہ گئی۔ فتح مکہ میں آپ نے سب سے پہلے ایک وضو سے کئی نمازیں پڑھیں، تاہم عادتاً آپ اکثر نئے وضو کے ساتھ نماز ادا فرماتے تھے، وضو میں عام معمول یہ تھا کہ پہلے تین بار ہاتھ دھوتے، پھر کلی کرتے اور ناک میں پانی ڈالتے۔ اس کے بعد تین تین بار منہ ہاتھ دھوتے، سر کا مسح کرکے اور تین بار پاؤں کو دھوتے، بعض

(۱) یعنی سجدہ کا مقام جہاں بحالت نماز آپ سجدہ کرتے تھے۔ (۲) یہ پوری تفصیل زرقانی میں حدیث کی متعدد کتابوں کے حوالے سے مذکور ہے۔ (۳) سنن ابوداؤد باب صلوٰۃ اللیل (۴) صحیح مسلم ومسند ج ۵ ص ۲۲۵ (۵) مسلم ج ۱ ص ۱۰۸ باب آخر صفۃ الوضوء

اوقات کسی عضو کو تین بار اور کسی عضو کو دو بار اور کسی کو ایک بار دھوتے۔[1]

سنن ونوافل زیادہ تر گھر ہی میں ادا فرماتے، اذان صبح ہی کے ساتھ اٹھتے اور فجر کی دو رکعت سنت نہایت اختصار کے ساتھ ادا کرتے، یہاں تک کہ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ مجھے بعض اوقات یہ خیال ہوتا تھا کہ آپ نے سورہ فاتحہ پڑھی یا نہیں۔[2] لیکن فرض کی دو رکعتوں میں عموماً طویل سورتیں پڑھتے، حضرت عبداللہ بن سائب سے مروی ہے کہ ایک بار آپ نے مکہ میں نماز فجر میں سورہ مومنین پڑھی، اسی طرح کبھی واللیل اذا عسعس اور کبھی سورہ ق پڑھتے، صحابہؓ کا اندازہ ہے کہ آپ صبح کی نماز میں ساٹھ سے لے کر سو آیتوں تک پڑھتے تھے۔

ظہر وعصر میں اگرچہ بہ نسبت فجر کے تخفیف فرماتے تھے، تاہم ابتدائی دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ کے ساتھ اتنی بڑی سورہ پڑھتے کہ آدمی بقیع تک جاتا تھا اور وہاں اپنا کام کرتا تھا، پھر پلٹ کر گھر آتا تھا اور وضو کرتا تھا اور پہلی رکعت میں جاکر شامل ہو جاتا تھا۔ صحابہ نے اندازہ کیا تو معلوم ہوا کہ ظہر کی اول دو رکعتوں میں آپ اس قدر قیام فرماتے تھے جس میں الٓمٓ تنزیل السجدہ کے برابر سورہ پڑھی جاسکتی ہے، اخیر کی دو رکعتوں میں یہ مقدار نصف رہ جاتی تھی، عصر کی دونوں پہلی رکعتوں میں ظہر کی آخری رکعتوں کے برابر قیام فرماتے تھے اور اخیر کی دو رکعتوں میں پہلی رکعتوں کی نصف مقدار رہ جاتی تھی، حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی رکعت میں تیس آیتوں کے برابر اور دوسری رکعت میں پندرہ آیتوں کے یا اس کے نصف کے برابر اور عصر میں پندرہ آیتوں کے برابر پڑھا کرتے تھے، جابرؓ بن سمرہ کہتے ہیں کہ ظہر میں آپ سبح اسم ربک الاعلیٰ پڑھتے تھے۔

مغرب کی نماز میں والمرسلات اور سورہ طور پڑھتے تھے۔[3]

عشاء کی نماز میں والتین والزیتون اور اسی کے برابر کی سورتیں پڑھتے تھے۔ تہجد کی نماز میں بڑی بڑی سورتیں پڑھتے تھے مثلاً سورہ بقرہ، سورہ آل عمران، سورہ نساء۔ جمعہ کی پہلی رکعت میں سورہ جمعہ یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ اور دوسری رکعت میں اِذَا جَآءَکَ الْمُنٰفِقُوْنَ اور کبھی سبح اسم ربک الاعلیٰ اور ھل اتاک حدیث الغاشیۃ۔ عیدین میں بھی دو پچھلی سورتیں یعنی سبح اسم ربک الاعلیٰ اور ھل اتاک پڑھتے تھے، اتفاق سے اگر عید اور جمعہ ایک ساتھ پڑ جاتا تو دونوں نمازوں میں یہی دونوں سورتیں پڑھا کرتے تھے، جمعہ کے دن کی نماز صبح میں الٓمٓ تنزیل السجدہ اور ھل اتی علی الانسان حین من الدھر پڑھنے کا معمول تھا۔[4]

معمولات خطبہ

خطبہ دعوت وارشاد وہدایت کے لئے آپ اکثر خطبہ دیا کرتے تھے، بالخصوص جمعہ کے لئے تو خطبہ لازمی تھا، جمعہ کے خطبات میں معمول یہ تھا کہ جب لوگ جمع ہو جاتے تو آپ نہایت سادگی کے ساتھ گھر سے نکلتے، مسجد میں داخل ہوتے اور لوگوں کو سلام کرتے، پھر منبر پر تشریف لے جاتے تو لوگوں کی طرف رخ کرکے سلام کرتے اور اذان کے بعد فوراً خطبہ شروع کر دیتے۔ پہلے ہاتھ میں ایک عصا ہوتا تھا لیکن جب منبر بن گیا تو

(۱) مسلم ج ۱ ص ۱۰۱ باب آخر فی صفۃ الوضوء (۲) مسلم ج ۱ ص ۲۶۴ باب رکعتی سنۃ الفجر والحث علیہا (۳) مسلم ج ۱ ص ۱۸۶ باب القراءۃ فی الظہر والعصر وغیرہما (۴) یہ تمام روایتیں صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ، کتاب الجمعہ والعیدین میں مذکور ہیں۔

ہاتھ میں عصا لینا چھوڑ دیا. خطبہ ہمیشہ نہایت مختصر اور جامع ہوتا تھا. فرمایا کرتے تھے کہ نماز کا طول اور خطبہ کا اختصار آدمی کے تفقہ کی دلیل ہے. جمعہ کے خطبہ میں عموماً سورۂ "ق" پڑھتے تھے. اس میں قیامت اور حشر و نشر کا بہ تفصیل ذکر ہے۔

خطبہ ہمیشہ حمد خداوندی کے ساتھ شروع کرتے تھے، اگر اثنائے خطبہ میں کوئی کام پیش آجاتا تو منبر سے اتر کر اس کو کر لیتے، پھر منبر پر جاکر خطبہ کو پورا فرماتے، ایک دفعہ آپ خطبہ دے رہے تھے، اسی حالت میں ایک آدمی نے آکر کہا یا رسول اللہ! میں مسافر آدمی ہوں، اپنے دین کی حقیقت سے ناواقف ہوں، اس کے متعلق پوچھنے آیا ہوں۔ آپ منبر سے اتر آئے۔ ایک کرسی رکھ دی گئی، اس پر بیٹھ گئے اور اس کو تعلیم و تلقین کی. پھر جاکر خطبہ کو پورا کیا، ایک بار آپ خطبہ دے رہے تھے، امام حسین علیہ السلام سرخ کپڑے پہنے ہوئے مسجد میں آگئے. چونکہ بچپن کی وجہ سے لڑکھڑاتے آتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو ضبط نہ ہوسکا. منبر سے اتر آئے اور گود میں اٹھا لیا اور یہ آیت پڑھی: اِنَّمَا اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ۔

خطبہ کی حالت میں لوگوں کو بیٹھنے اور نماز پڑھنے کا بھی حکم دیتے تھے، چنانچہ عین خطبہ کی حالت میں ایک شخص مسجد میں آیا، آپ نے پوچھا کہ کیا تم نے نماز پڑھی؟ اس نے کہا نہیں، آپ نے فرمایا "اٹھو اور پڑھو"۔

میدان جہاد میں جب خطبہ دیتے تھے تو کمان پر ٹیک لگا کر کھڑے ہوتے تھے. بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ ہاتھ میں تلوار لے کر کھڑے ہوتے تھے لیکن ابن قیم نے لکھا ہے کہ آپ نے خطبہ کی حالت میں کبھی تلوار ہاتھ میں نہیں لی۔ وعظ و ارشاد کے لئے عموماً ناغہ دے کر خطبہ دیا کرتے تھے تاکہ لوگ گھبرا نہ جائیں۔

معمولاتِ سفر

حج، عمرہ اور زیادہ تر جہاد کی وجہ سے آپ کو اکثر سفر کی ضرورت پیش آیا کرتی تھی. سفر میں معمول یہ تھا کہ پہلے ازواج مطہرات میں قرعہ ڈالتے جس کے نام قرعہ پڑتا وہ ہم سفر ہوتیں، جمعرات کے دن سفر کرنا پسند فرماتے تھے اور صبح کے تڑکے روانہ ہو جاتے تھے، افواج کو بھی جب کسی مہم پر روانہ فرماتے تو اسی وقت جب سواری سامنے آتی اور رکاب میں قدم مبارک رکھتے تو بسم اللہ کہتے اور جب زین پر سوار ہوجاتے تو تین بار تکبیر کہتے. اس کے بعد یہ آیت پڑھتے۔

سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ۔

پاک ہے وہ ذات جس نے اس جانور کو ہمارا فرماں بردار بنا دیا، حالانکہ ہم خود اس کو مطیع نہیں کر سکتے تھے اور ہم اپنے خدا کی طرف پلٹنے والے ہیں۔

صحیح مسلم کتاب ادب المفرد مطبوعہ مصر ص ۱۰۳ باب الجلوس علی السریر۔ جامع ترمذی مناقب حسنین۔ بخاری، ج ۱ ص ۱۲۷ باب اذا رای الامام رجلا جاء وهو يخطب امره ان يصلي ركعتين۔ زاد المعاد، ج اول ص ۱۲۱ فصل فی ہدیہ فی خطبہ۔ بخاری ج ۱ (باب ما کان النبی یتخولہم بالموعظۃ)۔ بخاری ج ۲ باب حدیث الافک کتاب المغازی۔ ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی ای یوم یستحب السفر و باب فی الابتکار فی السفر۔ ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ سوار ہوجانے کے بعد تین تین بار تکبیر و تحمید کرتے، پھر یہ دعا پڑھتے، سبحانک انی ظلمت نفسی فاغفر لی انہ لا یغفر الذنوب الا انت (ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب ما یقول الرجل اذا رکب)۔

پھر یہ دعا کرتے۔

اللّٰهم انا نسئلك فی سفرنا هذا البر والتقوی ومن العمل ما ترضی اللّٰهم هون علینا سفرنا واطو لنا بعده اللّٰهم انت الصاحب فی السفر والخلیفة فی الاهل اللّٰهم انی اعوذ بك من وعثاء السفر وكآبة المنقلب وسوء المنظر فی الاهل والمال۔

خداوندا! اس سفر میں ہم تجھ سے نیکی، پرہیزگاری اور عمل پسندیدہ کی درخواست کرتے ہیں. خداوندا! ہمارے اس سفر کو آسان اور اس کی مسافت کو طے کردے۔ خداوندا! سفر میں تو رفیق ہے، بال بچوں کے لئے تو ہمارا قائم مقام ہے خداوندا میں سفر اور واپسی کے آلام مصائب اور گھر بار کے مناظر بد سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

جب واپس ہوتے تو اس میں اس قدر اضافہ کر دیتے آئبون، تائبون، عابدون لربنا حامدون راستے میں جب کسی چوٹی پر چڑھتے تو تکبیر کہتے اور جب اس سے نیچے اترتے تو ترنم ریز تسبیح ہوتے. صحابہ بھی آپ کے ہم آواز ہوکر تکبیر و تسبیح کا غلغلہ بلند کرتے. جب کسی منزل پر اترتے تو یہ دعا فرماتے۔

یا ارض ربی و ربك اللّٰه اعوذ باللّٰه من شرك وشر ما فیك وشر ما خلق فیك وشر ما یدب علیك واعوذ بك من اسد و اسود ومن الحیة والعقرب ومن ساكنی البلد ومن والد وما ولد۔

اے زمین! میرا خدا تیرا پروردگار خدا ہے، میں تیری برائی سے اور اس چیز کی برائی سے جو تیرے اندر ہے اور اس چیز کی برائی سے جو تیرے اندر پیدا کی گئی ہے اور اس چیز کی برائی سے جو تجھ پر چلتی ہے پناہ مانگتا ہوں، خداوندا تجھ سے شیر، سانپ، بچھو اور اس گاؤں کے رہنے والوں اور آدمیوں سے پناہ مانگتا ہوں۔

جب کسی آبادی میں داخل ہونا چاہتے تو یہ دعا پڑھتے۔

اللّٰهم رب السمٰوٰت السبع وما اظللن و رب الارضین السبع وما اقللن ورب الشیاطین وما اضللن ورب الریاح وما ذرین اسئلك خیر هذه القریة وخیر اهلها واعوذ بك من شرها وشر اهلها وشر ما فیها (ابوداؤد کتاب الجہاد، باب ما یقول الرجل اذا نزل المنزل)

خداوندا! اے ساتوں آسمان اور ان تمام چیزوں کے پروردگار جن پر وہ سایہ فگن ہیں اے ساتوں زمینوں اور ان تمام مخلوقات کے پروردگار جو ان پر موجود ہیں اے شیاطین اور ان تمام نفوس کے پروردگار جن کو وہ گمراہ کرتے ہیں اے ہوا اور ان تمام اشیاء کے پروردگار جن کو وہ اڑاتی ہیں، میں تجھ سے اس گاؤں اور اس گاؤں کے رہنے والوں کی بھلائی کی درخواست کرتا ہوں اور اس گاؤں اور اس گاؤں کے رہنے والوں کی برائی سے پناہ مانگتا ہوں۔

مدینہ پہنچتے تو پہلے مسجد میں جاکر دو رکعت نماز ادا فرماتے، پھر مکان کے اندر تشریف لے جاتے. تمام لوگوں کو حکم تھا کہ سفر سے آنے کے ساتھ ہی گھر کے اندر نہ چلے جائیں تاکہ عورتیں اطمینان کے ساتھ سامان درست کرلیں۔

ابوداؤد کتاب الجہاد باب ما یقول الرجل اذا سافر۔ زاد المعاد فصل فی ہدیہ فی السفر۔ ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی اعطاء البشیر۔ ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الطروق۔

معمولاتِ جہاد

جہاد میں معمول یہ تھا کہ جب فوج کو کسی مہم پر روانہ فرماتے تو امیر العسکر کو خاص طور پر پرہیزگاری اختیار کرنے اور اپنے رفقا کے ساتھ نیکی کرنے کی ہدایت فرماتے۔ پھر تمام فوج کی طرف مخاطب ہو کر فرماتے۔

اغزوا باسم اللہ فی سبیل اللہ قاتلوا من کفر باللہ اغزوا ولا تغلوا ولا تغدروا ولا تمثلوا ولا تقتلوا ولیدا۔[1]	خدا کے نام پر خدا کی راہ میں کفار سے لڑو، خیانت اور بدعہدی نہ کرنا، مُردوں کے ناک کان نہ کاٹنا، بچوں کو قتل نہ کرنا۔

اس کے بعد شرائطِ جہاد کی تلقین کرتے۔[2]

جب فوج کو رخصت کرتے تو یہ الفاظ فرماتے۔

استودع اللہ دینکم و امانتکم وخواتیم اعمالکم۔[3]	میں تمہارے قرض کو، امانت کو اور تمہارے اعمال کے نتائج کو خدا کے حوالے کرتا ہوں۔

جب خود شریکِ جہاد ہوتے اور حملہ کے مقام پر شب کو پہنچتے تو صبح کا انتظار کرتے، صبح ہو جاتی تو حملہ کرتے۔ اگر صبح کے وقت حملہ کرنے کا اتفاق نہ ہوتا تو دوپہر ڈھلے حملہ کرتے۔[4] جب کوئی مقام فتح ہو جاتا تو اقامتِ عدل و انصاف کے لئے وہاں تین دن تک قیام فرماتے۔[5] جب فتح و ظفر کی خبر آتی تو سجدۂ شکرانہ بجا لاتے۔[6] جب میدانِ جہاد میں شریکِ کارزار ہوتے تو یہ دعا فرماتے۔

اللھم انت عضدی ونصیری بک احول وبک اصول وبک اقاتل۔[7]	خداوندا تو میرا دست و بازو ہے تو میرا مددگار ہے تیرے سہارے پر میں مدافعت کرتا ہوں، حملہ کرتا ہوں اور لڑتا ہوں۔

معمولاتِ عیادت و عزا

بیماروں کی عیادت و غمخواری آپ ضرور فرماتے تھے اور صحابہ کو ارشاد ہوتا تھا کہ عیادت بھی ایک مسلمان کا فرض ہے۔[8] ہجرت کے ابتدائی زمانہ میں معمول شریف یہ تھا کہ جب کسی شخص کا موت کا وقت قریب آ جاتا تو صحابہ آپ کو اس کی اطلاع دیتے۔ آپ اس کے مرنے سے پہلے تشریف لاتے اس کے لئے دعائے مغفرت فرماتے اور اخیر دم تک اس کے پاس بیٹھے رہتے، یہاں تک کہ دم واپسیں کے انتظار میں آپ کو اس قدر دیر ہو جاتی کہ آپ کو تکلیف ہونے لگتی۔ صحابہ نے تکلیف کا احساس کیا اور اب ان کا یہ معمول تھا کہ جب کوئی شخص مر جاتا تو آپ کو اس کی موت کی خبر دیتے۔ آپ اس کے مکان پر تشریف لے جاتے، اس کے لئے استغفار فرماتے، جنازہ کی نماز پڑھتے۔ اس کے بعد اگر مٹی دینا چاہتے تو ٹھہر جاتے ورنہ واپس چلے آتے۔ لیکن صحابہ کو آخر آپ

[1] صحیح مسلم کتاب الجہاد باب تامیر الامام الامراء علی البعوث ووصیتہ ایاہم بآداب الغزو وغیرہا۔ ابو داؤد کتاب الجہاد باب فی الدعاء عند الوداع۔
[2] بخاری کتاب المغازی ذکر غزوۂ خیبر۔ [3] ابو داؤد کتاب الجہاد باب فی ای وقت یستحب اللقاء۔ [4] ابو داؤد کتاب الجہاد باب فی الامام یقیم عند الظہور علی العدو بارضہم۔ [5] ابو داؤد کتاب الجہاد باب فی سجود الشکر۔ [6] ابو داؤد کتاب الجہاد باب ما یدعی عند اللقاء۔
[8] صحیح بخاری باب وجوب عیادۃ المریض۔

کی یہ تکلیف بھی گوارا نہ ہوئی۔ اس لئے خود جنازہ آپ کے مکان تک لانے لگے اور یہی عام معمول ہو گیا۔[1]

عیادت کے لئے جب کسی بیمار کے پاس تشریف لے جاتے تو اس کو تسکین دیتے، پیشانی اور نبض پر ہاتھ رکھتے۔ اس کی صحت کے لئے دعا فرماتے[2] اور کہتے انشاء اللہ طہور، خدا نے چاہا تو خیریت ہے، کوئی بدفالی کے فقرے کہتا تو ناپسند فرماتے۔ ایک بار ایک اعرابی مدینہ میں آ کر بیمار پڑ گیا۔ آپ اس کی عیادت کو تشریف لے گئے اور کلماتِ تسکین ادا فرمائے۔ اس نے کہا تم نے خیریت کہا شدید تپ ہے، جو قبر ہی میں ملا کر چھوڑے گی۔ آپ نے فرمایا ہاں اب یہی سہی۔[3]

معمولاتِ ملاقات

معمول یہ تھا کہ کسی سے ملنے کے وقت ہمیشہ پہلے خود سلام اور مصافحہ کرتے، کوئی شخص اگر جھک کر آپ کے کان میں کچھ بات کہتا تو اس وقت تک اس کی طرف سے رُخ نہ پھیرتے جب تک وہ خود منہ نہ ہٹا لے، مصافحہ میں بھی یہی معمول تھا یعنی کسی سے ہاتھ ملاتے تو جب تک کہ وہ خود نہ چھوڑ دے اس کا ہاتھ نہ چھوڑتے، مجلس میں بیٹھتے تو آپ کے زانو کبھی ہم نشینوں سے آگے نکلے ہوئے نہ ہوتے۔[4]

جو شخص حاضر ہونا چاہتا، دروازے پر کھڑے ہو کر پہلے السلام علیکم کہتا، پھر پوچھتا کہ کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟ (خود بھی آپ کسی سے ملنے جاتے تو اسی طرح اجازت مانگتے)۔ کوئی شخص اس طریقہ کے خلاف کرتا تو آپ اس کو واپس کر دیتے۔ ایک دفعہ بنو عامر کا ایک شخص آیا اور دروازہ پر کھڑا ہو کر پکارا کہ اندر آ سکتا ہوں؟ آپ نے فرمایا کہ جا کر ان کو اجازت طلبی کا طریقہ سکھا دو یعنی پہلے سلام کر لے تب اجازت مانگے۔[5]

ایک دفعہ صفوان بن امیہ نے جو قریش کے رئیس اعظم تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنے بھائی کلدہ کے ہاتھ دودھ، ہرن کا بچہ اور ککڑیاں بھیجیں، کلدہ یونہی بے اجازت چلے آئے، آپ نے فرمایا کہ واپس جاؤ اور سلام کر کے اندر آؤ۔[6]

ایک دفعہ حضرت جابرؓ زیارت کو آئے اور زیادہ دیر دروازہ پر دستک دی۔ آپ نے پوچھا کون ہے۔ بولے میں، آپ نے فرمایا "میں میں" یعنی یہ کیا طریقہ ہے، نام بتانا چاہیئے۔

جب آپ خود کسی کے گھر پر جاتے تو دروازہ کے دائیں یا بائیں جانب کھڑے ہوتے اور السلام علیکم کہہ کر اذن طلب فرماتے (راوی کا بیان ہے کہ آپ عین دروازہ کے سامنے اس وجہ سے نہ کھڑے ہوتے کہ اس وقت تک دروازوں پر پردہ ڈالنے کا رواج نہ تھا)

اگر صاحبِ خانہ اذن نہ دیتا تو پلٹ آتے، چنانچہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سعدؓ بن عبادہ کے گھر تشریف لائے اور باہر کھڑے ہو کر اذن طلبی کے لئے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا، سعدؓ نے اس طرح آہستہ سلام کا جواب دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں سنا۔ حضرت سعدؓ کے فرزند قیس بن سعدؓ نے کہا کہ آپ رسول اللہ

[1] مسند ابن حنبل ج ۳ ص ۶۶) [2] صحیح بخاری باب وضع الید علی المریض [3] باب دعاء العائد للمریض [4] باب عیادت الاعراب
[5] ابو داؤد و ترمذی [6] یہ دونوں روائتیں ابو داؤد ج ۲ ص ۱۵۶ میں ہیں۔

کو اندر آنے کی اجازت کیوں نہیں دیتے، حضرت سعدؓ نے کہا چپ رہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بار بار سلام کریں گے جو ہمارے لئے برکت کا سبب ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ السلام علیکم کہا اور سعدؓ نے پھر اسی طرح جواب دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر تیسری دفعہ اسی طریقہ سے اذن طلب کیا اور جب کوئی جواب نہ ملا تو آپؐ واپس چلے، حضرت سعدؓ نے آپ کو جاتے دیکھا تو دوڑ کر گئے اور عرض کی کہ میں آپؐ کا سلام سُن رہا تھا لیکن آہستہ جواب دیتا تھا کہ آپ بار بار سلام فرمائیں[1]۔

کسی کے گھر تشریف لے جاتے تو ممتاز مقام پر بیٹھنے سے پرہیز فرماتے۔ ایک بار آپؐ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے مکان پر تشریف لے گئے۔ انھوں نے آپ کے بیٹھنے کے لئے چمڑے کا ایک گدا ڈال دیا، لیکن آپ زمین پر بیٹھ گئے اور گدا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے درمیان آ گیا[2]۔

معمولاتِ عامہ

تیمن یعنی داہنی طرف سے داہنے ہاتھ سے کام کرنا آپؐ کو محبوب تھا۔ جوتا پہلے داہنے پاؤں میں پہنتے، مسجد میں پہلے داہنا پاؤں رکھتے۔ مجلس میں کوئی چیز تقسیم فرماتے تو داہنی طرف سے۔ اسی طرح کسی کام کو شروع کرنا چاہتے تو پہلے بسم اللہ کہہ لیتے۔

*

[1] ابوداؤد کتاب الادب [2] ادب المفرد ص ۲۱۹۔

مجالسِ نبویؐ

دربارِ نبوت

شہنشاہِ کونینؐ کا دربار نقیب و چاؤش اور خیل و حشم کا دربار نہ تھا۔ دروازہ پر دربان بھی نہیں ہوتے تھے، تاہم نبوت کے جلال سے ہر شخص پیکرِ تصویر نظر آتا تھا۔ حدیثوں میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں لوگ بیٹھتے تو یہ معلوم ہوتا کہ ان کے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہوتی ہیں۔ یعنی کوئی شخص ذرا بھی جنبش نہیں کرتا تھا۔ گفتگو کی اجازت میں ترتیب کا لحاظ رہتا تھا۔ لیکن یہ امتیاز مراتب نسب و نام یا دولت و مال کی بنا پر نہیں بلکہ فضل و استحقاق کی بنا پر ہوتا تھا۔ سب سے پہلے آپؐ اہلِ حاجت کی طرف متوجہ ہوتے اور ان کی معروضات سن کر ان کی حاجت براری فرماتے۔

تمام حاضرین ادب سے سر جھکائے رہتے۔ خود بھی آپؐ مؤدب ہو کر بیٹھتے۔ جب کچھ فرماتے تو تمام مجلس پر سناٹا چھا جاتا، کوئی شخص بولتا تو جب تک وہ چپ نہ ہو جاتے دوسرا شخص بول نہیں سکتا تھا۔ اہلِ حاجت عرض معا میں ادب کی حد سے بڑھ جاتے تو آپؐ کمالِ حلم کے ساتھ برداشت فرماتے۔

آپؐ کسی کی بات کاٹ کر گفتگو نہ فرماتے، جو بات ناپسند ہوتی اُس سے تغافل فرماتے اور ٹال جاتے، کوئی شخص شکریہ ادا کرتا تو اگر آپؐ نے واقعی اس کا کوئی کام انجام دیا ہے تو شکریہ قبول فرماتے۔ مجلس میں جس قسم کا ذکر چھڑ جاتا آپؐ بھی اس میں شامل ہو جاتے۔ ہنسی اور مہذب ظرافت میں بھی شریک ہوتے، خود بھی مذاقیہ باتیں فرماتے، کبھی کسی قبیلہ کا کوئی معزز شخص آ جاتا، تو حسبِ مرتبہ اس کی تعظیم فرماتے اور فرماتے اکرموا کریم کل قوم مزاج پرسی کے ساتھ ہر شخص سے دریافت فرماتے کہ کوئی ضرورت اور حاجت تو نہیں ہے؟ یہ بھی فرماتے کہ جو لوگ اپنے مطالب مجھ تک نہیں پہنچا سکتے مجھ کو ان کے حالات اور ضروریات کی خبر دو۔

ایران میں معمول تھا کہ جب مجلس میں کوئی معزز شخص آ جاتا تھا تو سب تعظیم کو کھڑے ہو جاتے۔ یہ بھی قاعدہ تھا کہ رؤسا اور امراء جب دربار جاتے تو لوگ سینوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑے رہتے، آپؐ نے ان باتوں سے منع فرمایا اور ارشاد کیا کہ جس کو یہ پسند آتا ہے کہ لوگ اس کے سامنے تعظیم سے کھڑے رہیں اس کو اپنی جگہ دوزخ میں ڈھونڈنی چاہیئے[1]۔ البتہ جوشِ محبت میں آپؐ کسی کسی کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ چنانچہ حضرت فاطمہ زہراؓ جب کبھی آ جاتیں تو اکثر کھڑے ہو جاتے اور فرطِ محبت سے ان کی پیشانی چومتے۔ حضرت حلیمہ سعدیہؓ کے لئے بھی آپؐ نے اٹھ کر چادر بچھا دی تھی۔ اسی طرح ایک دفعہ آپؐ کے رضاعی بھائی آئے تو ان کے لئے بھی محبت سے کھڑے ہو گئے اور ان کو اپنے سامنے بٹھایا[2]۔

ہر شخص کو اس کے رتبہ کے مناسب جگہ ملتی۔ کسی شخص کے دل میں یہ خیال نہیں آنے پاتا کہ دوسرا شخص اس

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب قیام الرجل للرجل [2] ابو داؤد کتاب الادب بر الوالدین۔

سے زیادہ عزت یاب ہے، جب کوئی شخص اچھی بات کہتا تو آپ تحسین فرماتے اور نامناسب گفتگو کرتا تو اس کو منع فرما دیتے۔[1]

ایک دفعہ دو شخص مجلسِ اقدس میں حاضر تھے، ان میں ایک معزز اور دوسرا کم رتبہ تھا، معزز صاحب کو چھینک آئی، لیکن انھوں نے اسلامی شعائر کے موافق الحمد للہ نہیں کہا، دوسرے صاحب کو بھی چھینک آئی، انھوں نے الحمد للہ کہا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حسبِ معمول یرحمک اللہ کہا، معزز صاحب نے شکایت کی، آپ نے فرمایا کہ انھوں نے خدا کو یاد کیا تو میں نے بھی کیا، تم نے خدا کو بھلا دیا تو میں نے بھی تم کو بھلا دیا۔[2]

صحابہ کو اس بات کی سخت تاکید تھی کہ کسی کی شکایت یا عیوب آپ تک نہ پہنچائیں، آپ فرماتے تھے کہ میں چاہتا ہوں کہ دنیا سے جاؤں تو سب کی طرف سے صاف جاؤں۔[3]

مجالس ارشاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تلقین کا فیض اگرچہ سفر، حضر، جلوت، خلوت، نشست، برخاست، غرض ہر وقت جاری رہتا تھا، تاہم اس سے وہی لوگ مستفیض ہو سکتے تھے جو اتفاق سے موقع پر ہوتے تھے، اس بنا پر آپ نے تعلیم و ارشاد کے لئے بعض اوقات خاص کر دیئے تھے کہ لوگ پہلے سے مطلع رہیں اور جن کو استفادہ منظور ہو، وہ آسکیں۔

یہ صحبتیں عموماً مسجدِ نبوی میں منعقد ہوتی تھیں، مسجدِ نبوی میں ایک چھوٹا سا صحن تھا، کبھی آپ وہاں نشست فرماتے۔ ابتداءً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نشست کے لئے کوئی ممتاز جگہ نہ تھی، باہر سے اجنبی لوگ آتے تو آپ کے پہچاننے میں دقت ہوتی، صحابہ نے ایک چھوٹا سا مٹی کا چبوترہ بنا دیا، آپ اس پر تشریف رکھتے باقی دونوں طرف صحابہ حلقہ باندھ کر بیٹھ جاتے۔[4]

آدابِ مجالس ان مجالس میں آنے والوں کے لئے کوئی روک ٹوک نہ تھی، عموماً بدو اپنے اسی وحشت نما طریقہ سے آتے اور بے باکانہ سوال و جواب کرتے۔

خلقِ نبوی کا منظر ان مجالس میں زیادہ حیرت انگیز بن جاتا ہے، آپ پیغمبر خاتم کی حیثیت سے رونق افروز ہیں، صحابہ عقیدت کیش غلاموں کی طرح خدمتِ اقدس میں حاضر ہیں، ایک شخص آتا ہے اور اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں اور حاشیہ نشینوں میں کوئی ظاہری امتیاز نظر نہیں آتا، لوگوں سے پوچھتا ہے "محمد کون ہے؟" صحابہ بتاتے ہیں کہ یہی گورے سے آدمی جو ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ وہ کہتا ہے، اے ابن عبد المطلب! میں تم سے نہایت سختی سے سوال کروں گا خفا نہ ہونا، آپ بخوشی سوال کی اجازت دیتے ہیں۔[5]

بایں ہمہ سادگی و تواضع، یہ مجالس رعب و وقار اور آدابِ نبوت کے اثر سے لبریز ہوتی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و تلقینات کا دائرہ، اخلاق، مذہب اور تزکیۂ نفوس تک محدود تھا، اس کے علاوہ اور باتیں منصبِ نبوت سے خارج تھیں، لیکن بعض لوگ نہایت معمولی اور خفیف باتیں پوچھتے تھے۔ مثلاً یا رسول اللہ! میرے باپ کا نام کیا ہے؟ میرا اونٹ کھو گیا ہے وہ کہاں ہے؟ آپ اس قسم کے سوالات

۱؎ یہ تمام تفصیل شمائل ترمذی کی دو مفصل روایتوں سے ماخوذ ہے جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عام اخلاق کا ذکر ہے ۲؎ ادب المفرد امام بخاری ۳؎ ابوداؤد کتاب الادب ۴؎ اخلاق ناصری ص ۳۲ ۵؎ ابوداؤد باب القدر ۶؎ بخاری ج ۱ ص ۱۵ کتاب الایمان۔

کو ناپسند فرماتے تھے۔

ایک بار اسی قسم کے لغو سوالات کئے گئے تو آپ نے برہم ہو کر فرمایا کہ جو پوچھنا ہو پوچھو میں سب کا جواب دوں گا، حضرت عمرؓ نے آپ کے چہرہ کا رنگ دیکھا تو نہایت الحاح کے ساتھ کہا: رضینا الخ۔[1]

کوئی شخص کھڑے کھڑے سوال نہیں کرتا تھا، ایک شخص نے اس طرح سوال کیا تو آپ نے اس کی طرف تعجب سے دیکھا۔ اسی طرح یہ بھی معمول تھا کہ جب ایک مسئلہ طے ہو جاتا تو دوسرا مسئلہ پیش کیا جاتا، بعض اوقات آپ گفتگو کرتے ہوتے، کوئی صحرا نشین بدو جو آدابِ مجلس سے ناواقف ہوتا، دفعۃً آجاتا، اور عین سلسلۂ تقریر میں کوئی بات پوچھ بیٹھتا، آپ سلسلۂ تقریر قائم رکھتے اور فارغ ہو کر اس کی طرف متوجہ ہوتے اور جواب دیتے ایک دفعہ آپ تقریر فرما رہے تھے۔ ایک بدو آیا اور آنے کے ساتھ اس نے پوچھا کہ قیامت کب آئے گی؟ آپ تقریر کرتے رہے، حاضرین سمجھے کہ آپ نے نہیں سنا۔ کسی نے کہا سنا، لیکن آپ کو ناگوار ہوا، آپ گفتگو سے فارغ ہو چکے تو دریافت فرمایا کہ پوچھنے والا کہاں ہے؟ بدو نے کہا: میں یہ حاضر ہوں، آپ نے فرمایا جب لوگ امانت کو ضائع کرنے لگیں گے۔ بولا کہ امانت کیونکر ضائع ہو گی۔ فرمایا، جب نااہلوں کے ہاتھ میں کام آئے گا۔[2]

اوقاتِ مجلس اس قسم کی مجالس کے لئے جو خاص وقت مقرر تھا وہ صبح کا تھا، نماز فجر کے بعد آپ بیٹھ جاتے اور فیوضِ روحانی کا سرچشمہ جاری ہو جاتا۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر نماز کے بعد آپ ٹھہر جاتے اور مجلس قائم ہو جاتی، چنانچہ کعبؓ بن مالک پر جب غزوۂ تبوک کی غیر حاضری کی وجہ سے عتاب نازل ہوا تو وہ انہی مجالس میں آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودیٔ مزاج کا پتہ لگاتے، خود ان کے الفاظ یہ ہیں۔

واتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاسلم علیہ وھو فی مجلسہ بعد الصلوٰۃ فاقول فی نفسی ھل حرک شفتیہ برد السلام ام لا۔[3]	میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتا تھا سلام کرتا تھا اور آپ بعد نماز کے اپنی مجلس میں ہوتے تھے تو میں اپنے جی میں کہتا تھا کہ آپ نے جواب سلام میں اپنے لب ہلائے یا نہیں۔

صبح کی مجلسوں میں کبھی کبھی آپ وعظ فرماتے، ترمذی اور ابوداؤد میں عرباضؓ بن ساریہ سے روایت ہے،

وعظنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوماً بعد صلوٰۃ الغداۃ موعظۃ بلیغۃ ذرفت منھا العیون ووجلت منھا القلوب۔[4]	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن صبح کی نماز کے بعد ایک بلیغ وعظ کیا، جس سے آنکھیں اشک ریز ہو گئیں اور دل کانپ اٹھے۔

نماز کے بعد جو مجلس منعقد ہوتی اس میں وعظ و نصیحت اور اس قسم کی جزئی باتوں پر گفتگو ہوتی تھی، لیکن ان اوقات کے علاوہ آپ خاص طور پر حقائق و معارف کے اظہار کے لئے مجالس منعقد فرماتے تھے، یہی مجالس ہیں جن کی نسبت احادیث میں یہ الفاظ آئے ہیں۔

۱؎ بخاری کتاب العلم ۲؎ ایضاً ص ۱۴ ۳؎ بخاری ج ۱ ص ۵۔۳ حدیث کعبؓ بن مالک ۴؎ ترمذی ص ۴۴۰۔

كان يومًا بارزًا للناس۔ | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن عام طور پر لوگوں کیلئے باہر نکلے تھے[1]

چونکہ افادہ عام ہوتا تھا، اس لئے آپ چاہتے تھے کہ کوئی شخص فیض سے محروم نہ رہنے پائے اس بنا پر جو لوگ ان مجالس میں آکر واپس چلے جاتے اُن پر آپ نہایت ناراض ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ صحابہ کے ساتھ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ تین شخص آئے، ایک صاحب نے حلقہ میں تھوڑی سی جگہ خالی پائی وہیں بیٹھ گئے دوسرے صاحب کو درمیان میں موقع نہیں ملا، اس لئے سب کے پیچھے بیٹھے۔ لیکن تیسرے صاحب واپس چلے گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب فارغ ہوئے تو فرمایا کہ ان میں سے ایک نے خدا کی طرف پناہ لی، خدا نے بھی اس کو پناہ دی، ایک نے حیا کی، خدا بھی اس سے شرمایا۔ ایک نے خدا سے منہ پھیرا، خدا نے بھی اس سے منہ پھیر لیا[2]۔

پند و نصائح کتنے ہی موثر طریقہ سے بیان کئے جائیں، لیکن ہمیشہ سُنتے سُنتے آدمی اُکتا جاتا ہے اور نصائح بے اثر ہو جاتے ہیں، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وعظ و نصائح کی مجالس ناغہ دے کر منعقد فرماتے تھے بخاری میں ابن مسعودؓ سے روایت ہے۔

كان النبي صلى الله عليه وسلم يتخولنا بالموعظة في الايام كراهة السآمة علينا۔	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگوں کو ناغہ دے کر نصیحت فرماتے تھے کہ ہم لوگ اُکتا نہ جائیں۔

عورتوں کے لئے مخصوص مجالس ان مجالس کا فیض زیادہ تر مردوں تک محدود تھا اور عورتوں کو موقع کم ملتا تھا، اس بنا پر عورتوں نے درخواست کی کہ ہمارے لئے خاص دن مقرر فرمایا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ درخواست منظور کی اور اُن کے وعظ و ارشاد کے لئے ایک خاص دن مقرر ہو گیا[3]۔

اگرچہ مسائل شرعیہ کے متعلق ہر قسم کے سوالات کی اجازت تھی اور خاتونانِ حرم وہ مسائل دریافت کرتی تھیں جو خاص پردہ نشینوں سے تعلق رکھتے تھے، تاہم جب کوئی پردہ کا واقعہ مجلسِ عام میں سوال کی غرض سے پیش کیا جاتا تو فرطِ حیاء سے آپ کو ناگوار ہوتا۔

اس قسم کے پردے کی بات مرد بھی مجمع عام میں پوچھتے تو آپ کو تکدّر ہوتا، ایک دفعہ ایک انصاری نے (جن کا نام عاصم تھا) مجلس عام میں پوچھا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو غیر کے ساتھ دیکھ لے تو کیا حکم ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگوار ہوا اور آپ نے اُن کو ملامت کی[4]۔

طریقۂ ارشاد کبھی کبھی آپ خود امتحان کے طور پر حاضرین سے کوئی سوال کرتے اس سے لوگوں کی جودتِ فکر اور اصابتِ رائے کا اندازہ ہوتا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ آپ نے پوچھا وہ کون سا درخت ہے جس کے پتے جھڑتے نہیں اور جو مسلمانوں سے مشابہت رکھتا ہے، لوگوں کا خیال جنگلی درختوں کی طرف گیا میرے ذہن میں آیا کہ کھجور کا درخت ہوگا، لیکن میں کم سن تھا اس لئے جرأت نہ کر سکا بالآخر لوگوں نے عرض کی کہ حضور بتائیں سائل ارشاد فرمایا، کھجور۔ عبداللہ بن عمرؓ کو تمام عمر حسرت رہی کہ کاش میں نے جرأت کر کے

[1] سنن ابن ماجہ صفحہ ۲۱ [2] بخاری ج ۱ صفحہ ۴ کتاب العلم [3] بخاری کتاب العلم [4] ایضاً۔

اپنا خیال ظاہر کر دیا ہوتا[1]۔

ایک روز آپ مسجد میں تشریف لائے، صحابہؓ کے دو حلقے قائم تھے، ایک قرآن خوانی اور ذکر و دعا میں مشغول تھا اور دوسرے حلقہ میں علمی باتیں ہو رہی تھیں، آپ نے فرمایا دونوں عمل خیر کر رہے ہیں، لیکن خدا نے مجھ کو صرف معلم بنا کر مبعوث کیا ہے۔ یہ کہہ کر علمی حلقہ میں بیٹھ گئے[2]۔

ان مجالس میں دقیق مباحث کو جن کی تہ تک عوام نہیں پہنچ سکتے ناپسند فرماتے تھے چنانچہ ایک روز صحابہ کی مجلس میں مسئلہ تقدیر پر گفتگو ہو رہی تھی، آپ نے سُنا تو حجرہ سے نکل آئے، آپ کا چہرہ اس قدر سُرخ ہو گیا تھا، گویا عارضِ مبارک پر کسی نے انار کے دانے نچوڑ دیئے ہیں، آپ نے صحابہ کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کیا تم اس لئے پیدا کئے گئے ہو، قرآن کو باہم ٹکرا رہے ہو، گزشتہ امتیں ان ہی باتوں سے برباد ہوئیں[3]۔

ان مجالس کا مقصد یہ بھی تھا کہ صحابہ جن مسائل میں باہم اختلاف کرتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کا صحیح فیصلہ کر دیتے۔ مثلاً شہرت طلبی اور جاہ پرستی خلوص عمل کے منافی سمجھی جاتی ہے اور خود صحابہ کے زمانہ میں بھی سمجھی جاتی تھی، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں دو شخصوں نے اس مسئلہ میں گفتگو کی۔

ایک نے کہا اگر ہم نے دشمن سے مقابلہ کیا اور ایک شخص نے فخریہ یہ کہہ کر نیزہ مارا کہ میرا وار لینا میں غفاری جوان ہوں تو اس میں تمہاری کیا رائے ہے؟ مخاطب نے جواب دیا، میری رائے میں کچھ ثواب نہ ملے گا، تیسرے آدمی نے یہ گفتگو سُن کر کہا میرے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں، اس پر دونوں میں اختلاف ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی گفتگو سُنی تو فرمایا، ثواب اور شہرت دونوں میں کوئی مخالفت نہیں[4]۔

عام خیال یہ تھا کہ قوائے عملیہ کے بے کار کر دینے کا نام تقدیر ہے، تقدیر میں جو کچھ لکھا ہو گا اس کو کوئی طاقت مٹا نہیں سکتی، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مجلس میں جو اتفاقاً منعقد ہو گئی تھی، اس خیال کی تردید کی اور فرمایا کہ اعمال تو خود تقدیر ہیں، انسان کو خدا اچھے اعمال کی توفیق دیتا ہے وہی اس کا نوشتۂ تقدیر ہیں اس لئے توکل قوتِ عمل کے بیکار کر دینے کا نام نہیں چنانچہ صحابہ ایک جنازہ میں شریک تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور صحابہ جمع ہو گئے، آپ کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی، اس سے زمین کریدنے لگے، پھر فرمایا تم میں کوئی ایسا نہیں ہے جس کی جگہ جنت یا دوزخ میں نہ لکھی جا چکی ہو، ایک شخص نے کہا تو ہم اپنی تقدیر پر توکل کر کے عمل کیوں نہ چھوڑ دیں؟ جو شخص سعادت مند ہو گا وہ خود بخود سعادت مندوں میں داخل ہو جائے گا اور جو شخص بد بخت ہو گا وہ بد بختوں سے جا ملے گا، آپ نے فرمایا سعادت مند وہ لوگ ہیں جن کو سعادت مندوں کے عمل کی توفیق دی جاتی ہے اور بد بخت وہ ہیں جن کے لئے شقاوت کے کام کے اسباب جمع ہو جاتے ہیں[5]۔

مجالس میں شگفتہ مزاجی باوجود اس کے کہ ان مجالس میں صرف ہدایت، ارشاد، اخلاق اور تزکیۂ نفوس کی باتیں ہوتی تھیں اور صحابہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس طرح بیٹھتے تھے کان الطیر

[1] سنن ابن ماجہ ص ۲۱، باب فضل العلماء [2] سنن ابن ماجہ ص ۹ باب القدر [3] ایضاً [4] ابوداؤد ج ۲ صفحہ ۱۱۳۔

[5] بخاری ج ۲ صفحہ ۷۳۸ تفسیر وکذب بالحسنیٰ

فوق روسہلتو تاہم یہ بجا ہے شگفتہ مزاجی کے اثر سے خالی نہ تھیں۔ ایک دن آپؐ نے ایک مجلس میں بیان فرمایا کہ جنت میں خدا سے ایک شخص نے کھیتی کرنے کی خواہش کی، خدا نے کہا کیا تمہاری خواہش پوری نہیں ہوئی ہے؟ اس نے کہا ہاں! لیکن میں چاہتا ہوں کہ فوراً بوؤں اور ساتھ ہی تیار ہو جائے، چنانچہ اس نے بیج ڈالے، فوراً دانہ اگا، بڑھا اور کاٹنے کے قابل ہوگیا۔ ایک بدو بیٹھا ہوا تھا اس نے کہا یہ سعادت صرف قریشی یا انصاری کو نصیب ہوگی جو زراعت پیشہ ہیں لیکن ہم لوگ تو کاشتکار نہیں، آپؐ ہنس پڑے[1]۔

ایک دفعہ ایک صاحب خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ میں تباہ ہوگیا، ارشاد ہوا کیوں؟ بولے میں نے رمضان میں بیوی سے ہم بستری کی۔ آپؐ نے فرمایا، ایک غلام آزاد کرو، بولے غریب ہوں، غلام کہاں سے لاؤں۔ ارشاد ہوا، دو مہینے کے روزے رکھو، بولے یہ مجھ سے ہو نہیں سکتا۔ فرمایا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ، بولے اتنا مقدور نہیں۔ اتفاق سے کہیں سے زنبیل بھر کر کھجوریں آگئیں، آپؐ نے فرمایا تو غریبوں کو خیرات کر آؤ۔ عرض کی اُس خدا کی قسم جس نے آپؐ کو پیغمبر بنایا، سارے مدینہ میں مجھ سے بڑھ کر کوئی غریب نہیں۔ آپؐ بے ساختہ ہنس پڑے اور فرمایا اچھا تم خود ہی کھا لو[2]۔

فیضِ صحبت

ایک دفعہ حضرت ابوہریرہؓ نے عرض کی کہ ہم جب خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتے ہیں تو دنیا ہیچ معلوم ہوتی ہے لیکن جب گھر میں بال بچوں میں بیٹھتے ہیں تو حالت بدل جاتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر ایسا حال رہتا تو فرشتے تمہاری زیارت کو آتے[3]۔

ایک دفعہ حضرت حنظلہؓ خدمتِ اقدس میں آئے اور کہا یا رسول اللہ! میں منافق ہوگیا ہوں، میں جب خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتا ہوں اور آپؐ دوزخ و جنت کا ذکر فرماتے ہیں تو یہ چیزیں آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں، لیکن بال بچوں میں آکر سب بھول جاتا ہوں۔ ارشاد ہوا کہ اگر باہر نکل کر بھی وہی حالت رہتی تو فرشتے تم سے مصافحہ کرتے[4]۔

✱

[1] بخاری ج ۲ صفحہ ۱۱۲۱ باب کلام الرب مع اہل الجنۃ [2] بخاری صفحہ ۸۰۹ باب نفقۃ المعسر علی اہلہ [3] ترمذی شریف باب ما جاء فی صفۃ الجنۃ و نعیمہا۔ امام ترمذی کے نزدیک یہ حدیث قوی نہیں [4] ترمذی الرقاق ۲۰۰۸، صحیح مسلم کتاب التوبہ۔

خطابتِ نبویؐ

خطابت[1] اور تقریر نبوت کا نہایت ضروری عنصر ہے۔ اسی بنا پر جب خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس پیغمبر بنا کر بھیجا تو اُن کو یہ دُعا مانگنا پڑی۔

وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِي يَفْقَهُوا قَوْلِي۔ — خداوندا! میری زبان کی گرہ کھول کہ لوگ میری بات سمجھیں۔

لیکن سید الانبیاء کو خود بارگاہِ الٰہی سے یہ وصفِ کامل عطا کیا گیا تھا۔ چنانچہ آپؐ نے تحدیثِ نعمت کے طور پر فرمایا۔

انا افصح العرب۔ — میں فصیح ترین عرب ہوں۔

بعثت بجوامع الکلم۔ — میں کلماتِ جامعہ لے کر مبعوث ہوا ہوں۔

عرب میں اگرچہ ہر قبیلہ فصاحت و بلاغت کا مدعی تھا تاہم تمام عرب میں دو قبیلے اس وصف میں نمایاں امتیاز رکھتے تھے، قریش اور بنو ہوازن، قریش خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قبیلہ تھا اور بنو ہوازن کے قبیلہ میں آپؐ نے پرورش پائی تھی۔ اس لئے آپؐ نے ارشاد فرمایا ہے۔

انا اعربکم انا من قریش ولسانی لسان بنی سعد بن بکر[2]۔ — میں تم میں فصیح تر ہوں، قریشی ہوں اور میری زبان بنو سعد[3] کی زبان ہے۔

طرزِ بیان

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہایت سادہ طریقہ پر خطبہ دیتے تھے۔ آپؐ جب اپنے حجرے سے نکلتے تھے تو سلاطین کی طرح نہ آپؐ کے ساتھ چاؤش ہوتے تھے، نہ آپؐ خطباء کا لباس پہنتے تھے۔ ہاتھ میں صرف ایک عصا ہوتا تھا اور کبھی کبھی کمان پر ٹیک لگا کر خطبہ دیتے تھے[4]۔ ابن ماجہ میں ہے کہ مسجد میں جب آپؐ خطبہ دیتے تو دستِ مبارک میں عصا ہوتا تھا اور میدانِ جنگ میں خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو کمان پر ٹیک لگاتے تھے۔ جمعہ اور عیدین کا خطبہ تو متعین تھا لیکن اس کے علاوہ خطبہ کا کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ جب ضرورت پیش آتی، آپؐ فی البدیہہ خطبہ کے لئے تیار ہو جاتے تھے، یہی وجہ ہے کہ آپؐ نے زمین پر، منبر پر، اونٹ پر جس جگہ جیسا موقع پیش آیا خطبہ دیا ہے۔ ضرورت کے لحاظ سے اگرچہ آپؐ کو کبھی کبھی طویل خطبہ بھی دینا پڑتا تھا، تاہم آپؐ کے خطبے عموماً مختصر ہوتے تھے۔

عام نصائح اور پند کی باتیں گو آپؐ اخباری فقروں میں بیان فرماتے لیکن جب کلام کو خاص طور پر مؤثر بنانا ہوتا تھا تو خطبہ کو عموماً سوال کی صورت میں شروع فرماتے تھے۔ غزوۂ حنین میں آپؐ نے انصار کے سامنے جو خطبہ دیا وہ اول سے آخر تک سوال و جواب ہے۔ خطبہ حجۃ الوداع وغیرہ اور تمام خطبات میں جیسا کہ آگے آتا ہے یہ خصوصیت نمایاں ہے۔ جوشِ بیان کا یہ حال تھا کہ آنکھیں سُرخ اور آواز نہایت بلند ہو جاتی تھی، غصہ

[1] اضافہ از قائم باب [2] طبقات ابن سعد ج ۱ صفحہ ۷۱ [3] بنو سعد قبیلہ ہوازن کی ایک شاخ ہے [4] ابوداؤد ج ۱ کتاب الصلوٰۃ ابواب الجمعۃ والخطبۃ علی قوس۔

بڑھ جاتا تھا، انگلیاں اٹھتی جاتی تھیں، گویا یہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ کسی فوج کو جنگ کے لئے ابھار رہے ہیں۔[1] جوشِ بیان میں جسدِ مبارک جھوم جھوم جاتا تھا۔ ہاتھوں کو حرکت دینے سے پٹھوں کے چٹخنے کی آواز آتی تھی، کبھی مٹھی بند کر لیتے تھے، کبھی کھول دیتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس قسم کی پُرجوش حالت کی نہایت صحیح تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی المنبر یقول یاخذ الجبار سمٰواتہ وارضہ بیدہ وقبض یدہ فجعل یقبضھا ویبسطھا قال ویتمائل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن یمینہ وعن شمالہ حتی نظرت الی المنبر یتحرک من اسفل شیٔ منہ حتی انی لاقول اساقط ھو برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ابن ماجہ ذکر المبعث)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر خطبہ دیتے سُنا فرما رہے تھے کہ خداوندِ صاحبِ جبروت آسمان و زمین کو اپنے ہاتھ میں لے لے گا، یہ بیان کرتے ہوئے آپ مٹھی بند کر لیتے تھے اور پھر کھول دیتے تھے، آپ کا جسمِ مبارک کبھی دائیں کبھی بائیں جھکتا جاتا تھا، یہاں تک کہ میں نے منبر کو دیکھا تو اس کا سب سے نچلا حصہ بھی اس قدر ہل رہا تھا کہ میں نے خیال کیا کہ آپ کو لے کر گر تو نہیں پڑے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات کی نوعیت

احادیث کی کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات اور ان کے جستہ جستہ فقرے بغیر کسی خاص ترکیب کے جمع کر دیئے گئے ہیں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مختلف حیثیتیں تھیں اور اس کا اثر آپ کے طرزِ بیان پر پڑتا تھا۔ آپ داعیِ مذہب تھے، فاتح تھے، واعظ تھے، امیر الجیش تھے، قاضی تھے، پیغمبر تھے، اس اختلافِ حیثیت نے آپ کے خطابت اور زورِ بیان میں نہایت اختلاف پیدا کر دیا ہے اور بلاغت کا اقتضا بھی یہی ہے۔ آپ بحیثیتِ داعیِ مذہب ہونے کے جو خطبہ دیتے تھے اس میں نہایت زور اور جوش پیدا ہو جاتا تھا اور اس وقت آپ کی حیثیت بالکل ایک امیر الجیش کی ہوتی تھی، چنانچہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ وانذر عشیرتک الاقربین (اپنے اقرباء کو ڈراؤ) تو آپ نے تمام قریش کو جمع کر کے ایک خطبہ دینا چاہا، ابولہب کی شقاوت نے اگرچہ اس خطبہ کو پورا نہیں ہونے دیا، تاہم آپ کی زبان سے اس واقعہ پر جو چند جملے نکل گئے اس سے آپ کے زورِ بیان کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ آپ نے صفا پر چڑھ کر پہلے پکارا "یا صباحاہ"۔ یہ وہ لفظ ہے جو عرب میں اس وقت بولا جاتا ہے جب صبح کے وقت کوئی قبیلہ کسی پر دفعۃً غارت گری کے لئے ٹوٹ پڑتا ہے۔ تمام لوگ یہ لفظ سُن کر چونک اٹھے اور آپ کے گرد جمع ہو گئے۔ آپ نے فرمایا۔

ارأیتم ان اخبرتکم ان خیلا تخرج من سفح ھذا الجبل اکنتم مصدقیّ۔

بتاؤ اگر میں تمہیں یہ خبر دوں کہ اس پہاڑ کے دامن سے ایک فوج نکلا چاہتی ہے تو کیا تم میری تصدیق کرو گے۔

سب نے جواب دیا، اب تک آپ کی نسبت ہم کو کسی قسم کی دروغ گوئی کا تجربہ نہیں ہوا، جب آپ نے یہ اقرار لے لیا تو فرمایا۔

انی نذیر لکم بین یدی عذاب شدید۔

میں تمہیں ایک ایسے سخت عذاب سے ڈراتا ہوں جو تمہارے سامنے ہے۔

---

[1] صحیح مسلم باب تخفیف الصلوٰۃ والخطبہ صفحہ ۳۱۹ ج ۱۔ [2] ابن ماجہ ذکر المبعث [3] مسند ابن حنبل ج ۶ صفحہ ۲۰۲۔

ابولہب نے نہایت استخفاف کے ساتھ کہا، کیا ہم سبھوں کو اسی لئے جمع کیا تھا، یہ کہہ کر چل کھڑا ہوا۔

غزوۂ حنین میں آپ نے تمام مالِ غنیمت مؤلفۃ القلوب کو دے دیا اور انصار بالکل محروم رہ گئے تو چند نوجوانوں کو یہ نہایت ناگوار ہوا اور انھوں نے کہا خدا پیغمبر کی مغفرت کرے، قریش کو دیتا ہے اور ہم کو چھوڑ دیتا ہے حالانکہ ہماری تلواروں سے خون ٹپک رہا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو تمام انصار کو ایک خیمہ میں جمع کر کے اصل حقیقت دریافت فرمائی۔ لوگوں نے کہا چند نوجوانوں نے یہ کہا ہے، لیکن ہم میں جو لوگ صاحب الرائے اور سردار ہیں، انہوں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اب آپ نے اس موقع پر کھڑے ہو کر ایک خطبہ دیا۔

یا معشر الانصار الم اجدکم ضلالا فھداکم اللہ بی وکنتم متفرقین فالفکم اللہ بی وعالۃ فاغناکم اللہ بی۔

اے گروہِ انصار! کیا میں نے تم کو گمراہ نہیں پایا پس خدا نے میری وجہ سے تمہیں ہدایت دی، تم متفرق تھے، خدا نے میری وجہ سے تم کو مجتمع کر دیا، تم محتاج تھے، خدا نے میری وجہ سے تم کو غنی کر دیا۔

انصار ہر بات پر کہتے جاتے تھے "خدا اور اس کا رسول بہت امین ہے۔" آپ نے فرمایا "یہ کیوں نہیں کہتے کہ اے محمدؐ! تم اس حالت میں آئے تھے کہ لوگ تمہاری تکذیب کرتے تھے، ہم نے تمہاری تصدیق کی، تمہارا کوئی مددگار نہ تھا، ہم نے تمہاری مدد کی، تم گھر سے نکالے ہوئے تھے، ہم نے تم کو گھر دیا، تم محتاج تھے، ہم نے تمہاری غمخواری کی۔" اس کے بعد آپ نے اصل اعتراض کا جواب دیا۔

ترضون ان یذھب الناس بالشاۃ والبعیر وتذھبون بالنبی الی رحالکم فواللہ لما تنقلبون بہ خیر مما ینقلبون۔

کیا تم یہ نہیں پسند کرتے کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے کے جائیں اور تم اپنے گھروں میں خود پیغمبر کو لے کر جاؤ، خدا کی قسم تم لوگ جو لیکر واپس جاتے ہو وہ اس سے بہتر ہے جو تمام لوگ لے کر جاتے ہیں۔

اس پر تمام انصار پکار اٹھے "رضینا" یعنی ہم سب راضی ہیں۔[1] اس خطبہ کے وجوہ بلاغت پر اگر غور کیا جائے تو ایک مختصر سا رسالہ تیار ہو سکتا ہے۔ فاتحانہ حیثیت سے آپ نے صرف فتح مکہ کے موقع پر ایک تقریر کی تھی جس کے جستہ جستہ فقرے احادیث کی کتابوں میں مذکور ہیں، مکہ عرب کے نزدیک نہایت مقدس شہر تھا، حرم ایک دار الامان تھا جس میں کبھی خونریزی نہیں ہو سکتی تھی۔ فتح مکہ میں سب سے پہلے اس کے دامنِ عظمت پر خون کا دھبہ لگایا گیا اور چونکہ مذہب کے ہاتھ سے لگایا گیا تھا اس لئے خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ ہمیشہ کے لئے اس کا یہ احترام نہ مٹ جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان ہی دونوں پہلوؤں پر اپنی تقریر میں زور دینا تھا، چنانچہ آپ نے بہ ترتیب ان ہی کی طرف توجہ کی۔ سب سے پہلے آپ نے صحابہ کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا۔

ان اللہ حرم مکۃ یوم خلق السمٰوٰت والارض فھی حرام بحرام اللہ الی یوم القیامۃ لم تحل لاحد قبلی ولا تحل لاحد بعدی ولم تحلل لی قط الا ساعۃ من الدھر لا ینفر صیدھا ولا یعضد شوکھا ولا یختلی

خدا نے جس دن آسمان اور زمین کو پیدا کیا اسی دن مکہ کو حرام کر دیا پس وہ بحرمتِ خدا حرم ہے وہ میرے پہلے نہ کسی پر حلال ہوا اور نہ میرے بعد حلال ہوگا اور میرے لئے بھی بجز چند گھنٹوں کے ہرگز حلال نہیں ہوا نہ اس کے شکاروں کو بھگایا جا سکتا نہ اس کا کانٹا کاٹا جا سکتا نہ اس کی گھاس کاٹی جا سکتی

---

[1] بخاری جلد ۲ صفحہ ۷۴۳ تفسیر سورۂ تبت [2] صحیح بخاری غزوۂ حنین۔

خلاہا ولا تحل لقطتہا الا لمنشد۔ | سکتی نہ اس کی گھاس، وہ چیز حلال ہو سکتی ہے بجز اس شخص کے جو اس کو ڈھونڈھتا ہے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے مہتم بالشان خطبہ وہ ہے جو آپ نے حجۃ الوداع میں دیا تھا، یہ خطبہ صرف احکام کا ایک سادہ مجموعہ ہے جس کو قدرتاً خشک اور روکھا پھیکا ہونا چاہیئے، تاہم سلاست روانی اور شستگی الفاظ کے لحاظ سے یہ خطبہ بھی اور خطبوں سے کم نہیں، آپ نے حمد و نعت کے بعد اس خطبہ کی اہمیت اسی طرح ظاہر کی،

ایہا الناس اسمعوا فانی لا ادری لعلی لا القاکم بعد عامی ہذا فی موقفی ہذا فی شہرکم ہذا فی بلدکم ہذا

لوگو! سنو! کیونکہ شاید میں اس سال کے بعد اس جگہ اس مہینہ میں اس شہر میں تم سے نہ مل سکوں۔

سادہ سا جملہ یہ تھا کہ غالباً یہ میری عمر کا آخری سال ہے، لیکن اس تفصیل اور اس پیرایۂ بیان نے اس مفہوم کو اور بھی زوردار بنا دیا ہے، آپ نے فرمایا کہ مسلمانوں کی عزت و آبرو، جان، مال سب مسلمانوں پر حرام ہے اس مطلب کو اس بلیغ طریقہ سے ادا کیا ہے۔

اتدرون ای یوم ہذا قالوا اللہ و رسولہ اعلم قال فان ہذا یوم حرام اتدرون ای بلد ہذا قالوا اللہ و رسولہ اعلم قال بلد حرام قال اتدرون ای شہر ہذا قالوا اللہ و رسولہ اعلم قال شہر حرام

کیا جانتے ہو کہ یہ کون سا دن ہے؟ لوگوں نے کہا خدا اور رسول کو اس کا علم ہے، آپ نے فرمایا یہ یوم الحرام ہے، کیا جانتے ہو کہ یہ کون سا شہر ہے؟ لوگوں نے کہا خدا اور رسول کو اس کا علم ہے، آپ نے کہا بلد الحرام ہے، کیا جانتے ہو کہ یہ کون سا مہینہ ہے؟ لوگوں نے کہا خدا اور رسول کو اس کا علم ہے آپ نے فرمایا شہر حرام ہے۔

اس طرح جب لوگوں کے دل میں اس دن اس مہینہ اور اس شہر کی حرمت کا خیال تازہ ہو گیا تو آپ نے اصل مقصود کو بیان کیا۔

ان اللہ حرم علیکم دماءکم واموالکم واعراضکم کحرمۃ یومکم ہذا فی شہرکم ہذا فی بلدکم ہذا لا ترجعوا بعدی کفارا یضرب بعضکم رقاب بعض

خدا نے تمہارا خون، تمہارا مال، تمہاری آبرو، تم پر اس مہینہ میں اس شہر میں، اس دن کی حرمت کی طرح حرام کیا، میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ تم میں ہر ایک دوسرے کی گردن مارے۔

آپ نے ان الفاظ میں مساوات کی تعلیم دی ہے۔

ان ربکم واحد و ان اباکم واحد کلکم من آدم و آدم من تراب ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔

تمہارا خدا ایک، تمہارا باپ ایک، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی کے تھے، خدا کے نزدیک تم میں شریف تر وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

عرب کا عام ذریعہ معاش غارت گری تھی، لیکن شہر حرام کے چار مہینے تک وہ لوگ بیکار نہیں رہ سکتے تھے اس لئے ان مہینوں کو ادل بدل کیا کرتے تھے جس کو نسی کہتے تھے، قرآن مجید نے اس کی ممانعت کی

انما النسی زیادۃ فی الکفر۔ | نسی کفر میں اضافہ کرتا ہے

آپ نے اپنے خطبہ میں اس کا اعلان ان الفاظ میں فرمایا۔

ان الزمان قد استدار کہیئتہ یوم خلق اللہ السموات والارض۔

زمانہ ہیر پھیر کے پھر اسی مرکز پر آ گیا جیسا کہ اس دن تھا جب خدا نے آسمان و زمین کو پیدا کیا تھا۔

ان حیثیتوں کے علاوہ آپ کی حیثیت ایک معلم اور واعظ کی تھی، آپ نے اس حیثیت سے جو خطبے دیئے ہیں وہ اگرچہ نہایت سادہ ہیں، تاہم ان میں بھی مجموعی بلاغت کا اسلوب موجود ہے، ایک اخلاقی وعظ کے لئے پیچ دار ترکیب، شاندار الفاظ اور تشبیہ و استعارہ کی ضرورت نہیں ہوتی، اس کو صرف سادہ الفاظ، واضح جملے اور مختصر ترکیبوں سے مطالب کو ذہن نشین کرنا پڑتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حیثیت سے جو خطبے دیئے ہیں وہ تمام تر اسی قسم کے ہیں، مدینہ آ کر سب سے پہلا فقرہ جو زبان مبارک سے نکلا یہ تھا۔

یا ایہا الناس افشوا السلام واطعموا الطعام وصلوا والناس نیام تدخلوا الجنۃ بسلام۔

لوگو! اسلام پھیلاؤ، کھانا کھلایا کرو، نماز پڑھا کرو جب لوگ سوتے ہیں، جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ گے۔

مدینہ میں جو سب سے پہلا جمعہ آپ نے پڑھا ہے، ابن اسحاق کی روایت کے مطابق حمد و ثنا کے بعد اس میں آپ نے یہ خطبہ دیا تھا۔

اما بعد ایہا الناس فقدموا لانفسکم تعلمن واللہ لیصعقن احدکم ثم لیدعن غنمہ لیس لہا راع ثم لیقولن لہ ربہ لیس لہ ترجمان ولا حاجب یحجبہ دونہ الم یاتک رسولی فبلغک وآتیتک مالا وافضلت علیک فما قدمت لنفسک فلینظرن یمینا وشمالا فلا یری شیئا ثم لینظرن قدامہ فلا یری غیر جہنم فمن استطاع ان یقی وجہہ من النار ولو بشق من تمرۃ فلیفعل ومن لم یجد فبکلمۃ طیبۃ فانہا تجزی الحسنۃ بعشر امثالہا الی سبع مائۃ ضعف والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

حمد و ثنا کے بعد، لوگو! اپنے لئے پہلے سے سامان کر لو، تم کو معلوم ہو جائے گا کہ خدا کی قسم تم میں سے ایک جب اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے گا اور اپنی بکریوں (مال و دولت) کو چھوڑ جاوے گا جن کا کوئی نگہبان نہ ہو گا، پھر خدا اس سے کہے گا اور بیچ میں نہ کوئی ترجمان ہے نہ دربان ہے جو روک سکے گا، کیا تیرے پاس میرا فرستادہ نہیں آیا اور میرا پیغام نہیں پہنچایا اور میں نے تم کو دولت نہیں دی اور حاجت سے زیادہ نہیں عطا کیا تو تو نے اپنے لئے پہلے سے کیا سامان کیا، اس وقت وہ بندہ دائیں بائیں دیکھے گا تو اس کو کچھ نظر نہیں آسکے گا، اپنے سامنے دیکھے گا تو جہنم کے سوا اس کو کوئی چیز نظر نہیں آئے گی، جس جس کو قدرت ہو وہ اپنے کو اس آگ سے بچائے گو چھوہارے کے ایک ٹکڑے ہی سے کیوں نہ ہو، اگر کسی کے پاس یہ بھی نہ ہو تو ایک اچھی اور خوش اخلاقی کی بات ہی سے، کیونکہ ایک نیکی کا بدلہ دس گنا بلکہ سات سو گنا دیا جائے گا، تم کو سلامتی اور اس کی رحمت و برکت نازل ہو۔ (صحیح مسلم بروایت [illegible])

اس کے بعد دوسری دفعہ آپ نے فرمایا۔

الحمد للہ احمدہ واستعینہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یہدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضلل فلا ہادی لہ واشہد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ان احسن الحدیث کتاب اللہ قد افلح من زینہ اللہ فی قلبہ وادخلہ فی الاسلام بعد الکفر واختارہ علی ما سواہ من

خدا کی حمد ہو، میں خدا کی حمد کرتا ہوں اور اسکے دامن میں ہم اپنے نفس کی برائیوں اور اپنے اعمال کی خرابیوں سے پناہ چاہتے ہیں، جس کو خدا ہدایت دے اس کو کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جس کو وہ ہدایت نہ دے اس کا کوئی رہنما نہیں، میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی اور معبود نہیں وہ تنہا ہے کوئی اس کا شریک نہیں، بہترین کلام خدا کی کتاب ہے، کامیاب ہوا جس کے دل کو خدا نے اس سے آراستہ کیا اور اس کو کفر کے بعد اسلام میں داخل کیا، انسانوں کی باتوں کو

احادیث الناس انہ احسن الحدیث وابلغہ احبوا ما احب اللہ احبوا اللہ من کل قلوبکم ولا تملوا کلام اللہ وذکرہ ولا تقس عنہ قلوبکم فاعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئا واتقوہ حق تقاتہ واصدقوا اللہ صالح ما تقولون بافواھکم وتحابوا بروح اللہ بینکم ان اللہ یغضب ان ینکث عہدہ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

چھوڑ کر خدا کے کلام کو پسند کیا کیونکہ خدا کا کلام سب سے زیادہ بہتر اور سب سے زیادہ پُر اثر ہے، جس کو خدا دوست رکھتا ہے تم بھی دوست رکھو اور خدا کو دل سے پیار کرو اور اسکے کلام اور ذکر سے کبھی نہ تھکو اور تمہارے دل اس کی طرف سے سخت نہ ہوں بس خدا ہی کو پوجو، اور کسی کو اس کا ساجھی نہ بناؤ اور اس سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور خدا سے سچی بات کہو اور آپس میں ایک دوسرے کو ذات الٰہی کے واسطے پیار کرو، خدا اس سے ناراض ہوتا ہے کہ کوئی اپنے عہد کو پورا نہ کرے تم پر خدا کی سلامتی اور رحمت اور برکت نازل ہو۔

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا جس میں صرف پانچ باتیں بیان کیں۔

ان اللہ لا ینام ولا ینبغی لہ ان ینام یخفض القسط ویرفعہ الیہ عمل اللیل قبل عمل النہار وعمل النہار قبل عمل اللیل حجابہ النور (صحیح مسلم، روایۃ انہ تعالیٰ)

ہاں خدا سوتا نہیں اور نہ سونا اس کی ذات کے شایان شان ہے وہی قسمت کو پست و بلند کرتا ہے، رات کے اعمال اس کو دن سے پہلے پہنچ جاتے ہیں اور دن کے اعمال رات سے پہلے، خدا کا پردہ نور ہے۔

جمعہ کے خطبہ میں عموماً زہد و رقاق، حسن اخلاق، خوف قیامت، عذاب قبر، توحید و صفات الٰہی بیان کرتے تھے، اثنا میں کوئی مہتم بالشان واقعہ پیش آ جاتا تو اس کے متعلق ہدایت فرماتے تھے، اکثر ایسا بھی کرتے کہ نفس خطبہ کے بجائے قرآن مجید کے انہی مضامین کی کوئی مؤثر سورت ق وغیرہ پڑھ دیا کرتے۔ یہ سورہ آپ جمعہ کے خطبہ میں اکثر و بیشتر پڑھا کرتے تھے، عید کے خطبہ میں ان مضامین کے علاوہ صدقہ پر خاص طور پر زور دیتے تھے، اتفاقی خطبے ضرورت کے موقع پر دیا کرتے تھے اور ان میں مقتضائے وقت کے مناسب مطالب بیان فرماتے تھے، ایک دفعہ آفتاب میں گہن لگا، اتفاق سے اسی دن آپ کے کم سن فرزند حضرت ابراہیمؑ نے وفات پائی تھی، مزعومات عرب کے مطابق لوگوں نے کہا کہ یہ گہن اسی لئے لگا ہے، آپ نے اس موقع پر حسب ذیل خطبہ دیا۔

اما بعد یا ایہا الناس انما الشمس والقمر آیتان من آیات اللہ وانہما لا ینکسفان لموت احد من الناس۔

حمد و ثنا کے بعد، لوگو! آفتاب و ماہتاب خدا کی دو نشانیاں ہیں وہ کسی کے مرنے سے تاریک نہیں ہوتے۔

ما من شیء لم اکن رأیتہ الا قد رأیت فی مقامی ہذا حتی الجنۃ والنار وانہ قد اوحی الی انکم تفتنون فی القبور مثل فتنۃ الدجال فیؤتی احدکم فیقال ما علمک بہذا الرجل فاما المؤمن فیقول ہو محمد ہو رسول اللہ جاء بالبینات والہدی فاجبنا واطعنا واما المرتاب فیقول لا ادری سمعت الناس یقولون شیئا فقلتہ عُرِضَ علیَّ کلُّ شیءٍ تولجونہ فعُرِضَتْ علیَّ الجنۃ حتی لو تناولت منہا قطفا اخذتہ فقصر یدی

جس چیز کو میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا اس کو یہیں دیکھ لیا یہاں تک کہ جنت و دوزخ کو بھی اور ہاں مجھے وحی کی گئی ہے کہ تم قبروں میں آزمائے جاؤ گے، تم میں سے ہر ایک شخص کے پاس ایک آنے والا آئے گا اور پوچھے گا کہ اس شخص (یعنی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کی نسبت کیا جانتے ہو، یقین والے کہیں گے کہ یہ محمد ہیں، یہ خدا کے رسول ہیں، جو نشانیاں اور ہدایتیں لے کر آئے تو ہم نے ان کو قبول کیا اور ان کی پیروی کی اور شک والے کہیں گے میں نہیں جانتا لوگوں کو جو کہتے سنا کہہ دیا، میرے سامنے وہ تمام مقامات پیش ہوئے جن میں تم داخل ہوگے، تا آنکہ اگر میں چاہتا تو اس

منہ وعرضت علی النار فرأیت فیہا امرأۃ تعذب فی ہرۃ لہا ربطتہا فلم تطعمہا ولم تدعہا تأکل من خشاش الارض ورأیت ابا ثمامۃ عمرو بن مالک یجر قصبہ فی النار وانہم کانوا یقولون ان الشمس والقمر لا ینخسفان الا لموت عظیم وانہما آیتان من آیات اللہ یریکموہما فاذا خسفا فصلوا حتی تنجلی۔[۱]

کا پھل توڑ لیتا لیکن میرے ہاتھ رک گئے، دوزخ میرے سامنے رونما کی گئی اس میں ایک عورت کو دیکھا جس کو صرف اسلئے سزا دی جا رہی تھی کہ اس نے ایک بلی کو باندھ رکھا تھا نہ اس کو خود کچھ کھانے کو دیتی تھی اور نہ چھوڑتی تھی کہ وہ زمین کی گری پڑی کوئی چیز کھاتے، میں نے دوزخ میں ابو ثمامہ عمرو بن مالک کو دیکھا تو یہ وہ لوگ تھے جو کہتے تھے کہ آفتاب و ماہتاب میں کسی بڑے آدمی کی موت سے گہن لگتا ہے حالانکہ وہ تو خدا کی دو نشانیاں ہیں، جب تم گہن دیکھو تو نماز کے لئے کھڑے ہو جاؤ تاکہ وہ صاف ہو جائے۔

ردِ بدعت اور اعتصام بالسنۃ میں آپ کا یہ مختصر خطبہ بتغیر الفاظ حدیث کی اکثر کتابوں میں منقول ہے۔

انما ہما اثنتان الکلام والہدی فاحسن الکلام کلام اللہ واحسن الہدی ہدی محمد الا وایاکم ومحدثات الامور فان شر الامور محدثاتہا وکل محدثۃ بدعۃ وکل بدعۃ ضلالۃ الا لا یطولن علیکم الامد فیقسو قلوبکم الا ان ما ہو آت قریب وانما البعید ما لیس بآت الا انما الشقی من شقی فی بطن امہ والسعید من وعظ بغیرہ الا ان قتال المؤمن کفر وسبابہ فسوق ولا یحل لمسلم ان یہجر اخاہ فوق ثلاث الا وایاکم والکذب (ابن ماجہ، باب اجتناب البدع)

صرف دو باتیں ہیں قول اور عمل طریقہ، تو عمدہ کلام خدا کا کلام ہے اور عمدہ طریقہ محمد کا طریقہ ہے، خبردار (مذہب میں) نئی باتوں سے بچو، نئی باتیں بدترین چیزیں ہیں، ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے، تم کو درازی عمر کا خیال نہ پیدا ہو کہ تمہارے دل سخت ہو جائیں اور جو چیز آنے والی ہے وہ قریب ہے، دور وہ چیز ہے جو آنے والی نہیں ہے، بدبخت اپنی ماں کے پیٹ میں بدبخت ہوتا ہے، خوش نصیب وہ ہے جو غیر سے موعظت حاصل کرے، خبردار، مسلمان سے لڑنا کفر اور اس سے گالی گلوچ کرنا فسق ہے، مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی سے رنجیدہ رہے، ہاں خبردار جھوٹ سے پرہیز کرنا۔

اثر انگیزی

خطبات نبوی تاثیر اور رقت انگیزی میں درحقیقت معجزۂ الٰہی تھے، پتھر سے پتھر دل بھی ان کو سن کر چند لمحوں میں موم ہو جاتے تھے، مکہ میں ایک دفعہ آپ نے سورۂ والنجم کی آیتیں تلاوت کر کے سنائیں تو یہ اثر ہوا کہ آپ کے ساتھ مسلمان تو مسلمان بڑے بڑے کفار بھی سجدہ میں گر پڑے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ جاہلیت کے ایک دوست جو جھاڑ پھونک کرنا جانتے تھے، یہ سن کر کہ نعوذ باللہ آپ کو جنون ہے، بغرض علاج آئے۔ آپ نے ان کے سامنے مختصر سی تقریر کی، انہوں نے کہا محمد ذرا اس کو پھر تو دہرانا، غرض آپ نے کئی دفعہ تقریر دہرائی تو انہوں نے کہا میں نے شاعروں کے قصیدے اور کاہنوں کے کلام سنے ہیں، لیکن یہ تو چیز ہی اور ہے۔[۲]

ایک دفعہ ایک نو مسلم قبیلہ ہجرت کر کے مدینہ آیا، آپ نے ان کی امداد کی ضرورت سمجھی، مسجد نبوی میں تمام

۱؎ صحیح مسلم ابواب [illegible] ۲؎ صحیح مسلم باب تخفیف الصلوٰۃ و قصر الخطبہ ۳؎ صحیح مسلم باب تخفیف الصلوٰۃ و قصر الخطبہ۔

مسلمان جمع ہوئے تو آپ نے ایک خطبہ دیا جس میں قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی کہ تمام انسان ایک ہی نسل سے ہیں، یعنی۔

يَآيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ۔

اے لوگو! اس خدا سے ڈرو جس نے ایک ذات سے تم سب کو پیدا کیا۔

پھر سورۂ حشر کی یہ آیت تلاوت کی۔

وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ لِغَدٍ۔

اس کے بعد فرمایا، درہم، کپڑا، غلہ، بلکہ چھوہارے کا ایک ٹکڑا جو ہو، راہ خدا میں دو۔ مدینہ کے مسلمانوں کی مالی حالت جیسی تھی، وہ سیرت کے ہر صفحہ سے ظاہر ہے، لیکن باایں ہمہ آپ کی رقت انگیز اور مؤثر تقریر سے یہ عالم پیدا ہو گیا کہ ہر صحابی کے پاس جو کچھ تھا، اس نے سامنے رکھ دیا، بعضوں نے اپنے کپڑے اتار دیئے، کسی نے گھر کا غلہ لاکر دے دیا، ایک انصاری گئے اور گھر سے اشرفیوں کا ایک توڑا اٹھا لائے جو اس قدر بھاری تھا کہ بمشکل ان سے اٹھ سکتا تھا۔ راوی کا بیان ہے کہ تھوڑی دیر کے بعد آپ کے سامنے غلہ اور کپڑے کے دو بڑے بڑے ڈھیر لگ گئے اور خوشی سے آپ کا چہرہ کندن کی طرح دمکنے لگا۔[1]

سخت سے سخت اشتعال انگیز موقعوں پر آپ کے چند فقرے معاملہ کو رفع دفع کر کے جوش محبت کا دریا بہا دیتے تھے۔ اوس و خزرج کی سالہا سال کی عداوتیں اسی اعجاز کی بدولت مبدل بہ محبت ہو گئیں، غزوہ بدر سے پہلے ایک دفعہ سوار ہو کر نکلے اور منافقین یکجا بیٹھے ہوئے تھے، مسلمانوں نے تو ادب سے سلام کیا، لیکن منافقین نے ایک گستاخانہ فقرہ استعمال کیا، یہ چنگاری تھی جس نے خرمن میں آگ لگا دی، قریب تھا کہ جنگ و جدل برپا ہو جائے، لیکن آپ کے چند فقروں نے آگ پر پانی ڈال دیا،[2] غزوہ مصطلق سے واپسی میں ایک واقعہ پر منافقین نے اشتعال پیدا کیا اور بہت جلد ممکن تھا کہ مہاجرین و انصار باہم دست و گریباں ہو جائیں کہ عین وقت پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی، آپ تشریف لائے تو اس طرح تقریر فرمائی کہ چند لحظوں میں مہاجرین و انصار پھر شیر و شکر تھے،[3] واقعۂ افک میں اوس و خزرج میں اس قدر اختلاف پیدا ہوا کہ خاص مسجد نبوی میں شاید تلواریں نیام سے نکل پڑتیں، آپ منبر پر تشریف فرما تھے، آپ نے سلسلہ تقریر جاری رکھا اور اثر یہ تھا کہ برادرانہ محبت کی لہریں پھر جاری ہو گئیں۔[4]

غزوۂ حنین میں جب مال غنیمت کی تقسیم پر انصار میں آزردگی پیدا ہو گئی تھی، اس وقت آپ نے جس بلیغانہ انداز میں تقریر فرمائی ہے اس کا مختصر سا ذکر اوپر گزر چکا ہے، اس تقریر کا کیا اثر ہوا؟ یہ ہوا کہ وہی انصار جو چند لمحے پہلے کبیدہ خاطر ہو رہے تھے اس قدر روئے کہ ان کی داڑھیاں تر ہو گئیں اور دل کا سارا غبار آب کوثر کے ان قطروں سے دفعۃً دھل گیا۔ فتح مکہ کے موقع پر انصار کی توقع کے خلاف جب آپ نے رؤسائے قریش کی جان بخشی فرمائی تو ان میں سے وہ لوگ جن کی آنکھوں میں خلق نبوی کا جلوہ نہ تھا معترض ہوئے کہ آخر آپ کو اپنے وطن و خاندان سے محبت

[1] صحیح مسلم باب الصدقات۔ [2] صحیح بخاری السلام علی جماعۃ فیہا المسلم والکافر۔ [3] صحیح بخاری تفسیر منافقین و ابن سعد غزوہ مذکور۔ [4] صحیح بخاری قصۂ افک۔ [5] صحیح مسلم فتح مکہ۔

آہی گئی، آپ کو یہ معلوم ہوا تو تمام انصار کو جمع کر کے دریافت کیا کہ کیا یہ سچ ہے کہ تم نے ایسا کہا ہے، عرض کی ہاں یارسول اللہ! فرمایا، وطن و خاندان کی پاسداری میرے پیش نظر نہ تھی، میں خدا کا بندہ اور اس کا فرستادہ ہوں، میں نے اللہ کی طرف ہجرت کی اور تمہاری طرف، اب میرا جینا تمہارا جینا ہے اور میرا مرنا تمہارا مرنا ہے، یہ سن کر انصار پر رقت طاری ہو گئی اور رونے لگے۔ وعظ و نصیحت میں جو خطبات آپ ارشاد فرماتے تھے وہ بھی اسی قدر مؤثر ہوتے تھے ایک صحابی موقع کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔

وعظنا رسول الله صلى الله عليه وسلم يوما بعد الصلوٰة الغداة موعظة بليغة ذرفت منها العيون ووجلت منها القلوب (ترمذی و ابوداؤد)

صبح کی نماز کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن ایسا مؤثر وعظ کہا کہ آنکھیں اشک ریز ہو گئیں اور دل کانپ اٹھے۔

ایک اور مجلس وعظ کے تاثیر کی کیفیت حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ بیان کرتی ہیں۔

قام رسول الله صلى الله عليه وسلم خطيبا فذكر فتنة القبر التي يفتتن بها المرء فلما ذكر ذلك ضج المسلمون ضجة۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کو کھڑے ہوئے اور اس میں فتنۂ قبر کو بیان کیا جس میں انسان کی آزمائش کی جائے گی جب یہ بیان کیا تو مسلمان چیخ اٹھے۔

حضرت ابوہریرہؓ اور ابوسعیدؓ سے مروی ہے کہ ایک دفعہ آپ خطبہ دے رہے تھے کہ آپ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلے والذی نفسی بیدہٖ قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے۔ یہ الفاظ آپ نے تین دفعہ فرمائے اور پھر جھک گئے۔ لوگوں پر یہ اثر ہوا کہ جو جہاں تھا وہیں سر جھکا کر رونے لگا۔ راوی کہتے ہیں کہ ہم کو بھی ہوش نہ رہا کہ آپ قسم کس بات پر کھا رہے ہیں۔

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ایک دن آپ نے خطبہ دیا، یہ خطبہ اس قدر مؤثر تھا کہ میں نے ایسا خطبہ نہیں سنا۔ اثنائے تقریر میں آپ نے فرمایا، اے لوگو! جو میں جانتا ہوں اگر تم وہ جانتے تو ہنستے کم اور روتے زیادہ۔ اس فقرہ کا ادا ہونا تھا کہ لوگوں کی یہ حالت ہو گئی کہ منہ پر کپڑے ڈال کر بے اختیار رونے لگے۔

٭

[1] صحیح بخاری [illegible] تفسیر سورۃ المائدہ۔

عبادات نبویؐ

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ۔

(اے محمدؐ! جب تجھے فرصت ملے عبادت کے لئے کھڑے ہو جاؤ اور اپنے رب سے دل لگاؤ)

دنیا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کوئی ایسا پیغمبر نہیں گزرا جس کے متعلق صحیح طور پر یہ معلوم ہو سکے کہ اس کا طریقہ عبادت کیا تھا اور اس کے کون کون سے اوقات اس کے لئے مخصوص تھے اور اس کی عبادتوں کی نوعیت کیا تھی؟ گزشتہ انبیاء میں حضرت نوحؑ، بلکہ آدمؑ سے لے کر حضرت موسیٰؑ تک جن کے حالات تورات میں مذکور ہیں، ان کی زندگی کا یہ باب صحائف بنی اسرائیل سے قطعاً مفقود ہے۔ انجیل میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق کہیں کہیں صرف اس قدر ملتا ہے کہ وہ کبھی کبھی دعائیں مانگا کرتے تھے، لیکن جب کہ ان مذاہب کے پیروؤں نے اپنے پیغمبروں کے ساتھ اس قدر بے اعتنائی برتی ہے کہ یہ ضروری امور بھی جن پر دین و شریعت کا دار و مدار ہے، وہ محفوظ نہیں رکھ سکے، پیروانِ اسلام کو یہ فخر ہے کہ انہوں نے اول سے آخر تک اپنے پیغمبر کے اوقات عبادات، اس کے طریقے، اس کے انواع، اس کی کیفیات، غرض اس کے ایک ایک جزئیات کو محفوظ رکھا ہے۔

دعا اور نماز

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے پہلے بھی عبادت الٰہی میں مصروف رہتے تھے اور غار حرا میں جا کر مہینوں قیام اور مراقبہ کرتے تھے، نبوت کے ساتھ ساتھ آپؐ کو نماز کا طریقہ بھی بتایا گیا لیکن چونکہ کفار قریش کا ڈر تھا اس لئے چھپ کر نماز ادا کرتے تھے، نماز کا وقت جب آتا کسی پہاڑ کی گھاٹی میں چلے جاتے اور وہاں نماز پڑھ لیتے۔ ایک دفعہ آپؐ حضرت علیؓ کے ساتھ کسی درہ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ اتفاق سے ابوطالب آنکلے۔ انہوں نے دیکھا تو پوچھا بھتیجے! یہ تم کیا کر رہے ہو؟ آپؐ نے ان کو اسلام کی دعوت دی۔

چاشت کی نماز آپؐ سب کے سامنے حرم ہی میں ادا کرتے تھے، کیونکہ یہ نماز قریش کے مذہب میں بھی جائز تھی۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ایک دن آپؐ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے اور رؤسائے قریش بیٹھے تمسخر اڑا رہے تھے، ابوجہل نے کہا: کاش اس وقت کوئی جاتا اور اونٹ کی اوجھ نجاست سمیت اٹھا لاتا اور محمدؐ جب سجدہ میں جاتے تو وہ ان کی گردن پر ڈال دیتا۔ چنانچہ اس تجویز کے مطابق یہ فرض عقبہ نے انجام دیا۔ نماز میں جب آپؐ جہر سے قرأت فرماتے تو کفار برا بھلا کہتے۔ ایک دفعہ آپؐ حرم میں نماز ادا کر رہے تھے۔ بعض اشقیاء نے چاہا کہ آپؐ کے ساتھ گستاخی سے پیش آئیں، ایک دفعہ ایک شقی نے گلے میں پھانسی ڈال دی۔ لیکن با ایں ہمہ مزاحمت لذت شناس یادِ الٰہی اپنے فرض سے باز نہیں آتا تھا۔

راتوں کو اٹھ اٹھ کر آپؐ نمازیں پڑھا کرتے تھے، اس عبادت شبانہ کے مختلف صحابہ سے مختلف روایتیں

۱ اضافہ ناتمام باب ۲ صحیح بخاری باب بدء الوحی ۳ مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۴ ابن اثیر ۵ صحیح بخاری باب الطہارۃ والصلوٰۃ ۶ صحیح بخاری تفسیر سورۂ بنی اسرائیل ۷ ابن ہشام ذکر قبل ہجرت ۸ صحیح بخاری باب ما لقی النبی بمکہ۔

ہیں۔ ایک راوی کا بیان ہے کہ آپؐ رات بھر نماز میں کھڑے رہے۔ ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ آپؐ کچھ دیر سوتے، پھر کچھ دیر اٹھ کر نماز میں مصروف ہوتے، پھر سو جاتے، پھر اٹھ بیٹھتے اور نماز ادا کرتے۔ غرض صبح تک یہی حالت قائم رہتی۔ ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ آدھی رات کے بعد آپؐ اٹھتے تھے اور تیرہ رکعتیں ادا کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ۹ رکعت کی ہے۔ محدثین نے ان سب میں تطبیق دی ہے کہ آپؐ ان طریقوں میں سے ہر ایک طریقہ سے نماز ادا کرتے تھے، ہر راوی نے اپنا مشاہدہ بیان کیا ہے۔ عام طور پر آخر میں آپؐ کا طرز عمل وہی تھا جو حضرت عائشہؓ اور ابن عباسؓ کی زبانی عبادت شبانہ کے عنوان سے گزر چکا ہے۔

فرائض پنجگانہ کے علاوہ آپؐ کم از کم سنن و نوافل کی ۳۹ رکعتیں روزانہ معمولاً ادا کرتے تھے۔ دو صبح، چار چاشت، چھ ظہر، چھ عصر، چار پہلے اور دو بعد نماز (حسب روایت حضرت عائشہؓ) دو مغرب، چھ عشاء، تیرہ عشاء و وتر۔ ان کے علاوہ صلوٰۃ الاوابین، سنت تحیت مسجد وغیرہ الگ تھیں۔ تمام سنن میں سب سے زیادہ صبح کی دو رکعتوں کے آپؐ سختی سے پابند تھے، کسی وقت کی سنت خلاف معمول اگر چھوٹ جاتی تو اس کی قضا پڑھتے۔ حالانکہ اصل شریعت کی رو سے اس کی ضرورت عام امت کے لئے نہیں۔ ایسا واقعہ حضر میں صرف ایک ہی دفعہ پیش آیا ہے۔ ظہر و عصر کے درمیان ایک وفد خدمت اقدس میں باریاب ہوا جس کی وجہ سے آپؐ ظہر کے بعد کی دو رکعت نہ پڑھ سکے، نماز عصر کے بعد آپؐ نے بعض ازواج مطہرات کے حجروں میں جا کر دو رکعت نماز ادا کی، چونکہ یہ نماز بالکل خلاف معمول تھی، اس لئے ازواج مطہرات نے استفسار کیا۔ آپؐ نے واقعہ بیان فرمایا۔ عام امت کے لئے ایک نماز کی قضا ایک دفعہ کافی ہے۔ لیکن آپؐ جس چیز کو شروع کرتے تھے، پھر اس کو ترک کرنا مناسب نہیں فرماتے تھے۔ اس لئے ام المومنین حضرت عائشہؓ اور ام سلمہؓ کا بیان ہے کہ آپؐ نے اس قضا کو تمام عمر ادا کیا۔

رمضان کا مہینہ آپؐ کی عبادتوں کے لئے سب سے زیادہ ذوق افزا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ آپؐ فیاض تو تھے ہی لیکن جب رمضان کا مہینہ آتا اور جبرئیلؑ قرآن سنانے آتے تو آپؐ کی فیاضی کی کوئی حد نہیں رہتی۔ آپؐ کی فیاضی ہوا سے بھی آگے نکل جاتی۔ رمضان کے آخری عشرہ میں آپؐ اور زیادہ عبادت گزار ہو جاتے۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ جب رمضان کا آخری عشرہ آتا تو آپؐ رات رات بھر بیدار رہتے تھے، ازواج سے بے تعلق ہو جاتے تھے، اہل بیت کو نماز کے لئے جگاتے تھے۔ اس اخیر عشرہ میں آپؐ عموماً اعتکاف میں بیٹھا کرتے تھے، یعنی ہر وقت مسجد میں بیٹھ کر یاد الٰہی اور عبادت گزاری میں مصروف رہتے تھے۔

قرآن مجید کی تلاوت روزانہ فرماتے تھے۔ ابوداؤد کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ تلاوت کا وقت نماز عشاء کے بعد تھا۔ روزانہ سورتوں کی تعداد مقرر رہتی۔ اسی تعداد کے موافق آپؐ تلاوت کر لیا کرتے تھے۔ رمضان میں پورے قرآن کا دورہ کرتے تھے۔ پچھلی رات کو اٹھ کر کوئی موثر سورہ یا چند آیات تلاوت کرتے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ رات کو میں نے دیکھا کہ آپؐ پچھلے پہر بیدار ہوئے، آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے، رات کے

۱ اس بحث کو زرقانی نے شرح مواہب میں بتفصیل لکھا ہے۔ ۲ صحیح بخاری ابواب نوافل و سنن ۳ مسند احمد و ابوداؤد ۴ صحیح مسلم الرکعتان بعد العصر ۵ صحیح بخاری کتاب الصوم ۶ ابوداؤد باب الصوم ۷ صحیح بخاری باب الاعتکاف ۸ ابوداؤد شہر رمضان ۹ صحیح بخاری بدء الوحی۔

سناٹے میں تارے جھلملا رہے تھے، آپؐ نے نظر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور یہ آیتیں پڑھیں۔[1]

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۚ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُودًا وَّعَلٰى جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ رَبَّنَا إِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهٗ ۚ وَمَا لِلظّٰلِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ رَبَّنَا إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِي لِلْإِيمَانِ أَنْ اٰمِنُوا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۚ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيعَادَ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقٰتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ (آل عمران ۲۰)

آسمان اور زمین کی پیدائش اور شب و روز کے انقلاب میں ان دانشمندوں کے لئے نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھتے اور پہلو پر لیٹے ہوئے اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین پر غور کرتے ہیں کہ خدایا تو نے یہ نظام عالم بے نتیجہ نہیں پیدا کیا تو پاک ہے پس ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا، خدایا جس کو تو دوزخ میں داخل کرے اس کو تو نے رسوا کر دیا، گنہگاروں کا کوئی مددگار نہیں، خداوندا ہم نے ایک پکارنے والے کی آواز سنی جو پکار کر یہ کہہ رہا تھا کہ اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ تو ہم ایمان لائے، خداوندا تو ہمارے گناہ بخش دے، ہماری برائیوں پر پردہ ڈال اور نیکوں کے ساتھ دنیا سے اٹھا، خداوندا تو نے اپنے رسولوں کے ذریعہ جس چیز کا وعدہ کیا ہے وہ ہم کو عنایت کر اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کرنا تو اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا، پروردگار نے پکار سن لی اور دعا قبول کر لی کہ میں کسی کام کرنے والے کے کام کو ضائع نہیں کرتا، مرد ہو یا عورت تم ایک دوسرے سے ہو، جن لوگوں نے ہجرت کی یا اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے یا اور لڑے میں اور مارے گئے ہیں ان سب کے گناہوں کو مٹا دوں گا اور ان کو جنت میں جگہ دوں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اللہ کی طرف سے ان کو یہ جزا ملے گی اور اللہ ہی کے پاس اچھی چیز ہے۔

اسی موقع پر آپؐ یہ الفاظ بھی کہا کرتے تھے جو سرتاپا روحانیت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

اللّٰھم لک الحمد انت نور السمٰوٰت والارض ولک الحمد انت قیام السمٰوٰت والارض ولک الحمد انت رب السمٰوٰت والارض ومن فیھن انت الحق ووعدک الحق وقولک الحق ولقاءک الحق والجنۃ حق والنار حق والساعۃ حق اللّٰھم لک اسلمت وبک اٰمنت وعلیک توکلت والیک انبت وبک خاصمت والیک حاکمت فاغفرلی ماقدمت واخرت واسررت واعلنت انت الٰھی لا الٰہ الا انت۔

خداوندا تیری حمد ہو تو آسمان و زمین کا نور ہے، تیری حمد ہو تو آسمان و زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب کا پروردگار ہے، تو حق ہے تیرا وعدہ حق ہے تیری بات حق ہے، تجھ سے ملنا حق ہے جنت حق ہے دوزخ حق ہے قیامت حق ہے، خداوندا میں نے تیرے ہی آستانہ پر سر جھکایا ہے، تجھی پر ایمان لایا ہوں، تجھی پر میں نے بھروسہ کیا ہے، تیرے ہی نام پر جھگڑتا ہوں، تجھی سے فیصلہ چاہتا ہوں، تو میرا اگلا اور پچھلا، کھلا اور چھپا ہر ایک گناہ معاف کر، تو ہی میرا معبود ہے تیرے سوا کوئی اور معبود نہیں (صحیح مسلم باب الدعا فی صلوٰۃ اللیل)۔

کبھی گھر کے لوگ جب سو جاتے، آپؐ چپ چاپ بستر سے اٹھتے اور دعا و مناجات الٰہی میں مصروف ہو جاتے

[1] صحیح بخاری و صحیح مسلم صلوٰۃ اللیل۔

حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک رات میری آنکھ کھلی تو آپؐ کو بستر پر نہ پایا، سمجھی کہ آپؐ کسی اور بیوی کے حجرے میں تشریف لے گئے ہیں، اندھیرے میں ادھر ادھر ٹٹولا تو دیکھا کہ پیشانی اقدس خاک پر ہے اور آپؐ سربسجود دعا میں مصروف ہیں، یہ دیکھ کر حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ مجھ کو اپنے شبہ پر ندامت ہوئی اور دل میں کہا، سبحان اللہ! ہم کس خیال میں ہیں اور آپؐ کس عالم میں[1]، کبھی کبھی راتوں کو اٹھ کر آپؐ تن تنہا قبرستان میں تشریف لے جاتے تھے اور دعا و زاری کرتے تھے، ایک دفعہ آپؐ کے پیچھے پیچھے حضرت عائشہؓ گئیں، تو دیکھا کہ آپؐ جنت البقیع میں داخل ہوئے اور دعا مانگی[2]۔

دعا اور نماز کے بعد آپؐ سو جاتے، یہاں تک کہ خراٹے کی آواز سنائی دیتی کہ دفعتہً سپیدہ صبح نمودار ہوتا، آپؐ بیدار ہوتے، صبح کی سنت ادا کر کے مسجد کو تشریف لے جاتے اور اس وقت یہ الفاظ زبان مبارک پر ہوتے۔

اللّٰھم اجعل فی قلبی نورًا وفی لسانی نورًا واجعل فی سمعی نورًا واجعل فی بصری نورًا واجعل فی خلفی نورًا ومن امامی نورًا واجعل من فوقی نورًا ومن تحتی نورًا واعطنی نورًا (صحیح مسلم باب الدعاء فی صلوٰۃ اللیل)

خدایا میرے دل میں نور پیدا کر اور میری زبان میں اور میری قوت سامعہ میں نور پیدا کر، آنکھوں میں نور پیدا کر اور میرے پیچھے اور میرے آگے نور پیدا کر دے، اوپر اور میرے نیچے نور پیدا کر اور مجھے نور عطا کر۔

ارکان نماز میں سب سے کم وقفہ رکوع کے بعد قیام میں ہوتا ہے، لیکن حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رکوع کے بعد اتنی دیر کھڑے رہتے تھے کہ ہم لوگ سمجھتے تھے کہ آپؐ سجدہ میں جانا بھول گئے[3]۔ جو چیز نماز کی حضوری میں خلل ڈالتی تھی اس سے احتراز فرماتے تھے، ایک دفعہ چادر اوڑھ کر نماز ادا فرمائی جس میں دونوں طرف حاشیے تھے، نماز میں اتفاق سے حاشیوں پر نظر پڑ گئی۔ نماز سے فارغ ہو کر فرمایا کہ یہ لے جا کر فلاں شخص (ابوجہم) کو دے دو اور ان سے انبجانی[4] مانگ لاؤ، حاشیوں نے نماز کی حضوری میں خلل ڈالا[5]۔

ایک دفعہ دروازے پر منقش پردہ پڑا ہوا تھا، نماز میں اس پر نگاہ پڑی تو حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ اس کو ہٹا دو، اس کے نقش و نگار حضور قلب میں خلل انداز ہوتے ہیں[6]۔

روزہ

انبیاء اور داعیان مذہب نے تکمیل روحانیت کے لئے تقلیل غذا بلکہ ترک غذا (روزہ) کو اسباب ضروری میں شمار کیا ہے، ہندوستان کے ریاضت کیش اور مرتاض داعیان مذہب تو اس راہ میں حد افراط سے بھی آگے نکل گئے ہیں لیکن داعی اسلام کا طرز عمل اس باب میں افراط و تفریط کے بیچ میں تھا، اسلام سے پہلے اہل عرب عاشورہ کے دن روزہ رکھا کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی معمولاً اس دن روزہ رکھتے تھے، بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ کے قیام کے زمانہ میں آپؐ متواتر کئی کئی مہینوں تک روزہ رکھتے تھے، لیکن مدینے آ کر اس معمول میں فرق آ گیا۔ مدینہ میں یہود بھی عاشورہ کا روزہ رکھتے تھے، آپؐ نے بھی رکھا، بلکہ تمام مسلمانوں کو اس دن روزہ رکھنے کی تاکید فرمائی، لیکن جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو عاشورہ کا روزہ نفل رہ گیا۔

رمضان کے علاوہ پورے مہینہ کا روزہ مدینہ میں آپؐ نے کبھی نہیں رکھا صرف ایک شعبان مستثنیٰ ہے۔

[1] سنن نسائی باب الغیرہ [2] ایضاً باب الاستغفار للمومنین [3] مسند ابن حنبل ج ۳ ص ۲۴۷ [4] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۲ کتاب الصلوٰۃ
[5] انبجانی ایک کپڑے کا نام ہے [6] صحیح بخاری کتاب اللباس والصلوٰۃ۔

اس میں قریب قریب پورے مہینہ بھر آپ روزہ سے رہتے، اس طرح سال میں دو مہینے شعبان اور رمضان تو پورے روزوں میں گزرتے تھے، سال کے بقیہ مہینوں میں یہ کیفیت رہتی تھی کہ روزہ رکھنے پر آتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ اب آپ کبھی روزہ نہ توڑیں گے، پھر روزہ توڑ دیتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ اب کبھی روزہ نہ رکھیں گے مہینہ کے نصف اول میں جن کو ایام بیض کہتے ہیں آپ اکثر روزوں سے رہتے تھے، مہینہ میں تین دن دو دو شنبہ اور ایک جمعرات کو معمولاً روزے رکھا کرتے تھے، بعض روایتوں میں ہے کہ جمعہ کا روزہ بھی معمولات میں سے تھا، ان کے علاوہ محرم کے دس دن یکم سے عاشورہ تک اور شوال کے آغاز میں چھ دن، دوسری سے ساتویں تک آپ روزوں میں گزارتے تھے۔[1]

اتفاقی روزے ان کے علاوہ تھے، آپ کبھی گھر میں تشریف لاکر پوچھتے تھے کہ کچھ کھانے کو ہے؟ جواب ملتا کچھ نہیں، آپ فرماتے تو میں آج روزے سے ہوں۔[2] کبھی کبھی آپ صوم وصال بھی رکھتے تھے یعنی متواتر کئی کئی دن تک ایک روزہ رکھتے تھے، بیچ میں مطلق افطار نہیں کرتے تھے یا برائے نام کچھ کھا لیتے تھے لیکن جب صحابہؓ نے اس میں آپ کی تقلید کرنی چاہی تو آپ نے منع فرمایا۔ بعض لوگوں نے اس ممانعت کو صرف اس معنی پر محمول کیا کہ آپ حکماً نہیں بلکہ شفقت سے منع فرماتے ہیں۔ اس لئے اس ممانعت کے باوجود آپ کے ساتھ انہوں نے بھی اس قسم کے روزے رکھنے شروع کئے۔ آپ کو یہ خبر معلوم ہوئی تو دو دن متصل روزہ رکھا، تیسرے دن اتفاق سے چاند ہو گیا آپ نے فرمایا کہ اگر مہینہ بڑھ سکتا تو میں اتنے دن تک افطار نہ کرتا کہ ان مذہب میں غلو کرنے والوں کا سارا غلو جاتا رہتا۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! پھر حضورؐ کیوں کئی کئی دن تک افطار نہیں کرتے؟ ارشاد ہوا تم میں مجھ سا کون ہے؟ مجھ کو تو ایک کھلانے والا ہے جو کھلاتا ہے اور ایک پلانے والا ہے جو پلاتا ہے۔ بعض روایتوں میں یہ الفاظ اس طرح وارد ہوئے ہیں، تم میں مجھ جیسا کون ہے، میں شب بسر کرتا ہوں تو میرا خدا مجھ کو کھلاتا اور پلاتا ہے۔[3]

عام مسلمانوں کے لئے آپ اس قسم کی مذہبی سختیوں کو ناپسند فرماتے تھے اور عام طور پر خود بھی ان چیزوں سے احتراز کرتے تھے، تفصیلی واقعات آگے آتے ہیں۔

زکوٰۃ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسلام سے پہلے بھی بہت کچھ خیرات اور مبرات کیا کرتے تھے جیسا کہ آغاز اسلام میں حضرت خدیجہؓ نے شہادت دی ہے۔[4] اسلام کے بعد آپ کی یہ کیفیت تھی کہ کوئی چیز نقد اپنے پاس رہنے نہیں دیتے تھے جو کچھ آتا مستحقین میں تقسیم فرما دیتے، لیکن بایں ہمہ زکوٰۃ کا ادا کرنا آپ سے ثابت نہیں،[5] اس سے بعض فقہانے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ انبیاء علیہم السلام پر زکوٰۃ فرض نہیں ہوتی، لیکن اصل یہ ہے کہ زکوٰۃ کے دو مفہوم ہیں، ایک مطلق صدقہ وخیرات اور اس باب میں جو آپ کی کیفیت تھی وہ کس سے مخفی ہے؟ دوسرا یہ کہ چاندی سونے یا جانور وغیرہ کی مخصوص مقدار و تعداد پر جو حاجت اصلیہ سے زیادہ ہو اور سال بھر تک مالک کے قبضہ میں رہی ہو، ایک خاص شرح رقم ادا کی جائے۔ یہ مصطلح زکوٰۃ کبھی آپ پر فرض ہی نہیں ہوئی، کاشانہ نبوت میں کوئی قابل زکوٰۃ چیز سال بھر تک کیا کبھی

[1] روزہ کے متعلق یہ حدیثیں تمام کتب حدیث میں ہیں، اس وقت ابوداؤد اور صحیح مسلم کتاب الصوم پیش نظر ہیں۔ [2] ابوداؤد باب النیۃ فی الصیام [3] صوم وصال کی یہ حدیثیں صحیح مسلم سے لی گئی ہیں [4] صحیح بخاری بدء الوحی، [5] صحیح بخاری بدء الوحی

یہ بھی پسند خاطر نہ تھا کہ شب گزر جائے اور مال و دولت کا کوئی نشان گھر کے اندر رہ جائے۔ ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ خراج کی رقم اس قدر زیادہ آگئی کہ وہ شام تک ختم نہ ہو سکی آپ نے رات بھر مسجد میں آرام فرمایا اور کاشانۂ اقدس میں اس وقت تک قدم نہیں رکھا جب تک حضرت بلالؓ نے آکر یہ اطلاع نہ دی کہ یا رسول اللہ! خدا نے آپ کو سبکدوش کیا۔[1]

حج اسلام سے پہلے آپ نے جس قدر حج کئے ان کی تعداد صحیح متعین نہیں کی جا سکتی، ابن الاثیر نے لکھا ہے کہ چونکہ قریش عموماً ہر سال حج کیا کرتے تھے اس لئے قرینہ غالب یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہر سال حج ادا کرتے ہوں گے۔ ترمذی میں ہے کہ قیام مکہ کے زمانے میں آپ نے دو حج کئے تھے اور ابن ماجہ اور حاکم میں ہے کہ تین حج کئے تھے۔ لیکن یہ سب روایتیں مرسل ہیں،[2] مدینہ کے زمانۂ قیام میں متفقہ ثابت ہے کہ صرف ایک حج ۱۰ھ میں کیا، یہ وہی حجۃ الوداع ہے جس کا ذکر بہ تفصیل پہلے گزر چکا ہے۔

حج کے علاوہ آپ نے عمرے بھی ادا کئے ہیں، ہجرت کے بعد چار عمرے ثابت ہیں، ایک عمرہ ذیقعدہ کے مہینہ میں، ایک حدیبیہ کے سال، ایک غزوۂ حنین کے بعد اور چوتھا حجۃ الوداع کے ساتھ۔[3] حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ حجۃ الوداع والے عمرے کے سوا تمام عمرے آپ نے ذیقعدہ کے مہینہ میں ادا کئے۔ ایک دفعہ حضرت ابن عمرؓ سے کسی نے پوچھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنے عمرے کئے تھے؟ انہوں نے جواب دیا، چار عمرے۔ ان میں سے ایک ماہ رجب میں۔ حضرت عائشہؓ نے یہ سنا تو کہا خدا ابو عبدالرحمن (ابن عمر کی کنیت) پر رحم فرمائے۔ آپ نے کوئی عمرہ ایسا نہیں کیا جس میں وہ شریک نہ ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رجب میں کوئی عمرہ نہیں کیا۔[4]

سال حدیبیہ میں سب سے پہلی دفعہ جب آپ عمرہ ادا کرنے کے لئے روانہ ہوئے تھے تو کفار قریش نے قدم قدم پر روکنے کی کوشش کی، صحابہ ان کی مدافعت میں آپ سے بچھڑ گئے لیکن آپ کو خانہ کعبہ کی زیارت کا یہ ذوق و شوق تھا کہ اپنے ہمراہیوں کا انتظار کئے بغیر بے خطر آپ سب سے آگے بڑھے چلے جا رہے تھے، آخر جان نثاروں نے ابوقتادہ انصاریؓ کو بھیجا کہ وہ جا کر ہماری جانب سے سلام عرض کریں اور یہ درخواست کریں کہ آپ ذرا توقف فرمائیں، ہمیں یہ ڈر ہے کہ دشمن کہیں ہمارے اور آپ کے درمیان حائل نہ ہو جائیں۔ آپ نے ان کی یہ درخواست قبول فرمائی۔[5]

دوام ذکر الٰہی قرآن مجید نے اہل ایمان کا یہ وصف خاص بیان کیا ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ (آل عمران) جو خدا کو اٹھتے بیٹھتے یاد کرتے ہیں......

لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ (نور) جن کو اشغال دنیوی خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتے۔

اور قرآن کا مبلغ ان اوصاف کا خود بہترین مظہر تھا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر لحظہ اور ہر لمحہ خدا کی یاد میں مصروف رہتے تھے۔[6] ربیعہؓ بن کعب اسلمی رات کو آپ کے آستانہ پر پہرہ دیتے تھے وہ بیان

[1] ابوداؤد باب قبول ھدایا المشرکین [2] باب کم حج النبی صلی اللہ علیہ وسلم [3] زرقانی ج ۸ صفحہ ۱۶۲ [4] صحیح مسلم، ابوداؤد حجۃ الوداع و ترمذی باب کم حج النبی صلی اللہ علیہ وسلم [5] جامع ترمذی باب مذکور، بخاری ومسلم کتاب الحج [6] صحیح بخاری صفحہ ۲۴۵ باب جزاء الصید [7] ابوداؤد کتاب الطہارۃ۔

کہتے ہیں کہ آپ کی تسبیح و تہلیل کی آواز سنتے سنتے میں تھک جاتا تھا اور مجھے نیند آجاتی تھی[1]۔ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے، وضو کرتے، نئے کپڑے پہنتے، سوار ہوتے، سفر میں جاتے، واپس آتے، گھر میں داخل ہوتے، مسجد میں قدم رکھتے، غرض ہر حالت میں دل و جان ذکر الٰہی میں مصروف رہتے، چنانچہ اسی بنا پر احادیث میں مختلف اوقات و حالات کے لئے کثرت سے ادعیہ ماثورہ منقول ہیں۔ اخیر زندگی میں جب سورۂ اذا جاء اتری جس میں تحمید و تسبیح کا حکم ہے تو امہات المومنین کا بیان ہے کہ ہر وقت اور ہر حالت میں زبان مبارک پر تسبیح و تہلیل جاری رہتی تھی[2]۔

حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ آپ اکثر یہ دعا رب اغفرلی وتب علی انک انت التواب الغفور۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد پڑھا کرتے تھے، ہم نے گنا تو ایک ایک نشست میں سو سو دفعہ یہ الفاظ آپ کی زبان سے ادا ہوتے[3]۔ سفر اور کوچ کی بے اطمینانی میں بھی آپ یاد الٰہی سے غافل نہیں ہوتے تھے، سواری پر بیٹھے بیٹھے نفل ادا کرتے تھے اور اس کی پروا نہیں کرتے تھے کہ قبلہ کی طرف رخ ہے یا نہیں۔ سواری کا جانور جدھر جدھر چل رہا ہوتا، آپ ادھر ہی منہ کئے نماز کی نیت کر لیتے[4] کہ اَینما تولوا فثمّ وجه الله۔ جدھر رخ کرو ادھر ہی خدا کا منہ ہے۔

ذوق و شوق

آپ اصحابؓ کی محفل میں یا امہات المومنینؓ کے حجروں میں بات چیت میں مشغول ہوتے کہ دفعۃً اذان کی آواز آتی، آپ اٹھ کھڑے ہوتے[5]۔ رات کا ایک معتدبہ حصہ گو شب بیداری میں گزرتا تھا تاہم صبح کے وقت ادھر موذن نے اللہ اکبر کہا، ادھر آپ بستر سے اٹھ بیٹھے[6]۔ شب کے وقت جس ذوق شوق اور وجد کی حالت میں نماز پڑھتے اس کا نقشہ حضرت عائشہؓ نے ان الفاظ میں کھینچا ہے، کبھی پوری پوری رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے رہتے، سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران، سورۂ نسا (قرآن کی سب سے بڑی سورتیں ہیں)، پڑھتے، جب کوئی خوف اور خشیت کی آیت آتی، خدا سے دعا مانگتے اور پناہ طلب کرتے، کوئی رحمت اور بشارت کی آیت آتی تو اس کے حصول کی دعا مانگتے[7]۔ قرأت اتنی زور سے فرماتے کہ دور تک آواز جاتی اور لوگ اپنے بستروں پر پڑے پڑے آپ کی آواز سنتے[8]۔ کبھی کبھی کوئی آیت آجاتی کہ آپ اس کے ذوق و شوق میں محو ہو جاتے۔ حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ نے نماز میں یہ آیت پڑھی،

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ، وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔

اگر تو سزا دے تو تیرے بندے ہیں اور اگر معاف کر دے تو تو غالب اور حکمت والا ہے۔

تو یہ اثر ہوا کہ صبح تک آپ یہی آیت پڑھتے رہ گئے[9]۔

زید بن خالد جہنی ایک صحابی ہیں، وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ ارادہ کیا کہ آج شب میں آپ کو نماز پڑھتے دیکھوں گا (غالباً یہ کسی سفر کا واقعہ ہے)، نماز کا وقت آیا تو آپ نماز کے لئے کھڑے ہوئے۔ پہلے دو رکعتیں معمولی

[1] مسند ابن حنبل ج ۴ ص ۵۹ [2] ابن سعد جزء الوفاۃ [3] ترمذی و ابن ماجہ و دارمی باب دعوات [4] صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد وغیرہ [5] صحیح بخاری باب یکون الرجل فی مہنۃ اہلہ ص ۸۰۰ [6] صحیح بخاری من انتظر الاقامۃ [7] مسند ابن حنبل ج ۶ ص ۹۲ [8] [illegible] صلوٰۃ اللیل [9] [illegible]

ادا کیں، پھر دو رکعتیں بہت ہی لمبی اور بڑی دیر تک پڑھیں، پھر دو دو رکعتیں کر کے آٹھ رکعتیں بتدریج چھوٹی پڑھیں اور سب کے آخر میں وتر ادا کی[1]۔ خبابؓ کی روایت ہے کہ ایک شب آپ نماز کے لئے کھڑے ہوئے تو صبح تک مصروف رہے[2]۔

حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ ایک شب مجھ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا، آپ نے سورۂ بقر شروع کی (قرآن کی یہ سب سے بڑی سورہ ہے) میں سمجھا کہ آپ سو آیتوں تک پڑھیں گے، لیکن آپ ان کو پڑھ کر اور آگے بڑھے، میں نے دل میں کہا شاید پوری سورہ آپ ایک ہی رکعت میں ختم کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ جب آپ نے اس سورہ کو ختم کیا تو میں نے خیال کیا کہ آپ رکوع کریں گے لیکن آپ نے فوراً ہی سورۂ آل عمران شروع کر دی، یہ بھی ختم ہو چکی تو سورۂ نسا شروع کی (یہ تینوں سورتیں مل کر سوا پانچ پاروں کے قریب ہیں) بہت ٹھہر ٹھہر کر نہایت سکون اور اطمینان سے آپ قرأت کر رہے تھے اور ہر آیت کے مضمون کے مطابق بیچ بیچ میں تسبیح اور دعا کرتے جاتے تھے اس کے بعد آپ نے رکوع کیا، رکوع میں قیام ہی کے برابر توقف فرمایا، پھر کھڑے ہوئے اور اتنی ہی دیر تک کھڑے رہے، پھر سجدہ کیا اور سجدہ میں بھی اسی قدر تاخیر فرمائی[3]۔

میدان جنگ میں یاد الٰہی

عین اس وقت جب دونوں طرف سے فوجیں برسر پیکار ہوتیں، تیر و سنان اور تیغ و خنجر کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہو رہی ہوتیں اور ہر طرف سے شور دار و گیر برپا ہوتا آپ نہایت خضوع و خشوع و اطمینان قلب کے ساتھ دعا و زاری اور ذکر الٰہی میں مصروف ہوتے، سپاہی شجاعت کے فخر و غرور سے پیشانیوں پر بل ڈالے ہوئے دشمنوں کے مقابلہ میں ہوتے لیکن خود سپہ سالار کی پیشانی زمین نیاز پر ہوتی، بدر[4]، احد، خندق، خیبر[5]، تبوک[6]، تمام بڑے بڑے معرکوں میں آپ کی یہی کیفیت تھی۔

معرکہ ہائے جنگ میں سپہ سالاروں کو اپنے بہادر سپاہیوں کی قوت پر ناز ہوتا ہے لیکن اسلام کے قائد اعظم کو صرف خدائے ذوالجلال کی قوت پر ناز تھا، عالم اسباب کے لحاظ سے گو آپ نے اصول جنگ کے مطابق ہر میدان میں اپنی فوجیں مرتب کیں لیکن اصلی اعتماد اور بھروسہ اسباب کائنات سے ماوراء قادر مطلق کی ذات پر تھا۔ بدر میں دو صحابی حاضر ہوتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ! ہم کو کافروں نے اس شرط پر رہا کیا ہے کہ ہم جنگ میں شرکت نہ کریں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ ہم کو صرف خدا کی مدد درکار ہے[7]۔ بدر کا میدان خون سے لالہ زار ہو رہا ہے اور خشوع و خضوع سے دونوں ہاتھ پھیلا کر بارگاہ ایزدی میں عرض کر رہے ہیں، خدایا اپنا وعدۂ نصرت پورا کر۔ محویت اور بے خودی میں ردائے مبارک کندھے سے گر پڑتی ہے اور آپ کو خبر تک نہیں ہوتی، کبھی سجدے میں گر پڑتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ خدایا! اگر آج یہ چند نفوس مٹ گئے تو پھر قیامت تک تو نہ پوجا جائے گا۔ اسی اثنا میں حضرت علیؓ تین دفعہ میدان جنگ سے حاضر خدمت ہوتے ہیں اور ہر دفعہ یہ دیکھتے ہیں کہ وہ مقدس پیشانی خاک پر ہے[8]۔ غزوۂ احد کے خاتمہ پر ابوسفیان مسرت سے ہبل کی جے پکارتا ہے لیکن آپ اس دل شکستگی کے عالم میں

[1] صحیح مسلم، موطا، ابوداؤد [2] نسائی احیاء اللیل [3] صحیح مسلم و نسائی صلوٰۃ اللیل [4] صحیح مسلم باب الوفا بالعہد [5] صحیح مسلم [6] بخاری بدر [7] سیرت ج ۱ ص ۴۲۵ [8] [illegible]

بھی حضرت عمرؓ کو حکم دیتے ہیں کہ تم بھی کہو۔

اللّٰہ مولانا ولا مولیٰ لکم اللّٰہ اعلیٰ واجلّ۔ | خدا ہمارا آقا ہے تمہارا کوئی آقا نہیں، خدا بڑا اور بلند ہے۔

غزوۂ احزاب میں آپؐ خود اپنے دستِ مبارک سے خندق کھودنے میں مصروف تھے اور لبِ مبارک پر یہ الفاظ جاری تھے۔

اللّٰھم لا خیر الا خیر الآخرۃ فبارک فی الانصار والمھاجرۃ۔ | خدایا بھلائی صرف آخرت کی بھلائی ہے، انصار اور مہاجرین کو برکت عطا کر۔

دشمن اس شدت سے حملہ پر حملہ کر رہے تھے کہ کسی مسلمان کا اپنی جگہ سے ہٹنا ممکن نہ تھا اور یہ محاصرہ ۲۰ یا ۲۲ دن تک قائم رہا، لیکن اس مدت میں صرف ایک یا زیادہ سے زیادہ چار وقت کی نمازیں قضا ہوئیں، ایک دن عصر کے وقت دشمنوں نے اس زور کا حملہ کیا کہ ایک لمحہ کے لئے بھی مہلت نہ مل سکی، آخر عصر کا وقت ختم ہوگیا، آپؐ کو سخت رنج ہوا حملہ رکنے پر سب سے پہلے باجماعت نماز ادا کی۔[۱]

غزوۂ خیبر میں جب آپؐ شہر کے قریب پہنچے تو زبانِ مبارک سے یہ الفاظ نکلے اللّٰہ اکبر خربت خیبر اللّٰہ اکبر خیبر ویران ہوچکا، عمارتیں نظر آئیں تو صحابہ سے ارشاد کیا کہ ٹھہر جاؤ، پھر یہ دعا مانگی

اللّٰھم انا نسئلک خیر ھذہ القریۃ وخیر اھلھا وخیر ما فیھا ونعوذ بک من شرھا وشر اھلھا وشر ما فیھا (ابن ہشام) | اے خدا ہم تجھ سے اس آبادی کی، اس آبادی والوں کی، اس آبادی کی چیزوں کی بھلائی چاہتے ہیں اور ان سب کی برائیوں سے تیری پناہ کے طلب گار ہیں۔

حنین کے معرکہ میں بارہ ہزار فوج آپؐ کے ساتھ تھی، لیکن اول ہی حملہ میں اس کے پاؤں اکھڑ گئے، اس فوج کا سپہ سالار اگر ان ہی آدمیوں کے بھروسہ پر میدانِ جنگ میں اترتا تو شاید وہ سب سے پہلے بھاگ کر اپنی جان بچاتا لیکن آپؐ کو جس قوت پر اعتماد تھا، آپؐ اس کو اس تنہائی میں بھی اسی طرح ناصر و مددگار سمجھتے تھے جس طرح فوج و لشکر کے ساتھ میں اس وقت جب دس ہزار قدر انداز تیروں کا مینہ برساتے ہوئے سیلاب کی طرح بڑھتے چلے آتے تھے اور آپؐ کے پہلو میں چند جاں نثاروں کے سوا کوئی اور باقی نہیں رہا تھا، آپؐ سواری سے اتر آئے اور فرمایا میں خدا کا بندہ اور پیغمبر ہوں، پھر بارگاہِ الٰہی میں دست بدعا ہو کر نصرتِ موعودہ کی درخواست کی، دفعۃً ہوا کا رخ پلٹ گیا اور نسیمِ فتح علمِ اسلام کو لہرانے لگی،[۲] دس ہزار دشمن کے بے پناہ تیروں کو یکہ و تنہا مناجات و زاری کی سپر پر روکنے کی جرأت پیغمبروں کے سوا اور کس سے ظاہر ہو سکتی ہے۔

اس موقع کا سب سے موثر منظر غزوۂ بنی مصطلق میں نظر آتا ہے، سامنے دشمن پڑاؤ ڈالے پڑے ہیں اور غفلت کے منتظر ہیں کہ دفعۃً نماز کا وقت آجاتا ہے اور آپؐ امام بن کر آگے کھڑے ہو جاتے ہیں، صحابہ کی ایک جماعت مقتدی ہو کر نماز میں مصروف ہو جاتی ہے اور دوسری دشمنوں کا سامنا روک لیتی ہے، صلح حدیبیہ کے زمانہ میں اس سے بھی زیادہ خطرناک موقع پیش آیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے پاس عسفان میں خیمہ زن تھے، قریش کے

---
[۱] صحیح بخاری احد [۲] صحیح بخاری و مسلم حنین۔

[redacted]

مشہور جنرل خالد بن ولید آس پاس کی پہاڑیوں میں دشمنوں کی فوج کا ایک دستہ لئے ہوئے موقع کی تاک میں تھے قریش کی یہ رائے قرار پائی کہ مسلمان جب نماز کے لئے کھڑے ہوں تو عین اس وقت ان پر بے خبری میں حملہ کیا جائے خداوند کارساز کی بارگاہ میں قصرِ صلوٰۃ کی ایک عمدہ تقریب پیدا ہوگئی، چنانچہ قصر کی آیتیں نازل ہوئیں، عصر کا وقت آیا تو آپؐ نماز کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے، دشمن اپنی فوج کا پرا لئے آپؐ کے سامنے تھے، صحابہ دو حصوں میں منقسم ہوئے، ایک حصہ نے آپؐ کے پیچھے آکر نماز کی صفیں قائم کر لیں اور دوسرا حصہ دشمن کے مقابل کھڑا ہو گیا، پہلی جماعت فارغ ہو کر بتدریج دشمنوں کے مقابل آگئی اور دوسری ترتیب کے ساتھ پیچھے ہٹ کر آپؐ کے ساتھ نماز میں جا ملی، یہ تمام تبدیلیاں مقتدیوں کی صفوں میں ہو رہی ہیں، لیکن خود سپہ سالار خون آشام تلواروں کے سایہ میں تمام خطرات سے بے پرواہ عبادتِ الٰہی میں مصروف تھے۔[۱]

ان واقعات کو پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ اس حکم الٰہی کی کہاں تک تعمیل ہوتی۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (انفال) | مسلمانو! جب کسی گروہ سے مڈبھیڑ ہو جائے تو ثابت قدم رہو اور بار بار خدا کا نام لیتے جاؤ، تم کامیاب ہوگے۔

صحیح بخاری میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جہاد میں جب کسی ٹیکرے پر چڑھتے تو تین بار اللّٰہ اکبر کہتے۔[۲]

خشیتِ الٰہی

آپؐ خاتم الانبیاء تھے، افضل رسل تھے، محبوب خاص تھے، تاہم خشیتِ الٰہی کا یہ اثر تھا کہ فرمایا کرتے کہ مجھ کو کچھ نہیں معلوم کہ میرے اوپر کیا گزرے گی، حضرت عثمانؓ بن مظعون نے جب وفات پائی تو آپؐ تعزیت کو گئے، لاش دھری تھی، ایک عورت نے لاش کی طرف مخاطب ہو کر کہا، خدا گواہ ہے کہ خدا نے تجھ کو نوازا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تم کو کیونکر معلوم ہوا؟ بولیں خدا نے ان کو نہیں نوازا تو اور کس کو نوازے گا، ارشاد ہوا کہ ہاں مجھ کو بھی ان کی نسبت بھلائی کی توقع ہے، لیکن میں پیغمبر ہو کر بھی نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا۔[۳]

جب کبھی زور سے ہوا چلتی آپ سہم جاتے، کسی ضروری کام میں ہوتے اس کو چھوڑ کر قبلہ رخ ہو جاتے اور فرماتے خدایا تیری بھیجی ہوئی مصیبت سے پناہ مانگتا ہوں، جب مطلع صاف ہو جاتا یا پانی برس جاتا تو مسرور ہوتے اور خدا کا شکر ادا فرماتے، ایک دن اس قسم کا واقعہ پیش آیا تو حضرت عائشہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ! آپؐ کیوں مضطرب ہو جاتے ہیں، ارشاد ہوا عائشہؓ! تجھے کیا معلوم کہ قوم ہود کا واقعہ نہ پیش آئے، جس نے بادل دیکھ کر کہا کہ یہ ہمارے کھیتوں کو سیراب کرنے والا ہے، حالانکہ وہ عذابِ الٰہی تھا۔[۴]

حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! آپؐ کے بال پکنے لگے فرمایا مجھے سورۂ ہود، واقعہ، والمرسلات اور عم یتساءلون نے بوڑھا کر دیا۔ ان سورتوں میں قیامت وغیرہ کے واقعات مذکور ہیں،[۵] ابی بن کعب سے روایت ہے کہ جب دو ثلث شب گزر چکتی، باآواز یہ الفاظ ادا فرماتے، لوگو! خدا کو یاد کرو، زلزلہ آرہا ہے، اس کے پیچھے آنے والا آرہا ہے، موت اپنے سامان کے ساتھ آپہنچی، موت اپنے سامان کے ساتھ آپہنچی۔[۶]

---
[۱] ابو داؤد ج اول باب صلوٰۃ المسافرین [۲] باب التکبیر عند الحرب [۳] صحیح بخاری کتاب الجنائز [۴] سنن ابن ماجہ باب ما یدعو به الرجل اذا رای السحاب، یہ واقعہ بخاری، مسلم، اور دیگر حدیث کی کتابوں میں بھی مذکور ہے، اخیر فقرہ قرآن کی آیت کا ترجمہ ہے [۵] شمائل ترمذی ما جاء فی شیبہ [۶] مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی باب البکاء والخوف

فرمایا کرتے تھے: لوگو! جو کچھ میں جانتا ہوں اگر تم جانتے ہوتے تو تم کو ہنسی کم اور رونا زیادہ آتا۔ ایک دفعہ آپؐ نے نہایت موثر طرز سے خطبہ میں فرمایا، اے معشر قریش! اپنی اپنی خبر لو، میں تم کو خدا سے نہیں بچا سکتا، اے بنی عبدالمناف! میں تم کو بھی خدا سے نہیں بچا سکتا، اے عباس بن عبدالمطلب! میں تم کو بھی خدا سے نہیں بچا سکتا، اے صفیہ! رسول خدا کی پھوپھی! میں تجھ کو بھی خدا سے نہیں بچا سکتا، اے محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ میں تجھ کو بھی خدا سے نہیں بچا سکتا۔ (صحیحین)

ایک دفعہ اعراب بادیہ کا مسجد نبوی میں اتنا ہجوم ہوا کہ آپؐ پسینے کے قریب ہو گئے، مہاجرین نے اٹھ کر لوگوں کو ہٹایا، آپؐ نکل کر حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں داخل ہو گئے اور تقاضائے بشری سے بد دعا زبان سے نکل گئی فوراً قبلہ رخ ہو کر دونوں ہاتھ خدا کی بارگاہ میں اٹھائے اور دعا کی، خدایا! میں ایک انسان ہوں، اگر تیرے کسی بندہ کو مجھ سے تکلیف پہنچے تو مجھے سزا نہ دینا۔ گریہ و بکا رخشیت الٰہی کی وجہ سے اکثر آپ پر رقت طاری ہوتی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے، حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے جب آپؐ کے سامنے یہ آیت پڑھی فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا تو بے اختیار چشم مبارک سے آنسو جاری ہو گئے۔ اکثر نماز میں رقت طاری ہوتی اور آنسو جاری ہو جاتے۔ ایک دفعہ جب سورج گرہن پڑا تو نماز کسوف میں آپؐ ٹھنڈی سانسیں بھرتے اور فرماتے تھے خدا تو نے وعدہ کیا ہے کہ تو لوگوں پر میرے ہوتے عذاب نہیں نازل کرے گا۔

عبداللہ بن شخیر ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ میں ایک بار خدمت نبویؐ میں حاضر ہوا، دیکھا کہ آپؐ نماز میں مشغول ہیں، آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور روتے روتے اس قدر ہچکیاں بندھ گئی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا کہ چکی چل رہی ہے یا ہانڈی ابل رہی ہے۔

ایک بار آپؐ ایک جنازہ میں شریک تھے، قبر کھودی جا رہی تھی، آپؐ قبر کے کنارے بیٹھ گئے۔ یہ منظر دیکھ کر آپؐ پر اس قدر رقت طاری ہوئی کہ آنسوؤں سے زمین نم ہو گئی، پھر فرمایا بھائیو! اس دن کے لئے سامان کر رکھو۔

ایک دفعہ کسی غزوہ سے واپس تشریف لا رہے تھے، راہ میں ایک پڑاؤ ملا، کچھ لوگ بیٹھے تھے، آپؐ نے دریافت فرمایا کہ تم کون ہو؟ بولے ہم مسلمان ہیں، ایک عورت بیٹھی چولہا سلگا رہی تھی، پاس ہی اس کا لڑکا تھا، آگ خوب روشن ہو گئی اور بھڑک گئی تو وہ بچہ کو لے کر آپؐ کی خدمت میں آئی اور بولی، آپ رسول اللہؐ ہیں؟ ارشاد ہوا ہاں بے شک، پھر اس نے پوچھا کیا ایک ماں اپنے بچہ پر جس قدر مہربان ہے خدا اپنے بندوں پر اس سے زیادہ مہربان نہیں ہے؟ آپؐ نے فرمایا، ہاں بے شک! اس نے کہا تو ماں اپنے بچہ کو آگ میں نہیں ڈالتی، آپؐ پر گریہ طاری ہو گیا، پھر سر اٹھا کر فرمایا۔ خدا اس بندہ کو عذاب دے گا جو سرکشی اور متمرد ہے، خدا سے سرکشی کرتا ہے اور اس کو ایک نہیں کہتا۔

ایک دفعہ آپؐ نے حضرت ابراہیم کی دعا۔

۱؎ صحیحین ۲؎ مسند ابن حنبل ج ۶ ص ۱۲۳ [illegible]
صلوۃ الکسوف ۵؎ ترمذی و ابو داؤد باب البکاء فی الصلوۃ [illegible]

رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ۔
پروردگار ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا ان میں سے جس نے میری پیروی کی وہی میری جماعت میں ہے۔

اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ والی دعا پڑھی۔

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔
اگر تو ان کو عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر معاف کر دے تو تو غالب و دانا ہے۔

دونوں ہاتھ اٹھا کر اَللّٰهُمَّ اُمَّتِيْ اُمَّتِيْ فرماتے جاتے اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

محبت الٰہی

دنیا میں دو قسم کے پیغمبر آئے ہیں، ایک وہ جن کی آنکھوں کے سامنے صرف خدا کے جلال و کبریائی کا جلوہ تھا اور اس لئے وہ صرف خدا کے خوف و خشیت کی تعلیم دیتے تھے، مثلاً حضرت نوحؑ و حضرت موسیٰؑ دوسرے وہ جو محبت الٰہی میں سرشار تھے اور وہ لوگوں کو اسی خم خانۂ عشق کی طرف بلاتے تھے، مثلاً حضرت یحییٰؑ و عیسیٰ علیہما السلام لیکن یہ دونوں افراط و تفریط کے راستے تھے، پہلی راہ اخلاص و محبت کی منزل تک پہنچاتی اور دوسری عبودیت اور آداب و احترام کی منزل سے دور پھینک دیتی ہے، جیسا کہ عیسائی تعلیم اور موجودہ انجیل کی سیرت مسیحؑ میں ہر شخص کو نظر آ سکتا ہے، لیکن اسلام دونوں جلوؤں کو یکساں نمایاں کرنا چاہتا ہے، یہی سبب ہے کہ حامل شریعت اسلامیہ کی ذات مبارک میں یہ دونوں پہلو بیک دفعہ نظر آتے ہیں، قرآن مجید نے کمال ایمان کا یہ وصف بیان کیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔
جو ایمان لائے ہیں ان کو سب سے زیادہ خدا پیارا ہے۔

صحیح روایتوں میں ہے کہ آپؐ راتوں کو اتنی دیر تک نماز میں کھڑے رہتے تھے کہ پائے مبارک پر ورم آ جاتا تھا، یہ دیکھ کر بعض صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ کی مغفرت تو خدا کر چکا ہے، آپ یہ زحمت کیوں اٹھاتے ہیں ارشاد ہوا کہ کیا میں عبد شکور نہ بنوں۔ ارباب باطن کہتے ہیں کہ لوگ سمجھتے تھے کہ آپؐ کی عبادتیں خشیۃ الٰہی سے ہیں اور چونکہ آپؐ گناہوں سے پاک کر دیئے گئے تھے اس لئے آپ کو ریاضات شاقہ کی ضرورت نہ تھی، آپؐ نے اپنے جواب میں اسی شبہ کو دفع فرمایا اور بتایا کہ ان کا مقتضا محبت الٰہی ہے خشیت الٰہی نہیں ہے، اسی لئے آپؐ فرمایا کرتے تھے۔

وجعلت لی قرة عینی فی الصلوٰة۔
میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔

راتوں کو سناٹے میں اٹھ کر آپؐ کبھی دعا و زاری میں مصروف ہوتے کبھی قبرستان کی طرف نکل جاتے اور فرمایا کرتے تھے کہ نصف شب کے سکوت میں خدا سماء دنیا پر نزول فرماتا ہے۔ عبادت شبانہ کا خاتمہ صبح کی دو رکعتوں پر ہوتا تھا، جن کی نسبت آپؐ کا ارشاد تھا کہ ان کے معاوضہ میں دنیا و مافیہا کی نعمتیں بھی میرے سامنے ہیچ ہیں۔

ایک دفعہ ایک غزوہ میں کوئی عورت گرفتار ہو کر آئی، اس کا بچہ گم تھا، محبت کا یہ جوش تھا کہ کوئی بچہ مل جاتا تو وہ سینہ سے لگا لیتی اور اس کو دودھ پلاتی۔ آپؐ نے دیکھا تو حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ یہ عورت خود اپنے بچہ کو آگ میں ڈال دے۔ لوگوں نے عرض کی ہرگز نہیں۔ فرمایا تو خدا کو اپنے بندوں سے اس سے

۱؎ صحیح مسلم باب بکاءہ صلی اللہ علیہ وسلم لامتہ ۲؎ صحیح بخاری ۳؎ صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ۔

زیادہ محبت ہے جتنی اس کو اپنے بچے سے ہے[۱]۔

اسی طرح ایک اور واقعہ اوپر گزر چکا ہے کہ آپؐ ایک غزوہ سے واپس آرہے تھے، ایک عورت اپنے بچے کو گود میں لے کر خدمت اقدس میں آئی اور عرض کی یا رسول اللہ! ایک ماں کو اپنے بچہ سے جس قدر محبت ہوتی ہے کیا خدا کو اپنے بندوں سے اس سے زیادہ نہیں ہے؟ فرمایا ہاں بے شک ہے۔ اس نے کہا کوئی ماں تو اپنے بچہ کو آگ میں ڈالنا گوارا نہیں کرتی۔ یہ سن کر فرطِ اثر سے آپؐ پر گریہ طاری ہو گیا، پھر سر اٹھا کر فرمایا، خدا صرف اس بندہ کو عذاب دے گا جو سرکشی سے ایک کو دو کہتا ہے[۲]۔

ایک دفعہ آپؐ صحابہ کی مجلس میں تشریف فرما تھے، ایک صاحب ایک چادر میں ایک پرند کو مع اس کے بچوں کے لپیٹے ہوئے لائے اور عرض کی کہ یا رسول اللہ! میں نے ایک جھاڑی سے ان بچوں کو اٹھا کر کپڑے میں لپیٹ لیا اس کی ماں نے یہ دیکھا تو میرے سر پر منڈلانے لگی، میں نے ذرا سا کپڑے کو کھول دیا تو وہ فوراً بچوں پر گر پڑی، ارشاد ہوا کہ کیا اپنے بچوں کے ساتھ ماں کی اس محبت پر تم کو تعجب ہے، قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے جو محبت اس ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہے خدا کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے بدرجہا زیادہ ہے[۳]۔

آپؐ محبت الٰہی کے سامنے دنیا کی تمام محبتوں کو ہیچ سمجھتے تھے۔ وفات سے پانچ دن پہلے آپؐ نے صحابہ کے مجمع میں ایک خطبہ دیا، اس میں فرمایا، میں خدا کے سامنے اس بات سے برأت کرتا ہوں کہ تم میں سے یعنی انسانوں میں سے کوئی میرا دوست ہو، کیونکہ خدا نے مجھے اپنا دوست بنا لیا، جس طرح ابراہیمؑ کو اس نے اپنا دوست بنا لیا تھا اگر میں اپنی امت میں سے کسی کو دوست بنا سکتا تو ابوبکر کو بناتا[۴]۔

وفات کے وقت زبان مبارک سے جو فقرہ بار بار ادا ہو رہا تھا یہ تھا۔

اَللّٰھُمَّ الرَّفِیْقَ الْاَعْلٰی۔ خدایا صرف رفیق اعلیٰ مطلوب ہے۔

یہ الفاظ سن کر حضرت عائشہؓ نے کہا، اب آپؐ ہم لوگوں کو چھوڑ دیں گے[۵]۔

اس "رفاقت علوی" کے راز سے جو کسی قدر آشنا ہیں وہ اس فقرہ کی یہ تشریح کرتے ہیں۔

"انبیاء علیہم السلام چوں از مقام دعوت فارغ میگردند و متوجہ عالم بقا می شوند و مصلحت رجوع الی الخلق، تمام می شود بشوق تمام نداے الرفیق الاعلیٰ برآوردہ بکلیت متوجہ حق جل شانہ میگردند در مراتب قرب سیری نمایند[۶]۔"

توکل علی اللہ

توکل کے یہ معنی ہیں کہ انسان کوششوں کے نتائج اور واقعات عالم کے فیصلہ کو خدا کے سپرد کر دے اسباب و علل کے پردے اس کے سامنے سے اٹھ جائیں اور وہ براہ راست ہر چیز اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں نظر آئے۔ بظاہر اسباب و علل گو ناموافق ہوں، مگر یہ غیر متزلزل یقین پیدا ہو کہ یہ ناموافق حالات ہمارے کام میں ذرہ بھر مؤثر نہیں ہو سکتے، بلکہ اصلی قوت و قدرت عالم اسباب سے ماوراء ہستی کے ہاتھ میں ہے۔ انسان کا

[۱] صحیح بخاری ص ۸۰ باب رحمۃ الولد [۲] سنن ابن ماجہ باب ما یرجی من الرحمۃ [۳] مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد باب رحمۃ اللہ [۴] صحیح مسلم ص ۲۰۱ باب النہی عن بناء المساجد علی القبور [۵] صحیح بخاری باب الوفات [۶] مکتوبات امام ربانی، مجدد الف ثانی مکتوب ۲۷۲ جلد اول۔

استقلال، عزم، شجاعت و بے باکی یہ تمام باتیں اس ہی ایک اصل کی پرتو ہیں اسی کی بدولت مشکل سے مشکل اوقات میں بھی زمام صبر اس کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتی، پرخطر سے پرخطر راستوں میں بھی جبن اور ضعف ہمت اس کے قلب میں راہ نہیں پاتا، شدید سے شدید حالات میں بھی اس کے دل پر مایوسی کا بادل نہیں چھاتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح زندگی کا ایک ایک حرف پڑھ جاؤ، تم کو صاف نظر آئے گا کہ آسمان کے نیچے شدائد اور مصیبتوں کی کوئی ایسی صنف نہ ہو گی جو آپؐ کی راہ میں حائل نہ ہوئی ہو، لیکن آپؐ کا دل کبھی اضطراب و انتشار مایوسی و ناامیدی اور خوف و بیم سے آشنا نہ ہوا، مکہ کی تنہائیوں میں مصائب کے ہجوم میں دشمنوں کے نرغہ میں حنین و احد کے خونریز معرکوں میں ہر جگہ توکل و اعتماد علی اللہ کا ایک ہی جلوہ نظر آتا ہے۔ ابوطالب سمجھاتے ہیں کہ جان پدر اس کام سے ہاتھ اٹھاؤ، آپؐ فرماتے ہیں: "عم محترم! میری تنہائی کا خیال نہ کیجئے، حق زیادہ دیر تک تنہا نہیں رہے گا، عجم و عرب ایک دن اس کے ساتھ ہو گا"۔ ایک دوسرے کے جواب میں آپؐ فرماتے ہیں کہ "خدا مجھے تنہا نہیں چھوڑے گا"[۱]۔ مکہ میں ایک مصیبت زدہ مایوس صحابی سے ارشاد ہوتا ہے، "خدا کی قسم! عنقریب وہ وقت آتا ہے جب یہ دین مرتبۂ کمال کو پہنچ جائے گا اور خدا کے سوا کسی اور کا ڈر نہیں رہے گا[۲]۔"

ایک دفعہ حرم میں بیٹھ کر کفار نے باہم مشورہ کیا کہ محمدؐ اب جیسے ہی یہاں قدم رکھیں ان کی بوٹی بوٹی اڑا دی جائے حضرت فاطمہؓ ان کی یہ تقریر سن رہی تھیں وہ روتی ہوئی آپؐ کے پاس آئیں اور واقعہ عرض کیا۔ آپؐ نے ان کو تسکین دی اور وضو کے لئے پانی مانگا، وضو کر کے آپؐ بے خطر حرم کی سمت روانہ ہو گئے۔ جب خاص صحن حرم میں پہنچے اور کفار کی نظر آپؐ پر پڑی تو خود بخود ان کی نگاہیں جھک گئیں[۳]۔

جلد اول میں پڑھ چکے ہو کہ شب ہجرت میں قریش کے بہادر خون آشام ارادوں کے ساتھ کاشانۂ اقدس کا محاصرہ کئے ہوئے تھے، لیکن آپؐ نے نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ اپنے عزیز قوت بازو علی مرتضیٰؓ کو اپنی جگہ بستر پر لٹا دیا، حالانکہ اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ قتل گاہ ہے، بستر خواب نہیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم تھا کہ ایک قادر کل ہستی ہے، جو تختۂ مقتل کو فرش گل بنا سکتی ہے ان کو لٹاتے ہوئے نہایت بے پروائی سے فرمایا کہ تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا[۴]۔

گھر کے چاروں طرف دشمنان قریش محاصرہ کئے ہوئے تھے اور خیال ہو سکتا تھا کہ صبح امید کے انتظار میں مکہ کے برنا و پیر عجب نہیں کوچوں میں اور گلیوں میں مشتاق خبر پھر رہے ہوں، لیکن آپؐ نے اذن الٰہی کے اعتماد پر ان تمام ناموافق حالات کی موجودگی میں گھر سے باہر قدم نکالا۔ اس وقت سورہ یٰسین کی ابتدائی آیتیں زبان مبارک پر تھیں جن میں نبوت کی اور اپنے راہ راست پر ہونے کی تصدیق ہے، آخری آیت یہ تھی۔

وَجَعَلْنَا مِنْ بَیْنِ اَیْدِیْھِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِھِمْ سَدًّا فَاَغْشَیْنٰھُمْ فَھُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ (یٰسین)

ہم نے ان کے آگے اور ان کے پیچھے دیواریں کھڑی کر دی ہیں ہم نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے کہ وہ نہیں دیکھتے ہیں۔

مکہ سے نکل کر آپؐ نے مع حضرت ابوبکرؓ کے غار ثور میں پناہ لی، قریش میں خون آشامی کے ساتھ اپنی ناکامی

[۱] یہ دونوں واقعے ابن ہشام میں ہیں [۲] صحیح بخاری اوائل خروج اول [۳] مسند اول ج ۱ ص ۳۶۸ [۴] ابن ہشام و طبری۔

کا غصہ بھی تھا اور اس لئے اس وقت ان کے انتقام کے جذبات میں غیر معمولی تلاطم ہوگا، وہ آپ کے تعاقب میں نشان قدم کو دیکھتے ہوئے ٹھیک اسی غار کے پاس پہنچ گئے، کون کہہ سکتا ہے کہ اس پُر خطر حالت میں کسی کے حواس بر جا رہ سکتے ہیں، چنانچہ حضرت ابو بکرؓ نے گھبرا کر عرض کی کہ یا رسول اللہ! دشمن اس قدر قریب ہیں کہ اگر ذرا نیچے جھک کر اپنے پاؤں کی طرف دیکھیں گے تو ہم پر نظر پڑ جائے گی۔ لیکن آپ نے روحانیت کی پُر سکون آواز میں فرمایا۔ اُن دو کو کیا غم ہے جن کے ساتھ تیسرا خدا ہو۔ پھر جیسا کہ قرآن مجید میں ہے فرمایا۔

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا۔ — غم نہ کر، خدا ہمارے ساتھ ہے۔

سینۂ نبوت کے سوا اس روحانی سکون کا جلوہ اور کہاں نظر آسکتا ہے۔

قریش کے اس اعلان کے بعد کہ جو محمدؐ کو زندہ یا اُن کا سر کاٹ کر لائے گا اس کو سو اونٹ ملیں گے، سراقہ بن جعشم نے آپ کا تعاقب کیا اور اس قدر قریب پہنچ گیا کہ وہ آپ کو پا سکتا تھا حضرت ابو بکرؓ بار بار گھبرا کر ادھر دیکھ رہے تھے، لیکن آپ نے ایک دفعہ بھی مڑ کر نہیں دیکھا کہ سراقہ کس ارادہ سے آرہا ہے۔ یہاں دل پر وہی سکینتِ ربانی طاری تھی اور لب ہائے مبارک تلاوتِ قرآن میں مصروف تھے۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مدینہ آکر آپ کی زندگی ہر قسم کے خطروں سے محفوظ ہو گئی تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ گو اسلام کو یہاں اعوان و انصار کی ایک معتد بہ تعداد مل گئی تھی لیکن اسی کے ساتھ ان دشمنوں کا سامنا بھی تھا جو دشمنانِ مکہ سے زیادہ خطرناک تھے۔ مکہ میں قریش گو آپ کے دشمن تھے لیکن ان میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نسبی تعلقات تھے، جو کبھی کبھی کسی کو غم خواری اور مواسات پر بھی مائل کر دیتے تھے لیکن مدینہ کے منافقین اور یہود کو مواسات اور ہمدردی کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی۔ علاوہ بریں یہود و منافقین مدینہ اور قریش مکہ میں باہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل و جلاوطنی کی سازشیں شروع ہو گئی تھیں۔ اس بنا پر صحابہ جان نثاری کی بنا پر آکر راتوں کو پہرہ دیا کرتے تھے، اسی زمانہ میں ایک رات صحابہ آپ کے خیمہ کا پہرہ دے رہے تھے کہ یہ آیت نازل ہوئی۔

وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ (مائدہ) — اور اللہ لوگوں سے تیری حفاظت کرے گا۔

اور آپ نے اسی وقت خیمہ سے باہر سر نکال کر صحابہؓ سے فرمایا۔

ایہا الناس انصرفوا فقد عصمنی اللہ۔ — لوگو واپس جاؤ میری حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا ہے۔

غزوۂ نجد سے واپسی میں آپ نے ایک مقام پر پڑاؤ کیا، یہاں بہت سے ببول کے جھنڈ تھے، دوپہر کا وقت تھا، صحابہ درختوں کے سایہ میں ادھر اُدھر سو رہے تھے، آپ بھی ایک درخت کے نیچے تنہا استراحت فرما تھے، آپ کی تلوار ایک درخت سے لٹکی تھی کہ ناگاہ ایک بدو جو شاید اسی موقع کی تاک میں تھا، چپکے سے آیا اور آپ کی تلوار اتار کر نیام سے باہر کی اور آپ کے سامنے آیا کہ دفعۃً آپ ہوشیار ہوئے، دیکھا کہ ایک بدو تیغ بکف کھڑا ہے، بدو نے پوچھا اے محمدؐ! اب مجھ سے تم کو کون بچا سکتا ہے؟ ایک پُر اطمینان صدا آئی کہ "اللہ"۔

ایک دفعہ ایک شخص گرفتار ہو کر پیش ہوا کہ یہ آپ پر حملہ کی گھات میں تھا، آپ نے فرمایا؛ اس کو چھوڑ دو کہ یہ

لہ صحیح بخاری ہجرت ٢ہ سیرت ج ١ سلسلہ غزوات ٣ہ جامع ترمذی تفسیر مائدہ ٤ہ صحیح بخاری کتاب الجہاد ۵ہ مسند ابن حنبل ج ٣ ص ۴٢۔

مجھ کو قتل کرنا بھی چاہتا تو نہیں کر سکتا تھا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ میری حفاظت کا ذمہ دار کوئی اور ہے۔ خیبر میں جس یہودیہ نے آپ کو زہر دیا تھا، اس سے آپ نے دریافت کیا کہ تم نے یہ حرکت کیوں کی؟ اس نے جواب دیا کہ آپ کے قتل کرنے کے لئے؛ آپ نے فرمایا کہ "خدا تم کو اس پر مسلط نہ کرتا"۔

اُحد اور حنین کے معرکوں میں جب میدانِ جنگ تھوڑی دیر کے لئے جان نثاروں سے خالی ہو گیا تھا، آپ کا استقلال، توکل علی اللہ و سکینتِ روحانی کی معجزانہ مثال ہے۔ یہ توکل اور اعتماد علی اللہ کی یک رخی تصویر ہے، اس مرقع کا دوسرا رُخ بھی کچھ اس سے کم مؤثر نہیں ہے، آپ پر فقر و غنا کے مختلف دور گزرے، کوئی دن ایسا آتا کہ مسجدِ نبوی کا صحن زر و مال سے معمور ہو جاتا اور پھر متصل کئی کئی دن ایسے آتے کہ فاقہ سے شکمِ مبارک پر دو دو تین تین پتھر بندھے ہوتے، حالانکہ بالکل ممکن تھا کہ آج کا سرمایہ کل کے مصارف کے لئے اٹھا رکھا جائے لیکن تمام عمر آپ کا طرزِ عمل اس کے خلاف رہا، کبھی ایک دن کی آمدنی دوسرے دن کے لئے اٹھا کر نہیں رکھی گئی، ضروری اور بقدرِ کفالت اخراجات کے بعد جو کچھ بچ جاتا وہ شام تک اہلِ استحقاق پر صرف کر دیا جاتا تھا۔ ترمذی میں حضرت انسؓ سے روایت ہے۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان لا یدخر لغد — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کل کیلئے کوئی چیز اٹھا نہیں رکھتے تھے۔

اتفاق سے یا بھولے سے اگر کوئی چیز گھر میں رہ جاتی تو آپ کو سخت تکلیف ہوتی تھی بلکہ آپ اس وقت تک گھر میں تشریف نہیں لے جاتے تھے جب تک یہ نہ معلوم ہو جاتا کہ اب وہاں خدا کی برکت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس قسم کے متعدد واقعات جود و سخا کے عنوان میں مذکور ہیں۔

نزع کے وقت جب انسان ہر چیز کو فراموش کر دیتا ہے، آپ کو یاد آیا کہ حضرت عائشہؓ کے پاس کچھ اشرفیاں رکھوائی تھیں وہ پڑی ہوں گی، اس نازک موقع پر بھی یہ سہو آپ کو توکل علی اللہ کی شان کے خلاف نظر آیا، ارشاد ہوا کہ عائشہؓ! کیا محمدؐ! خدا سے بدگمان ہو کر ملے گا، جاؤ پہلے ان کو خیرات کر دو۔

صبر و شکر

رنج و غم کے متعاقب اور توام دَور کس کی زندگی میں نہیں آتے لیکن انسان کے روحانی کمال کا جوہر یہ ہے کہ ایک طرف حصولِ مقصد اور کامیابی کے نشہ میں سرشار اور از خود رفتہ نہ ہو تو دوسری طرف مصائب و آلام کی تلخی کو خندہ جبینی اور کشادہ دلی کے ساتھ گوارا کر لے اور یقین رکھے کہ انسان کا فرض صرف عمل ہے کامیابی و ناکامیابی کا سررشتہ کسی بالاتر ہستی کے ہاتھ میں ہے، قرآن مجید کی اس آیت میں اسی نکتہ کی طرف اشارہ ہے

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (حدید ٣٠)

جتنی مصیبتیں زمین پر یا خود تم پر نازل ہوتی تھیں وہ ان کے وجود سے پہلے دیوانِ قضا میں لکھی گئی ہیں، یہ بات خدا کے لئے آسان ہے یہ اس لئے کیا گیا تاکہ تم ناکامی پر غم اور حصولِ مقصد پر فخر نہ کرو، خدا مغرور اور فخار کو دوست نہیں رکھتا۔

لہ صحیح مسلم باب السم ٢ہ صحیح بخاری باب من صلی بالناس فذکر حاجۃ فتخطاہم و مسند احمد ج ٦ ص ٢٩٣ ٣ہ ابو داؤد باب قبول الہدایا المشرکین
٤ہ مسند احمد و ابن سعد جزء الوفاۃ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی زندگی میں وہ بڑی سے بڑی کامیابیاں حاصل ہوئیں جو اس آسمان کے نیچے نوع انسان کے کسی فرد کو حاصل ہو سکتی تھیں، تاہم آپؐ کے آئینۂ دل میں کبھی فخر و غرور نے اپنا عکس نہیں ڈالا۔ آپؐ نے فرمایا انا سید ولد آدم ولا فخر۔ میں آدم کے بیٹوں کا سردار ہوں، لیکن مجھے اس پر فخر نہیں۔

عدی بن حاتم طائی نے جو مذہباً عیسائی تھے، آپؐ کے جو حالات سنے تھے ان کی بنا پر ان کو یہ شک تھا کہ آپ بادشاہ ہیں یا پیغمبر؟ جب وہ اپنے قبیلہ کا وفد لے کر حاضر خدمت ہوئے تو عین اسی وقت ایک مسکین سی عورت اپنی کسی غرض کے لئے بارگاہ اقدس میں آئی اور مجمع سے ذرا ہٹ کر کچھ سن لینے کی درخواست کی، آپؐ فوراً اٹھ کھڑے ہوتے اور اس وقت تک گلی میں کھڑے رہے، جب تک وہ خود اپنی مرضی سے چلی نہیں گئی۔ عدی کہتے ہیں کہ آپؐ کی تواضع اور خاکساری کا یہ عالم دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ آپؐ پیغمبر ہیں بادشاہ نہیں[1]۔

مفتوح شہروں میں داخل ہوتے ہوتے دنیا کے ہر فاتح کا سر عزّ و ناز سے بلند ہو جاتا ہے لیکن مکہ و خیبر کا فاتح اس وقت بھی اپنا سر نیاز بارگاہِ ایزدی میں جھکا کر شہروں کے اندر داخل ہوا۔ ابن اسحاق نے روایت کی ہے کہ فتح مکہ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ذی طویٰ میں پہنچے اور دیکھا کہ خدا نے آپؐ کو فتح کی عزت عطا کی ہے تو آپؐ نے اپنی سواری پر توقف کیا۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما انتھی الی ذی طوی وقف علی راحلتہ لیضع رأسہ تواضعا للہ حین رأی ما اکرمہ اللہ من الفتح حتی ان عثنونہ لیکاد یمس واسطۃ الرحل[2]

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ذی طویٰ میں پہنچے اور دیکھا کہ خدا نے آپؐ کو فتح کی عزت عطا کی ہے تو آپؐ نے اپنی سواری پر توقف کیا تا کہ اپنا سر خدا کے سامنے جھکائیں پھر یہاں تک آپؐ جھکے کہ آپؐ کی ٹھڈی قریب تھی کہ کجاوہ کی لکڑی سے لگ جاتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کثرت سے عبادت اور تسبیح و تہلیل کیا کرتے تھے، بعض صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ خدا تو آپؐ کو بے گناہ اور معصوم بنا چکا، اب آپؐ کیوں یہ زحمت اٹھاتے ہیں۔ ارشاد ہوا۔

افلا اکون عبدا شکورا[3]

کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔

یعنی اگر یہ تعبد و تسبیح و تحمید پہلے اس مرتبہ کے حصول کے لئے تھی، تو اب اس مرتبہ کے حصول پر شکر گزاری اور احسان مندی کے اعتراف میں ہے۔ دنیا کے اعاظم رجال جن کو روحانیت کا کوئی حصہ نہیں دیا گیا، اپنی ہر کامیابی کو اپنی قوت بازو، اپنے حسن تدبیر اور اپنے ذاتی رعب و داب کی طرف منسوب کرتے ہیں، لیکن مقربین الٰہی کی اصطلاح میں یہ تخیل شرک و کفر کے ہم پایہ ہے، ان کو ہر کامیابی اور مسرت کے واقعہ کے اندر قادر کل کا دستِ غیبی کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ حدیث میں ہے[4]

انہ کان اذا جاءہ امر سرور او بشر بہ خر ساجدا شاکرا للہ تعالی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب کوئی خوشی کی خبر آتی تھی تو خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کیلئے آپؐ فوراً سجدہ میں گر پڑتے تھے۔

---

[1] سیرت ابن ہشام صفحہ ۳۷۶۔ [2] سیرت ابن ہشام ذکر فتح مکہ۔ [3] صحیح بخاری قیام اللیل۔ [4] ابو داؤد کتاب الجہاد باب فی سجود الشکر۔

قبیلۂ ہمدان کے اسلام لانے کی خبر جب آپؐ کو پہنچی تو آپؐ نے سجدۂ شکر ادا کیا[1]۔ اسی طرح ایک دفعہ اور کسی بات کی آپؐ کو خبر دی گئی تو آپؐ فوراً سجدۂ الٰہی بجا لائے[2]۔ وحی کے ذریعہ سے جب آپؐ کو یہ معلوم ہوا کہ جو مجھ پر درود بھیجے گا اس پر خدا درود بھیجے گا تو اس رفع منزلت پر آپؐ نے سجدۂ شکر ادا کیا[3]۔

حضرت سعدؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ سے مدینہ طیبہ روانہ ہوئے تو جب مقام عزورا کے قریب پہنچے تو سواری سے اتر گئے اور ہاتھ اٹھا کر دیر تک بارگاہِ الٰہی میں دعا کی، پھر سجدہ میں گئے اور دیر تک اسی حالت میں پڑے رہے۔ پھر سر اٹھا کر بدستور دعا کے لئے ہاتھ پھیلائے اور پھر دیر تک سجدہ میں رہے، پھر اٹھ کر تضرع کے ساتھ دعا شروع کی اور اس کے بعد جبین نیاز خاک پر رکھی۔ اس دعا و سجود سے فارغ ہو کر آپؐ نے صحابہ سے فرمایا، میں نے اپنی امت کی مغفرت کے لئے خدا سے دعا مانگی تھی جس کا ایک حصہ مقبول ہوا، میں شکر کے لئے سجدہ میں گرا، پھر مزید درخواست کی اس نے وہ بھی قبول کی میں سجدۂ شکر بجا لایا اور پھر دعا و زاری کی، اس نے اس کو بھی درجہ استجابت بخشا اور پھر میں سجدہ میں گر پڑا[4]۔

سورۂ والضحیٰ میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے اسی وصف کو نمایاں فرمایا ہے۔

وَالضُّحٰی وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی وَلَلْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَهَدٰی وَوَجَدَکَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ (ضحی ۱)

(اے پیغمبر) دن کے پہلے پہر کی قسم اور رات کی قسم جب وہ پردہ ڈال دے کہ تیرے پروردگار نے نہ تو تجھ کو چھوڑا اور نہ تجھ سے ناراض ہوا یقیناً تیری پچھلی زندگی پہلی سے بہتر ہے وہ تجھ کو وہ کچھ دے گا جس سے تو خوش ہو جائے گا، کیا اس نے تجھ کو یتیم نہیں پایا تو پناہ میں لے لیا اور تجھ کو راہ حق کا جویاں پایا تو اس نے سیدھی راہ دکھا دی اور تجھ کو مفلس پایا تو غنی کر دیا، ان نعمتوں کے شکریہ میں اے پیغمبر تم یتیم پر ظلم نہ کرنا اور سائل کو نہ جھڑکنا اور اپنے پروردگار کے احسان کو یاد کرتے رہنا۔

آپؐ کی سوانح زندگی کا حرف حرف شاہد ہے کہ آپؐ عمر بھر کیونکر اس ارشاد ربانی کی تعمیل کرتے رہے۔

صبر کا مفہوم بالکل شکر کے مخالف ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک میں یہ دونوں متضاد اوصاف ایک ساتھ جمع ہو گئے تھے اور آپؐ کو عملاً دونوں کے اظہار کا موقع ملا۔ حدیث شریف میں ہے ایک صحابی نے آپؐ سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ سب سے زیادہ مصیبت کس پر آتی ہے؟ ارشاد ہوا کہ پیغمبروں پر، پھر اسی طرح درجہ بدرجہ لوگوں پر[5]۔ واقعات بھی اس روایت کی تصدیق کرتے ہیں، آپؐ سرور انبیا تھے، اس بنا پر دنیا کے شدائد اور مصائب کا بار اس مقدس گروہ میں سب سے زیادہ آپؐ کے دوش مبارک پر تھا، اسی لئے قرآن مجید میں بار بار آپؐ کو صبر کی تلقین کی گئی ہے۔ سورۂ احقاف میں ہے۔

واصبر کما صبر اولوا العزم من الرسل۔

(اے پیغمبر) جس طرح اولوا العزم پیغمبروں نے صبر کیا تم بھی صبر کرو۔

---

[1] زاد المعاد بحوالہ بیہقی بسند علی شرط البخاری ج ۱ ص ۱۹۵۔ [2] ایضاً۔ [3] مسند احمد عن عبد الرحمن بن عوف۔ [4] ابو داؤد کتاب السجود۔ [5] سنن ابن ماجہ باب الصبر علی البلاء۔

آپؐ ابھی پیدا نہ ہوئے تھے کہ والد نے انتقال کیا، عہدِ طفولیت میں تھے کہ سر سے ماں کا سایہ اٹھ گیا۔ اس کے دو برس کے بعد دادا نے جن کی نگاہِ لطف زخمِ یتیمی کا مرہم تھا وفات پائی۔ نبوت کے بعد ابوطالب نے جو قریش کے ظلم و ستم کے سپر تھے، مفارقت کی، محرمِ اسرار ام المومنین خدیجۃ الکبریٰؓ جو اس ہجومِ مصائب میں آپؐ کی تنہا مونس و غمخوار تھیں موت نے ان کو بھی اسی زمانہ میں آپؐ سے علیحدہ کر دیا۔ والدین اور بیوی کے بعد انسان کو سب سے زیادہ اولاد سے محبت ہوتی ہے جس کی مفارقت کا زخم تمام عمر مندمل نہیں ہوتا، آپؐ کی اولادِ ذکور حسبِ اختلافِ روایت کم سے کم دو اور زیادہ سے زیادہ آٹھ تھی، لڑکیوں کی تعداد چار تھی، لیکن ایک حضرت فاطمہؓ کے سوا سب نے کم سنی یا جوانی میں آپؐ کی نگاہوں کے سامنے جان دی، ان واقعات پر اگرچہ کبھی کبھی آپؐ کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں لیکن زبان و دل پر ہمیشہ سکینت کی مہر لگی رہی اور کبھی کوئی کلمہ زبانِ مبارک سے ایسا نہیں نکلا جس سے کارکنانِ قضا کی شکایت کا پہلو نکلتا ہو۔

آپؐ کی سب سے بڑی صاحبزادی حضرت زینبؓ نے ۸ھ میں وفات پائی تو تجہیز و تکفین کے متعلق آپؐ نے خود بنفسِ نفیس ہدایات دیں، جنازہ قبر کے سامنے رکھا گیا تو آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، لیکن زبانِ مبارک سے ایک لفظ بھی نہ نکلا، حضرت زیدؓ (پروردۂ خاص) اور حضرت جعفرؓ (ابن عم) دونوں آپؐ کو بہت محبوب تھے، غزوۂ موتہ میں اُن کی شہادت کی خبر آئی تو چشمِ مبارک اشک آلود ہو گئی، لیکن اسی اثنا میں حضرت جعفرؓ کے گھر سے نوحہ کی آواز آئی تو آپؐ نے منع کرا بھیجا۔ آپؐ کا ایک نواسہ جس سے آپؐ کو محبت تھی مبتلائے نزع ہوا تو صاحبزادی نے بلا بھیجا، لیکن آپؐ نے اس کے جواب میں سلام کے بعد یہ پیغام بھیجا۔

اناللہ ما اخذ ولہ ما اعطی وکل عندہ باجل مسمّٰی فلتصبر ولتحتسب۔	اللہ نے جو لے لیا وہ اسی کا تھا اور جو دیا وہ بھی اسی کا ہے اس کا ہر کام وقت مقررہ پر ہوتا ہے صبر کرو اور اس سے خیر طلب کرو۔

صاحبزادی نے دوبارہ باصرار بلایا، آپؐ چند صحابہؓ کے ساتھ وہاں تشریف لے گئے، بچہ آپؐ کی گود میں رکھ دیا گیا وہ دم توڑ رہا تھا، آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، ایک صحابی نے کہا یارسول اللہ! یہ کیا ہے؟ فرمایا جذبۂ محبت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دل میں رکھا ہے، خدا اپنے بندوں میں سے رحم دلوں ہی پر رحم کرتا ہے۔

ایک بار آپؐ سعدؓ بن عبادہ کی عیادت کو تشریف لائے اور ان کی حالت دیکھ کر فرمایا کہ "انتقال کر گئے"؟ صحابہؓ نے کہا "نہیں یارسول اللہ"! آپؐ رو پڑے تو آپؐ کو روتے دیکھ کر صحابہ بھی رو پڑے، آپؐ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ آنکھوں کے آنسو اور دل کے غم کو منع نہیں کرتا، لیکن زبان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اس سے عذاب ہوتا ہے حضرت ابراہیمؑ کی وفات کے وقت جب آپؐ کی آنکھوں سے اشکِ محبت جاری ہوئے تو عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے کہا یارسول اللہ یہ کیا بات ہے؟ فرمایا یہ رحمت و شفقت ہے، حضرت عبدالرحمٰنؓ نے دوبارہ گزارش کی، ارشاد ہوا۔

ان العین تدمع والقلب یحزن ولا نقول الا ما یرضیٰ ربنا وانا بفراقك یا ابراھیم لمحزونون	آنکھ اشک ریز ہے دل غمگین ہے لیکن ہم وہی کہیں گے جو ہمارے رب کی مرضی ہو، اے ابراہیم ہم تیرے فراق میں بہت غمگین ہیں۔

ان تمام واقعات کے لئے صحیح بخاری کتاب الجنائز دیکھو۔

بہرحال یہ واقعات آنی ہیں، یعنی اُن کا اثر ایک خاص وقت تک انسان پر رہتا ہے، پھر مٹ جاتا ہے لیکن مسلسل اور غیر منقطع مصائب و حوادث کو اس طرح برداشت کرنا کہ کبھی پیمانۂ صبر لبریز نہ ہونے پائے سخت مشکل ہے۔ ہجرت سے پہلے ۱۳ سال تک طائف اور مکہ کے اشقیاء نے دعوتِ حق کا جس تحقیر و استہزاء سب و شتم تعذیب و ایذا رسانی کے ساتھ جواب دیا، اس کے دہرانے کی حاجت نہیں، مدینہ منورہ میں آٹھ نو برس تک جن خونی معرکوں کا ہمیشہ سامنا رہا اور دشمنوں نے آپؐ کی جلاوطنی اور قتل و شکست کے جو جو منصوبے باندھے، ان کے اعادہ کی بھی ضرورت نہیں، لیکن ان تمام تیروں کی بوچھاڑ صبر کے سوا آپؐ نے کس سپر پر روکی؟

اس سے بھی زیادہ مشکل ان واقعات پر صبر ہے جو خود اختیاری ہوں، فتوحات کی کثرت گو ہر دفعہ بیت المال کو معمور کر دیتی تھی، لیکن دستِ کرم کو اسی وقت آرام ملتا جب سارا خزانہ اربابِ حاجت اور فقراء میں لٹ چکا ہوتا۔ چنانچہ اسی بنا پر آپؐ خود اور تمام اہل بیت کی زندگی اکثر فقر و فاقہ میں گزرتی تھی، جسمِ مبارک کے لئے ایک کے سوا کپڑے کا کوئی دوسرا جوڑا نہیں ہوتا تھا، تاہم یہ تمام شدائد اس لئے گوارا تھے کہ صبر کی لذت الوانِ نعمت کی خوشگواری اور لباس ہائے فاخرہ کی مسرت سے کہیں زیادہ تھی۔

لیکن سب سے زیادہ حوصلہ شکن اور صبر آزما اس تیر کا نشانہ ہے جو دشمنوں کے نہیں بلکہ دوستوں کے ہاتھ سے لگایا جائے، دو دفعہ ایسا ہوا کہ بعض جلد باز نوجوانوں نے آپؐ کے کسی فعل پر جو کسی مصلحت پر مبنی تھا، اعتراض کیا اس موقع پر بھی صبر کا رشتہ آپؐ کے ہاتھ سے نہ چھوٹا، صحیح بخاری میں ہے کہ غنائمِ حنین کے متعلق ایک دو انصاریوں نے اعتراض کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دوسروں کو کیوں دے دیا، حق تو ہمارا تھا، آپؐ کو اس کی خبر پہنچی تو فرمایا۔

رحمۃ اللہ علیٰ موسیٰ قد اوذی اکثر من ذالك فصبر۔	موسیٰؑ پر خدا کی رحمت ہو، وہ اس سے بھی زیادہ (اپنے دوستوں کی طرف سے) ستائے گئے ہیں، لیکن انہوں نے صبر کیا۔

(باب غزوۂ حنین)

*

اخلاقِ نبوی

إِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيمٍ

حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ اقدس کا یہ وہ حصہ ہے جہاں آکر آپ کی زندگی تمام انبیاء کرام اور مصلحین عالم سے علانیہ ممتاز نظر آتی ہے۔ تاریخی ہستی کا ثبوت ایک طرف، اگر یہ سوال کیا جائے کہ ان اخلاقی دعظوں کا خود عملی نمونہ کیا تھا تو دنیا اس کے جواب سے عاجز رہ جائے گی، دنیا کے تمام مصلحینِ اخلاق میں گوتم بدھ اور مسیح کا درجہ سب سے بڑا ہے، لیکن کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ ہندوستان کا یہ مصلح اعظم (بودھ) عملاً کیا تھا؟ کوہِ زیتون کے ریحانہ اخلاق کا واعظ (مسیح) دنیا کو اخلاق کا بہترین درس دیتا تھا، لیکن اس کی زندگی کا ایک واقعہ بھی اس کے زرین مقولوں کی تائید میں تم کو معلوم ہے؟ لیکن مکہ کا معلّم اُمّی پکار کر کہتا تھا۔

لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (بقرہ) — جو نہیں کرتے وہ کہتے کیوں ہو۔

وہ خود اپنی تعلیم کا آپ نمونہ تھا، انسانوں کے مجمع عام میں وہ جو کچھ کہتا تھا گھر کے خلوت کدہ میں وہ اسی طرح نظر آتا تھا، اخلاق و عمل کا جو نکتہ وہ دوسروں کو سکھاتا تھا وہ خود اس کا عملی پیکر بن جاتا تھا، بیوی سے بڑھ کر انسان کے اخلاق کا اور کون رازداں ہو سکتا ہے، چند صاحبوں نے آکر حضرت عائشہؓ سے درخواست کی کہ حضرتؐ کے اخلاق بیان کیجئے، انہوں نے پوچھا کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟ ان خلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان القرآن آپ کا اخلاق ہمہ تن قرآن تھا۔[1]

موجودہ صحائفِ آسمانی اپنے داعیوں کے بہترین اقوال کا مجموعہ ہیں لیکن کیا ان کا ایک حرف بھی اپنے مبلغین کے عمل کا مدعی ہے۔ قرآن مجید لاکھوں مخالفین واہل عناد کی بھیڑ میں اپنے داعی حق کی نسبت گویا تھا۔

إِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيمٍ — اے محمدؐ! تم اخلاق کے بڑے درجہ پر ہو۔

بے درد نکتہ چین آج تیرہ سو برس کے بعد آپ کو سنگ دل کہتے ہیں، لیکن اس وقت جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا قرآن خود دشمنوں کے مجمع میں آپ کی نسبت کیا شہادت دے رہا تھا۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران) — خدا کی عنایت سے تم ان سے نرمی پیش آتے ہو، اگر تم کہیں کج خلق اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ تمہارے آس پاس سے ہٹ جاتے۔

دوسری جگہ کہتا ہے۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (توبہ) — تمہارے پاس تم میں سے خود ایک پیغمبر آیا، اس پر تمہاری تکلیف بہت شاق گزرتی ہے تمہاری بھلائی کا وہ بھوکا ہے، اہل ایمان پر نہایت نرم اور مہربان ہے۔

[1] ابوداؤد باب الصلوٰۃ فی اللیل۔

مسئلہ اخلاق کی نسبت ایک بڑی غلطی یہ کی گئی ہے کہ صرف رحم و رافت اور تواضع و خاکساری کو پیغمبرانہ اخلاق کا مظہر قرار دے دیا گیا، حالانکہ اخلاق وہ چیز ہے جو زندگی کی ہر حالت میں اور واقعات کے ہر پہلو میں نمایاں ہوتی ہے، دوست و دشمن، عزیز و بیگانہ، صغیر و کبیر، مفلس و تونگر، صلح و جنگ، خلوت و جلوت، غرض ہر جگہ اور ہر ایک تک دائرہ اخلاق کی وسعت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عنوانِ اخلاق پر اسی حیثیت سے نظر ڈالنی چاہیئے۔

اخلاقِ نبوی کا جامع بیان

اس سے پہلے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق مبارکہ کے جزئی اور تفصیلی واقعات لکھے جائیں، ان صاحبوں کے بیانات زیر تحریر آتے ہیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سالہا سال اور مدت ہائے دراز بسر کی ہیں اور جو آپ کے اخلاق و عادات کے دفتر کے ایک ایک حرف سے واقف تھے، انسان کے حالات کا واقف کار بیوی سے بڑھ کر دنیا میں کون ہو سکتا ہے، حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ جو نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد ۲۵ برس تک آپ کی خدمتِ زوجیت میں رہی تھیں، زمانہ آغازِ وحی میں آپ کو ان الفاظ میں تسلی دیتی تھیں "ہرگز نہیں، خدا کی قسم! خدا آپ کو کبھی غمگین نہ کرے گا، آپ صلہ رحم کرتے ہیں، مقروضوں کا بار اٹھاتے ہیں، غریبوں کی اعانت کرتے ہیں، مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں، حق کی حمایت کرتے ہیں، مصیبتوں میں لوگوں کے کام آتے ہیں۔"[1]

امہات المومنین میں حضرت عائشہؓ سے بڑھ کر کسی نے آپ کے اوصاف تفصیل سے نہیں بیان کئے ہیں فرماتی ہیں "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کسی کو برا بھلا کہنے کی نہ تھی، برائی کے بدلہ میں برائی نہیں کرتے تھے بلکہ درگزر کرتے تھے اور معاف فرما دیتے تھے۔[2] آپ کو جب دو باتوں میں اختیار دیا جاتا تو ان میں جو آسان ہوتی اس کو اختیار فرماتے بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہو، ورنہ آپ اس سے بہت دور ہوتے۔ آپ نے کبھی کسی سے اپنے ذاتی معاملہ میں انتقام نہیں لیا، لیکن جو احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرتا خدا اس سے انتقام لیتا تھا۔[3] (یعنی خدا کی طرف سے بموجب احکام ربانی آپ اس پر حد جاری فرماتے تھے) آپ نے نام لے کر کبھی کسی مسلمان پر لعنت نہیں کی، آپ نے کبھی کسی غلام کو، لونڈی کو، کسی عورت کو، جانور کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا، آپ نے کسی کی کوئی درخواست رد نہیں فرمائی لیکن یہ کہ وہ ناجائز ہو۔[4] آپ جب گھر کے اندر تشریف لاتے تو نہایت خنداں بہنستے اور مسکراتے ہوئے، دوستوں میں پاؤں پھیلا کر نہیں بیٹھتے تھے۔[5] باتیں ٹھہر ٹھہر کر اس طرح فرماتے تھے کہ کوئی یاد رکھنا چاہے تو رکھ لے۔"[6]

حضرت علیؓ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ تھے اور آغازِ نبوت سے آخر تک کم از کم ۲۳ برس آپ کی خدمتِ اقدس میں رہے تھے، ایک دفعہ حضرت امام حسینؓ نے ان سے آپ کے اخلاق و عادات کی نسبت سوال کیا، فرمایا آپ خندہ جبین، نرم خو، مہربان طبع تھے، سخت مزاج اور تنگ دل نہ تھے، بات بات پر شور نہیں کرتے تھے، کوئی برا کلمہ منہ سے کبھی نہیں نکالتے تھے، عیب جو اور تنگ گیر نہ تھے، کوئی ایسی بات ہوتی جو آپ

[1] صحیح بخاری باب بدء الوحی [2] جامع ترمذی و شمائل ترمذی [3] صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد کتاب الادب [4] یہ تفصیل مسلم اور ابوداؤد وغیرہ احادیث کی مختلف روایات میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے [5] حاکم بسند متصل اس کے بعض ٹکڑے صحیح مسلم میں بھی ہیں [6] ابن سعد [7] صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد۔

کو ناپسند ہوتی تو اس سے اغماض فرماتے تھے، کوئی آپ سے اس کی امید رکھتا تو نہ اس کو مایوس کرتے تھے اور نہ منظوری ظاہر فرماتے تھے، یعنی صراحۃً انکار و تردید نہیں کرتے تھے بلکہ خاموش رہتے تھے اور مزاج شناس آپ کے تیور سے آپ کا مقصد سمجھ جاتے تھے، اپنے نفس سے تین چیزیں آپ نے بالکل دور کردی تھیں، بحث و مباحثہ، ضرورت سے زیادہ بات کرنا اور جو بات مطلب کی نہ ہو اس میں پڑنا، دوسروں کے متعلق بھی تین باتوں سے پرہیز کرتے تھے، کسی کو برا نہیں کہتے تھے، کسی کی عیب گیری نہیں کرتے تھے، کسی کے اندرونی حالات کی ٹوہ میں نہیں رہتے تھے، وہی باتیں کرتے تھے جن سے کوئی مفید نتیجہ نکل سکتا تھا، جب آپ کلام کرتے تو صحابہ اس طرح خاموش ہو کر اور سر جھکا کر سنتے گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں، جب آپ چپ ہو جاتے تو پھر وہ آپس میں بات چیت کرتے، کوئی دوسرا بات کرتا تو جب تک وہ بات ختم نہ کر لیتا چپ سنا کرتے۔ لوگ جن باتوں پر ہنستے آپ بھی مسکرا دیتے، جن پر لوگ تعجب کرتے آپ بھی کرتے۔ کوئی باہر کا آدمی اگر بے باکی سے گفتگو کرتا تو آپ تحمل فرماتے، دوسروں کے منہ سے اپنی تعریف سننا پسند نہیں کرتے تھے، لیکن اگر کوئی آپ کے احسان و انعام کا شکریہ ادا کرتا تو قبول فرماتے۔ جب تک بولنے والا خود چپ نہ ہو جاتا آپ اس کی بات درمیان سے نہیں کاٹتے تھے۔ نہایت فیاض، نہایت راست گو، نہایت نرم طبع اور نہایت خوش صحبت تھے۔ اگر کوئی دفعۃً آپ کو دیکھتا تو مرعوب ہو جاتا لیکن جیسے جیسے آشنا ہوتا جاتا آپ سے محبت کرنے لگتا[1]۔

ہند بن ابی ہالہ جو گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آغوش پروردہ تھے، وہ بیان کرتے ہیں[2] کہ آپ نرم خو تھے، سخت مزاج نہ تھے، کسی کی توہین روا نہ رکھتے تھے، چھوٹی چھوٹی باتوں پر اظہار شکر فرماتے تھے، کسی چیز کو برا نہیں کہتے تھے، کھانا جس قسم کا سامنے آتا تناول فرماتے اور اس کو برا بھلا نہ کہتے، کوئی اگر کسی امر حق کی مخالفت کرتا تو آپ کو غصہ آ جاتا اور اس کی پوری حمایت کرتے، لیکن خود اپنے ذاتی معاملہ پر کبھی آپ کو غصہ نہیں آیا اور نہ کسی سے انتقام لیا[3]۔

مداومت عمل

اخلاق کا سب سے مقدم اور ضروری پہلو یہ ہے کہ انسان جس کام کو اختیار کرے اس پر اس قدر استقلال کے ساتھ قائم رہے کہ گویا وہ اس کی فطرت ثانیہ بن جائے، انسان کے سوا تمام دنیا کی مخلوقات صرف ایک ہی قسم کا کام کر سکتی ہے اور وہ فطرۃً اسی پر مجبور ہے۔ آفتاب صرف روشنی بخشتا ہے اس سے تاریکی کا صدور نہیں ہو سکتا، رات تاریکی ہی پھیلاتی ہے، وہ روشنی کی علت نہیں، درخت اپنے موسم ہی میں پھلتے ہیں اور پھول ایام بہار ہی میں پھولتے ہیں، حیوانات کا ایک ایک فرد اپنے نوعی افعال و اخلاق سے ایک سر مو تجاوز نہیں کر سکتا۔ لیکن انسان خدا کی طرف سے مختار پیدا ہوا ہے، وہ آفتاب بھی ہے اور رات کی تاریکی بھی، اس کے جوہر کا درخت ہر موسم میں پھلتا ہے اور اس کے اخلاق کے پھول ایام بہار کے پابند نہیں، وہ حیوانات کی طرح کسی ایک ہی خاص قسم کے اعمال و اخلاق پر مجبور نہیں، اس کو اختیار دیا گیا ہے اور یہی اختیار اور اس کے مکلف اور ذمہ دار ہونے کا اثر ہے۔ لیکن اخلاق کا ایک دقیق نکتہ یہ ہے کہ انسان اپنے لئے

---

[1] پوری تفصیل شمائل ترمذی بیان اخلاق میں ہے [2] یہ ٹکڑا شمائل ترمذی بیان حلیہ مبارک میں ہے [3] شمائل ترمذی۔

اخلاق حسنہ کا جو پہلو پسند کرے اس کی شدت سے پابندی کرے، اور اس طرح دائمی اور غیر متبدل طریقے سے اس پر عمل کرے کہ گویا وہ اپنے اختیار کے باوجود اس کام کے کرنے پر مجبور ہے۔ اور لوگ دیکھتے دیکھتے یہ یقین کرلیں کہ اس شخص سے اس کے علاوہ اور کوئی بات سرزد ہو ہی نہیں سکتی۔ گویا اس سے یہ افعال اس طرح صادر ہوتے ہیں جیسے آفتاب سے روشنی، درخت سے پھل اور پھول سے خوشبو کہ یہ خصوصیات ان سے کسی حالت میں الگ نہیں ہو سکتیں۔ اسی کا نام استقامت حال اور مداومت عمل ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام کاموں میں اسی اصول کی پابندی فرماتے تھے، جس کام کو جس طریقہ سے جس وقت آپ نے شروع فرمایا اس پر برابر شدت کے ساتھ قائم رہتے تھے۔ سُنّت کا لفظ ہماری شریعت میں اسی اصول سے پیدا ہوا ہے، سنت وہ فعل ہے جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ مداومت فرمائی ہے اور بغیر کسی قوی مانع کے کبھی اس کو ترک نہیں فرمایا۔ اس بنا پر جس قدر سنن ہیں وہ درحقیقت آپ کی استقامت حال اور مداومت عمل کی ناقابل انکار مثالیں ہیں، آپ کے معمولات کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے، جس سے یہ معلوم ہوا کہ آپ کے تمام اخلاق و اعمال کس قدر پختہ اور مستحکم تھے کہ کبھی تمام عمر ان میں ایک ذرہ فرق نہیں پیدا ہوا۔ ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عبادات و اعمال کے متعلق حضرت عائشہؓ سے دریافت فرمایا کہ کیا آپ کسی خاص دن یہ کہتے تھے؟ انہوں نے جواب دیا۔ لا کان عملہ دیمۃ۔ آپ کا عمل جھڑی ہوتا تھا، یعنی جس طرح بادل کی جھڑی برسنے پر آتی ہے تو نہیں رکتی، اسی طرح آپ کا حال تھا کہ جو بات ایک دفعہ آپ نے اختیار کرلی ہمیشہ اس کی پابندی کی، پھر فرمایا وایکم یستطیع ما کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یستطیع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو کر سکتے تھے وہ تم سے کون کر سکتا ہے[1]۔ دوسری روایت میں ہے۔

وکان اذا عمل عملا اثبتہ[2]۔ — جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کوئی کام کرتے تھے تو اس پر مداومت فرماتے تھے

اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خود ارشاد ہے۔

ان احب العمل الی اللہ ادومہ۔ — خدا کے نزدیک سب سے محبوب وہ ہے جس پر سب سے زیادہ انسان مداومت کرے

آپ راتوں کو اٹھ کر عبادت کیا کرتے تھے، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی رات کی عبادت ترک نہیں کی۔ اگر کبھی مزاج اقدس ناساز یا سست ہوا تو بیٹھ کر ادا کرتے تھے[3]۔

جریرؓ بن عبد اللہ ایک صحابی ہیں، جن کو دیکھ کر آپ محبت سے مسکرا دیا کرتے تھے، ان کا بیان ہے کہ کبھی ایسا نہ ہوا کہ میں خدمت اقدس میں حاضر ہوا ہوں اور آپ نے مسکرا نہ دیا ہو[4]۔

جس کام کے کرنے کا جو وقت آپ نے مقرر کر لیا تھا اس میں کبھی تخلف نہ ہوا، نماز اور تسبیح و تہلیل کے اوقات، نوافل کی تعداد، خواب اور بیداری کے مقررہ ساعات، ہر شخص سے ملنے جلنے کے طرز و انداز میں کبھی فرق نہ آیا، اب وہی مسلمانوں کی زندگی کا دستور العمل ہے۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الرقاق [2] ابو داؤد آخر کتاب الصلوٰۃ و صحیح بخاری کتاب الادب [3] ایضاً [4] ابو داؤد قیام اللیل۔
[5] صحیح مسلم مناقب جریرؓ بن عبد اللہ۔

حسن خلق

حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت انسؓ، حضرت ہندؓ بن ابی ہالہ وغیرہ جو مدتوں آپ کی خدمت میں رہے ہیں، ان سب کا متفقہ بیان ہے کہ آپ نہایت نرم مزاج، خوش اخلاق اور نیکو سیرت تھے، آپ کا چہرہ ہنستا تھا، وقار و متانت سے گفتگو فرماتے تھے، کسی کی خاطر شکنی نہیں کرتے تھے،

معمول یہ تھا کسی سے ملنے کے وقت ہمیشہ پہلے خود سلام و مصافحہ فرماتے، کوئی شخص جھک کر آپ کے کان میں کچھ بات کہتا تو اس وقت تک اس کی طرف سے رُخ نہ پھیرتے، جب تک وہ خود منہ نہ ہٹا لے، مصافحہ میں بھی یہی معمول تھا یعنی کسی سے ہاتھ ملاتے تو جب تک وہ خود نہ چھوڑ دے، اس کا ہاتھ نہ چھوڑتے، مجلس میں بیٹھتے تو آپ کے زانو کبھی ہمنشینوں سے آگے نکلے ہوئے نہ ہوتے[1]۔ اکثر نوکر چاکر، لونڈی، غلام خدمتِ اقدس میں پانی لے کر آتے کہ آپ اس میں ہاتھ ڈال دیں تاکہ متبرک ہو جائے، جاڑوں کا دن اور صبح کا وقت ہوتا تاہم آپ کبھی انکار نہ فرماتے[2]۔

ایک دفعہ آپ سعدؓ بن عبادہ سے ملنے گئے، واپس آنے لگے تو انھوں نے اپنے صاحبزادہ قیسؓ کو ساتھ کر دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب جائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قیسؓ سے کہا تم بھی میرے اونٹ پر سوار ہو لو، انھوں نے بے ادبی کے لحاظ سے تامل کیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ یا سوار ہو لو یا گھر واپس جاؤ، وہ واپس چلے آئے[3]۔

ایک دفعہ نجاشی کے ہاں سے ایک سفارت آئی، آپ نے اس کو اپنے ہاں مہمان رکھا اور خود بہ نفس نفیس مہمانداری کے تمام کام انجام دیتے، صحابہ نے عرض کی کہ ہم یہ خدمت انجام دیں گے۔ ارشاد ہوا کہ ان لوگوں نے میرے دوستوں کی خدمت گزاری کی ہے، اس لئے میں خود ان کی خدمت گزاری کرنا چاہتا ہوں[4]۔

عتبانؓ بن مالک جو اصحاب بدر میں تھے ان کی بینائی میں فرق آگیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر درخواست کی کہ میں اپنے محلہ کی مسجد میں نماز پڑھاتا ہوں لیکن جب بارش ہو جاتی ہے تو مسجد تک جانا مشکل ہو جاتا ہے، اس لئے اگر آپ میرے گھر میں تشریف لا کر نماز پڑھ لیتے تو میں اسی جگہ کو سجدہ گاہ بنا لیتا۔ دوسرے دن صبح کے وقت آپ حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر ان کے گھر گئے اور دروازہ پر ٹھہر کر اذن مانگا، اندر سے جواب آیا تو گھر میں تشریف لے گئے اور دریافت فرمایا کہ کہاں نماز پڑھوں؟ جگہ بتا دی۔ آپ نے تکبیر کہہ کر دو رکعت نماز ادا کی۔ نماز کے بعد لوگوں نے کھانے کے لئے اصرار کیا۔ خزیرہ ایک کھانا ہوتا ہے، قیمہ پر آٹا چھڑک کر تیار کرتے ہیں، وہ سامنے آیا، محلہ کے تمام لوگ کھانے میں شریک ہوتے۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا مالک بن دخشن نظر نہیں آتے۔ ایک نے کہا وہ منافق ہے۔ ارشاد فرمایا یہ نہ کہو، وہ لا الٰہ الا اللہ کہتے ہیں۔ لوگوں نے کہا، ہاں! ان کا میلان منافقین کی طرف ہے۔ آپ نے فرمایا جو شخص خدا کی مرضی کے لئے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے، خدا اس پر آگ کو حرام کر دیتا ہے[5]۔

---

[1] ابو داؤد و ترمذی [2] صحیح مسلم باب فی قرب النبی صلی اللہ علیہ وسلم من الناس [3] سنن ابی داؤد کتاب الادب [4] شرح شفائے قاضی عیاض بحوالہ دلائل بیہقی جلد اخلاق [5] بخاری ج ۱ ص ۶۱ کتاب الصلوٰۃ۔

(ابتدائے ہجرت میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مہاجرین انصار کے گھر میں مہمان رہے تھے، دس دس آدمیوں کی ایک ایک جماعت ایک ایک گھر میں مہمان اتاری گئی تھی، مقدادؓ بن الاسود کہتے ہیں کہ میں اس جماعت میں تھا جس میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شامل تھے، گھر میں چند بکریاں تھیں جن کے دودھ پر گزارا تھا، دودھ دُوھ چکتا تو سب لوگ اپنے اپنے حصہ کا پی لیتے اور آپ کے لئے پیالہ میں چھوڑ دیتے۔ ایک شب کا واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری میں تاخیر ہوئی، لوگ دودھ پی پی کر سو رہے۔ آپ نے آکر دیکھا تو پیالہ خالی پایا، خاموش ہو رہے، پھر فرمایا، خدایا جو آج کھلا دے اس کو تو بھی کھلا دینا۔ حضرت مقدادؓ چھری لے کر کھڑے ہوئے کہ بکری کو ذبح کر کے گوشت پکائیں۔ آپ نے روکا اور بکری کو دوبارہ دوہ کر جو کچھ نکلا اسی کو پی کر سو رہے اور کسی کو اس فعل پر ملامت نہ کی[1])

ابو شعیبؓ ایک انصاری تھے، ان کا غلام بازار میں گوشت کی دوکان رکھتا تھا، ایک دن وہ خدمتِ اقدس میں آئے۔ آپ صحابہ کے حلقہ میں تشریف فرما تھے اور چہرہ سے بھوک کا اثر پیدا تھا، ابو شعیبؓ نے جا کر غلام سے کہا کہ پانچ آدمیوں کا کھانا تیار کرو۔ کھانا تیار ہو چکا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ صحابہ کے ساتھ قدم رنجہ فرمائیں، کل پانچ آدمی تھے، راہ میں ایک اور شخص ساتھ ہو لیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو شعیبؓ سے کہا یہ شخص بے کہے ساتھ ہو لیا ہے، تم اجازت دو تو یہ بھی ساتھ آئے ورنہ رخصت کر دیا جائے۔ انھوں نے کہا آپ ان کو بھی ساتھ لائیں[2]۔

عقبہؓ بن عامر ایک صحابی تھے، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہاڑ کے درہ میں اونٹ پر سوار جا رہے تھے، یہ بھی ساتھ تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا کہ آؤ سوار ہو لو۔ اس کو گستاخی سمجھ کر رسول اللہ کو پیادہ بنا کر خود سوار ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ کہا۔ اب انکار کرنا امتثالِ امر کے خلاف تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اتر پڑے اور یہ سوار ہوئے[3]۔

مجالسِ صحبت میں لوگوں کی ناگوار باتوں کو برداشت فرماتے اور اس کا اظہار نہ کرتے۔ حضرت زینبؓ سے جب نکاح ہوا اور دعوتِ ولیمہ کی تو کچھ لوگ کھانا کھا کر وہیں بیٹھے رہے، اس وقت پردہ کا حکم نازل نہیں ہوا تھا اور حضرت زینبؓ بھی مجلس میں شریک تھیں، آپ چاہتے تھے کہ لوگ اٹھ جائیں، لیکن زبان سے کچھ نہیں فرماتے تھے لوگوں نے کچھ خیال نہ کیا، آپ اٹھ کر حضرت عائشہؓ کے حجرہ تک گئے، واپس آئے تو اسی طرح مجمع موجود تھا، پھر واپس چلے گئے اور دوبارہ تشریف لائے۔ پردہ کی آیت اسی موقع پر اتری[4]۔

غزوۂ حنین سے واپس آ رہے تھے کہ راہ میں نماز کا وقت آگیا، حسبِ دستور ٹھہر گئے، مؤذن نے اذان دی۔ ابو محذورہ جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے، چند دوستوں کے ساتھ گشت لگا رہے تھے، اذان سن کر سب نے چلا چلا کر استہزاء کے طور پر اذان کی نقل اتارنی شروع کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو بلوا کر ایک ایک سے اذان کہلوائی، ابو محذورہ خوش لحن تھے ان کی آواز پسند آئی، سامنے بٹھا کر سر پر ہاتھ پھیرا اور برکت کیلئے

---

[1] مسند ابن حنبل ج ۶ ص ۳ [2] بخاری ص ۸۱ [3] نسائی ص ۸۰۳ [4] بخاری ص ۹۲۲ باب آیۃ الحجاب۔

دعا کی، پھر ان کو اذان سکھا کر ارشاد فرمایا کہ جاؤ اسی طرح حرم میں اذان دیا کرو۔[1]

ایک صحابی کا بیان ہے کہ بچپن میں انصار کے نخلستان میں چلا جاتا اور ڈھیلوں سے مار کر کھجوریں گراتا، لوگ مجھ کو خدمتِ اقدس میں لے گئے، آپ نے پوچھا ڈھیلے کیوں چلاتے ہو؟ میں نے کہا کھجوروں کے لئے، ارشاد فرمایا زمین پر ٹپکی ہوئی کھجوریں کھا لیا کرو، ڈھیلے نہ مارو، یہ کہہ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا دی۔[2]

عباد بن شرحبیل مدینہ میں ایک صاحب تھے۔ ایک دفعہ قحط پڑا اور بھوک کی حالت میں ایک باغ میں گھس گئے اور خوشے توڑ کر کچھ کھائے، کچھ دامن میں رکھ لئے، باغ کے مالک کو معلوم ہوا تو اس نے آکر ان کو مارا اور کپڑے اتروا لئے۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایت لے کر آئے۔ مدعا علیہ بھی ساتھ تھا۔ آپ نے اس کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ یہ جاہل تھا اس کو تعلیم دینا تھا، یہ بھوکا تھا اس کو کھانا کھلانا تھا، یہ کہہ کر کپڑے واپس دلوائے اور ساٹھ صاع غلہ اپنے پاس سے عنایت فرمایا۔[3]

یہود کا دستور تھا کہ عورتوں کو جب ایام آتے تو ان کو گھروں سے نکال دیتے اور ان کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں تشریف لاتے تو انصار نے آپ سے اس کے متعلق سوال کیا، اس پر یہ آیت اتری کہ اس حالت میں مقاربت ناجائز ہے، اسی بناء پر آپ نے حکم دیا کہ مقاربت کے سوا کوئی چیز منع نہیں، یہودیوں نے آپ کا حکم سنا تو بولے کہ یہ شخص بات بات میں ہماری مخالفت کرتا ہے، صحابہؓ آپ کی خدمت میں آئے کہ یہود جب یہ کہتے ہیں تو ہم مقاربت بھی کیوں نہ کریں، رخسارۂ مبارک غصہ سے سرخ ہوگیا۔ دونوں صاحب چلے گئے۔ آپ نے ان کے پاس کچھ کھانے کی چیزیں بھیجیں۔ اس وقت ان کو تسکین ہوئی کہ آپ ناراض نہ تھے۔[4]

کسی شخص کی کوئی بات ناپسند آتی تو اکثر اُس کے سامنے اس کا تذکرہ نہ فرماتے۔ ایک دفعہ ایک صاحب عرب کے دستور کے مطابق زعفران لگا کر خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے کچھ نہ فرمایا، جب وہ اٹھ کر چلے گئے تو لوگوں سے کہا کہ ان سے کہہ دینا کہ یہ رنگ دھو ڈالیں۔[5]

ایک دفعہ ایک شخص نے باریابی کی اجازت چاہی، آپ نے فرمایا اچھا آنے دو، وہ اپنے قبیلہ کا اچھا آدمی نہیں ہے، لیکن جب وہ خدمت مبارک میں حاضر ہوا تو نہایت نرمی کے ساتھ اس سے گفتگو فرمائی۔ حضرت عائشہؓ کو اس پر تعجب ہوا اور آپ سے دریافت فرمایا کہ آپ تو اس کو اچھا نہیں سمجھتے تھے، پھر اس رفق و ملاطفت کے ساتھ کلام کیا۔ آپ نے فرمایا خدا کے نزدیک سب سے برا وہ شخص ہے جس کی بدزبانی کی وجہ سے لوگ اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیں۔[6] یہود جس درجہ شقی اور دشمنِ اسلام تھے، اس کا اندازہ گزشتہ واقعات سے ہو چکا ہوگا بایں ہمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سنگدلوں کے ساتھ ہمیشہ نرمی اور لطف کا برتاؤ کرتے اور ان سے داد و ستد رکھتے، سخت سے سخت غصہ کی حالت میں صرف اس قدر فرماتے کہ اس کی پیشانی خاک آلود ہو۔

[1] دار قطنی مطبوعہ دہلی ج ۱ ص ۸۶ کتاب الصلوٰۃ [2] ابوداؤد کتاب الجہاد [3] ایضاً [4] ابوداؤد مواکلۃ الحائض [5] ابوداؤد ج ۲ کتاب الادب
[6] صحیح بخاری و ابوداؤد ج ۲ کتاب الادب باب حسن العشرۃ و باب الرجل [7] ادب المفرد امام بخاری۔

حضرت جابرؓ بن عبداللہ انصاری کہتے ہیں کہ مدینہ میں ایک یہودی رہتا تھا جس سے میں قرض لیا کرتا تھا، ایک سال اتفاق سے کھجوریں نہیں پھلیں اور قرضہ ادا نہ ہو سکا، اس پر پورا سال گزر گیا، بہار آئی تو یہودی نے تقاضا شروع کیا۔ اب کے بھی پھل کم آئے، میں نے آئندہ فصل کی مہلت مانگی، اس نے انکار کیا۔ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر تمام واقعات بیان کئے۔ آپ چند صحابہ کے ساتھ خود یہودی کے گھر تشریف لے گئے اور سمجھایا کہ مہلت دے دو۔ اس نے کہا ابوالقاسم! میں کبھی مہلت نہ دوں گا۔ آپ نخلستان میں تشریف لے گئے اور ایک چکر لگا کر پھر یہودی کے پاس آئے اور اس سے گفتگو کی، لیکن وہ کسی طرح راضی نہ ہوا، بالآخر آپ نے مجھے فرمایا کہ چبوترہ پر (جو مسقف تھا) فرش بچھا دو، اس پر آرام فرمایا اور سو گئے، سو کر اٹھے تو پھر یہودی سے خواہش ظاہر کی کہ مہلت دے دو، اس شقی نے اب بھی نہ مانا، آپ درختوں کے جھنڈ میں جا کر کھڑے ہو گئے اور جابرؓ سے کہا کہ کھجوریں توڑنی شروع کرو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے اتنی کھجوریں نکلیں کہ یہودی کا قرض ادا کر کے بچ رہیں۔[1]

مجلسِ نبوی میں جگہ بہت کم ہوتی تھی، جو لوگ پہلے سے آکر بیٹھ جاتے تھے اُن کے بعد جگہ باقی نہیں رہتی تھی، ایسے موقع پر اگر کوئی آجاتا تو اس کے لئے آپ خود اپنی ردائے مبارک بچھا دیتے تھے، ایک دفعہ مقام جعرانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے اور اپنے ہاتھوں سے لوگوں کو گوشت تقسیم فرما رہے تھے کہ اتنے میں ایک عورت آئی اور آپ کے پاس چلی گئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو اس کی نہایت تعظیم کی، اپنی چادر مبارک اس کے لئے بچھا دی۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے دریافت کیا کہ یہ کون عورت تھی؟ تو لوگوں نے کہا یہ حضورؐ کی رضاعی ماں تھیں۔[2]

اسی طرح ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے کہ آپ کے رضاعی والد آئے آپ نے ان کے لئے چادر کا ایک گوشہ بچھا دیا، پھر رضاعی ماں آئیں، آپ نے دوسرا گوشہ بچھا دیا، آخر میں رضاعی بھائی آئے تو آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کو اپنے سامنے بٹھا لیا۔[3]

حضرت ابوذرؓ مشہور صحابی ہیں، ایک دفعہ ان کو بلا بھیجا تو وہ گھر میں نہیں ملے، تھوڑی دیر کے بعد حاضرِ خدمت ہوئے تو آپ لیٹے ہوئے تھے، ان کو دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے سینہ سے لگا لیا۔[4] حضرت جعفرؓ بھی جب حبشہ سے واپس آئے تو ان کو گلے لگا لیا اور ان کی پیشانی کو بوسہ دیا۔[5] سلام میں پیش دستی فرماتے، راستہ میں جب چلتے تو مرد، عورتیں، بچے جو سامنے آتے ان کو سلام کرتے، ایک دفعہ آپ راستہ سے گزر رہے تھے، ایک مقام پر مسلمان اور منافق و کافر یکجا بیٹھے ملے آپ نے سب کو سلام کیا۔[6]

کسی کی کوئی بات بری معلوم ہوتی تو مجلس میں نام لے کر اس کا ذکر نہیں کرتے تھے بلکہ صیغۂ تعمیم کے ساتھ فرماتے تھے کہ لوگ ایسا کرتے ہیں، لوگ ایسا کہتے ہیں، بعض لوگوں کی یہ عادت ہے، یہ طریقۂ ابہام اس لئے فرماتے

[1] بخاری ص ۸۱۸ باب الرطب والتمر [2] ابوداؤد کتاب الادب [3] ایضاً بر الوالدین [4] ابوداؤد کتاب الادب باب المعانقۃ [5] حوالہ سابق [6] بخاری
وابوداؤد باب السلام [7] بخاری باب السلام علی جماعۃ فیہا الکافر۔

تھے کہ شخص مخصوص کی ذلت نہ ہو اور اس کے احساسِ غیرت میں کمی نہ آجائے۔

حسنِ معاملہ اگرچہ غایت فیاضی کی وجہ سے اکثر مقروض رہتے تھے، یہاں تک کہ وفات کے وقت بھی آپؐ کی زرہ من بھر غلہ پر ایک یہودی کے ہاں گروی تھی، لیکن ہر حال میں حسنِ معاملت کا سخت اہتمام تھا۔ مدینہ میں دولت مند عموماً یہودی تھے اور اکثر ان ہی سے آپؐ قرض لیا کرتے۔ یہودی عموماً دنی الطبع اور سخت گیر ہوتے تھے، آپؐ ان کی ہر قسم کی بدمزاجیاں برداشت فرماتے تھے۔

(نبوت سے پہلے جن لوگوں سے آپؐ کے تاجرانہ تعلقات تھے، انہوں نے ہمیشہ آپؐ کی دیانت اور حسنِ معاملہ کا اعتراف کیا ہے، اسی لئے قریش نے متفقاً آپؐ کو امین کا خطاب دیا تھا، نبوت کے بعد بھی گو قریش بغض و کینہ کے جوش سے لبریز تھے تاہم ان کی دولت کے لئے مامون مقام آپؐ ہی کا کاشانہ تھا، عرب میں سائبؓ نام ایک تاجر تھے، وہ مسلمان ہو کر بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوئے، لوگوں نے مدحیہ الفاظ میں آپؐ سے ان کا تعارف کرایا آپؐ نے فرمایا: "میں ان کو تم سے زیادہ جانتا ہوں"۔ سائبؓ نے کہا، میرے ماں باپ فدا، آپؐ میرے ساجھی تھے لیکن ہمیشہ معاملہ صاف رکھا۔[1])

ایک دفعہ ایک شخص سے کچھ کھجوریں قرض کے طور پر لیں، چند روز کے بعد وہ تقاضے کو آیا، آپؐ نے ایک انصاری کو حکم دیا کہ اس کا قرضہ ادا کر دیں اور انصاری نے کھجوریں دیں لیکن ویسی عمدہ نہ تھیں جیسی اس نے دی تھیں، اس شخص نے لینے سے انکار کیا، انصاری نے کہا تم رسول اللہؐ کی عطا کردہ کھجور کے لینے سے انکار کرتے ہو؟ بولا ہاں رسول اللہ عدل نہ کریں گے تو اور کس سے توقع رکھی جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جملے سنے تو آپؐ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور فرمایا کہ یہ بالکل سچ ہے۔[2]

ایک دن ایک بدو آیا جس کا کچھ قرضہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تھا، بدو عموماً وحشی مزاج ہوتے ہیں، اس نے نہایت سختی سے گفتگو شروع کی، صحابہ نے اس گستاخی پر اس کو ڈانٹا اور کہا کہ تجھ کو خبر ہے کہ تو کس سے ہمکلام ہے؟ بولا کہ میں تو اپنا حق مانگ رہا ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے ارشاد فرمایا کہ تم لوگوں کو اسی کا ساتھ دینا چاہیئے کیونکہ اس کا حق ہے (قرض خواہ کو بولنے کا حق ہے) اس کے بعد صحابہ کو اس کا قرض ادا کر دینے کا حکم صادر فرمایا اور زیادہ دلوایا۔[3]

ایک غزوہ میں حضرت جابر بن عبد اللہ انصاریؓ ہم رکاب تھے، ان کی سواری میں جو اونٹ تھا وہ سست رو تھا اور تھک جانے کی وجہ سے اور بھی سست ہو گیا تھا، آپؐ نے اونٹ اُن سے خرید لیا اور دام کے ساتھ اونٹ بھی اُن کو دے دیا کہ دونوں تمہارے ہیں۔[4]

یہی واقعہ ایک روایت میں اس طرح پر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا تمہارے پاس کوئی لکڑی ہو تو دو، انہوں نے دی۔ آپؐ نے اس سے اونٹ کو مارا تو وہ اس قدر تیز دوڑنے لگا کہ سب سے آگے نکل گیا، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے چار دینار پر اونٹ اس شرط پر خرید لیا کہ مدینہ تک ان کا سواری

۱ه ابوداؤد ج ۲ ص ۳۴۰ ۲ه ص ۳۱۷ ۳ه ترغیب و ترہیب بحوالہ مسند احمد ص ۱۳۶ مطبوعہ مصر ج ۲ ۴ه ابن ماجہ باب لصاحب الحق سلطان ۵ه بخاری ص ۲۸۱ باب شرہ الدواب۔

کا حق ہے، مدینہ پہنچ کر جابرؓ بن عبد اللہ نے قیمت طلب کی۔ آپؐ نے بلالؓ سے فرمایا کہ ان کو قیمت چار دینار دو اس سے کچھ اور زیادہ بھی دو، چنانچہ حضرت بلالؓ نے چار دینار پر ایک قیراط سونا اور زیادہ دیا۔[1]

معمول تھا کہ کوئی جنازہ لایا جاتا تو پہلے فرماتے کہ میت پر کچھ قرض تو نہیں ہے اگر معلوم ہوتا کہ مقروض تھا تو صحابہ سے فرماتے کہ جنازہ کی نماز پڑھا دو، خود شریک نہ ہوتے۔[2]

ایک دفعہ کسی سے اونٹ قرض لیا، جب واپس کیا تو اس سے بہتر اونٹ واپس کیا، اور فرمایا سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو قرض کو خوش معاملگی سے ادا کرتے ہیں۔[3]

ایک دفعہ کسی شخص سے ایک پیالہ مستعار لیا، سوءِ اتفاق سے وہ گم گیا تو اس کا تاوان ادا فرمایا۔[4]

عموماً فرمایا کرتے تھے کہ میں تین دن سے زیادہ اپنے پاس ایک دینار بھی رکھنا پسند نہیں کرتا بجز اس دینار کے جن کو قرض ادا کرنے کے انتظار میں اپنے پاس رکھ چھوڑتا ہوں۔[5]

ایک دفعہ ایک بدو اونٹ کا گوشت بیچ رہا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خیال تھا کہ گھر میں چھوہارے موجود ہیں، آپؐ نے ایک وسق چھوہاروں پر گوشت چکا لیا، گھر میں آکر دیکھا تو چھوہارے نہ تھے، باہر تشریف لا کر قصاب سے فرمایا کہ میں نے چھوہاروں پر گوشت چکایا تھا، لیکن چھوہارے میرے پاس نہیں ہیں، اس نے واویلا مچایا کہ ہائے بددیانتی۔ لوگوں نے سمجھایا کہ رسول اللہ بددیانتی کریں گے؟ آپؐ نے فرمایا نہیں چھوڑ دو، اس کو کہنے کا حق ہے، پھر قصاب کی طرف خطاب کر کے وہی فقرہ ادا کیا، اس نے پھر وہی لفظ کہے، لوگوں نے پھر روکا، آپؐ نے فرمایا اس کو کہنے دو، اس کو کہنے کا حق ہے اور اس جملہ کو کئی بار دہراتے رہے، اس کے بعد آپؐ نے ایک انصاریہ کے ہاں اس کو بھجوایا کہ اپنے دام کے چھوہارے وہاں سے لے لے، جب وہ چھوہارے لے کر پلٹا تو آپؐ صحابہ کے ساتھ تشریف فرما تھے، اس کا دل آپؐ کے حلم و عفو اور حسنِ معاملت سے متاثر تھا، دیکھنے کے ساتھ بولا محمدؐ! تم کو خدا جزائے خیر دے، تم نے قیمت پوری پوری دی اور اچھی دی۔[6]

ایک دفعہ مدینہ منورہ کے باہر ایک مختصر سا قافلہ آکر فروکش ہوا، ایک سرخ رنگ کا اونٹ اس کے ساتھ تھا اتفاق سے ادھر سے آپؐ کا گذر ہوا، آپؐ نے اونٹ کی قیمت پوچھی، لوگوں نے قیمت بتائی، بے مول تول کئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی قیمت منظور کر لی، اونٹ کی مہار پکڑ کر شہر کی طرف روانہ ہو گئے، بعد کو لوگوں کو خیال آیا کہ بے جان پہچان ہم نے جانور کیوں حوالہ کر دیا اور اس حماقت پر اب پورے قافلہ کو ندامت تھی، قافلہ کے ساتھ ایک خاتون بھی تھی، اس نے کہا مطمئن رہو ہم نے کسی شخص کا چہرہ ایسا روشن نہیں دیکھا، یعنی ایسا شخص دغا نہ کرے گا، رات ہوئی تو آپؐ نے اُن کے لئے کھانا اور قیمت بھر کھجوریں بھجوا دیں۔[7]

غزوہ حنین میں آپؐ کو کچھ اسلحہ کی ضرورت تھی، صفوان اس وقت تک کافر تھے، ان کے پاس بہت سی زرہیں تھیں، آپؐ نے ان سے کچھ زرہیں طلب کیں، انہوں نے کہا محمدؐ! کیا کچھ غصب کا ارادہ ہے، فرمایا نہیں! میں

۱ه صحیح بخاری کتاب الوکالۃ ۲ه صحیح بخاری ص ۳۰۹ کتاب الاستقراض ۳ه ترمذی باب استقراض البعیر ص ۲۲۵ ۴ه ترمذی ابواب الکلام ص ۲۳ ۵ه بخاری ج ۱ ص ۳۲۱ کتاب الاستقراض ۶ه مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۲۶۸ ۷ه دار قطنی جلد ثانی ص ۳۰۶ کتاب البیوع۔

عاریۃً مانگتا ہوں، اگر ان میں سے کوئی تلف ہوئی تو میں تاوان دوں گا چنانچہ انہوں نے چالیس زرہیں مسلمانوں کو عاریۃً دیں، حنین سے واپسی کے بعد جب اسلحہ اور دیگر سامان کا جائزہ لیا گیا تو کچھ زرہیں کم نکلیں، آپ نے صفوان سے کہا تمہاری چند زرہیں کم ہیں ان کا معاوضہ لے لو، صفوان نے عرض کی یا رسول اللہ! میرے دل کی حالت پہلے جیسی نہیں[1] یعنی مسلمان ہوگیا، اب معاوضہ کی حاجت نہیں۔

عدل و انصاف

کوئی شخص گوشہ نشین ہو کر بیٹھ جائے تو اس کے لئے عدل و انصاف سے کام لینا نہایت آسان ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب کے سینکڑوں قبائل سے کام پڑتا تھا، یہ آپس میں ایک ایک کے دشمن تھے، ایک کے موافق فیصلہ کیا جاتا تو دوسرا دشمن بن جاتا، اسلام کی اشاعت کی غرض سے ہمیشہ آنحضرت کو تالیفِ قلوب سے کام لینا پڑتا، ان سب مشکلات کے باوجود انصاف کا پلہ کبھی کسی طرف جھکنے نہ پاتا۔

فتح مکہ کے بعد تمام عرب میں صرف طائف رہ گیا تھا جس نے گردنِ تسلیم خم نہیں کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا محاصرہ کیا لیکن پندرہ بیس روز کے بعد محاصرہ اٹھا لینا پڑا، صخر ایک رئیس تھے، ان کو یہ حال معلوم ہوا تو خود جا کر طائف کی حصار بندی کی اور اہل شہر کو اس قدر دبایا کہ وہ بالآخر مصالحت پر راضی ہوگئے، صخر نے بارگاہ نبوت میں اطلاع کی، مغیرہ بن شعبہ ثقفی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے کہ صخر نے میری پھوپھی کو قبضہ میں کر رکھا ہے، آپ نے صخر کو بلا بھیجا اور حکم دیا کہ مغیرہ کی پھوپھی کو ان کے گھر پہنچا دو، اس کے بعد بنو سلیم آئے کہ جس زمانہ میں ہم کافر تھے صخر نے ہمارے چشمہ پر قبضہ کر لیا تھا، اب ہم اسلام لائے، ہمارا چشمہ ہم کو واپس دلا دیں، آپ نے صخر کو بلا بھیجا اور فرمایا کہ جب کوئی قوم اسلام قبول کرتی ہے تو اپنے جان و مال کی مالک ہو جاتی ہے اس لئے ان کو ان کا چشمہ دے دو، صخر کو منظور کرنا پڑا۔ راوی کا بیان ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے صخر نے دونوں حکم منظور کئے تو میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ پر شرم سے سرخی آگئی کہ صخر کو دونوں معاملوں میں شکست ہوئی اور فتح طائف کا ان کو کوئی صلہ نہ ملا۔[2]

ایک دفعہ ایک عورت نے جو خاندانِ مخزوم سے تھی چوری کی، قریش کی عزت کے لحاظ سے لوگ چاہتے تھے کہ سزا سے بچ جائے اور معاملہ دب جائے۔ حضرت اسامہ بن زید رسول اللہ کے محبوب خاص تھے، لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ سفارش کیجئے، انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معافی کی درخواست کی، آپ نے غضب آلود ہو کر فرمایا کہ بنی اسرائیل اسی کی بدولت تباہ ہوئے کہ وہ غرباء پر حد جاری کرتے تھے، امراء سے درگزر کرتے تھے۔[3]

خیبر کے یہودیوں سے جب صلح ہو کر وہاں کی زمین مجاہدین میں تقسیم کر دی گئی تو عبداللہ بن سہل ایک دفعہ کھجوروں کی بٹائی کے لئے گئے، محیصہ ان کے چچیرے بھائی ساتھ تھے، عبداللہ گلی میں جا رہے تھے کہ کسی نے ان کو قتل کر کے لاش ایک گڑھے میں ڈال دی، محیصہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر استغاثہ کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تم قسم کھا سکتے ہو کہ یہودیوں نے ان کو قتل کیا، بولے میں نے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا آپ نے فرمایا، تو یہود سے حلف لیا جائے، بولے حضرت! یہودیوں کی قسم کا اعتبار کیا، یہ سو دفعہ جھوٹی قسم

---

[1] ابوداؤد باب تضمین العاریۃ [2] ابوداؤد ص ۸۱ ج ۲ [3] صحیح بخاری کتاب الحدود۔

کھا لیں گے۔

خیبر میں یہود کے سوا اور کوئی قوم آباد نہ تھی۔ یہ یقینی تھا کہ یہودیوں ہی نے عبداللہ بن سہل کو قتل کیا ہے تاہم چونکہ کوئی عینی شہادت موجود نہ تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے تعرض نہیں فرمایا اور خون بہا کے سو اونٹ بیت المال سے دلوائے۔[1]

طارق محاربی کا بیان ہے کہ جب اسلام عرب میں پھیلنا شروع ہوا تو ہم چند آدمی ربذہ سے نکلے اور مدینہ کو روانہ ہوئے، شہر کے قریب پہنچ کر مقام کیا۔ زنانی سواری بھی ساتھ تھی، ہم سب بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک صاحب سفید کپڑے پہنے ہوئے آئے اور سلام علیک کی، ہم نے سلام کا جواب دیا، ہمارے ساتھ سرخ رنگ کا اونٹ تھا اس کی قیمت پوچھی، ہم نے جواب دیا اتنی کھجوریں، انھوں نے کچھ مول تول نہیں کیا اور وہی قیمت منظور کر لی پھر اونٹ کی مہار پکڑ کر شہر کی طرف بڑھے، نظروں سے اوجھل ہوگئے تو سب کو خیال آیا کہ دام رہ گئے، ہم لوگ ان کو پہچانتے نہیں، لوگوں نے ایک دوسرے کو ملزم ٹھہرانا شروع کیا، محمل نشین خاتون نے کہا مطمئن رہو۔ ہم نے کسی شخص کا چہرہ اس قدر چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن نہیں دیکھا یعنی ایسا شخص دغا نہ کرے گا، رات ہوئی تو ایک شخص آیا کہ رسول اللہ نے تمہارے لئے کھانا اور کھجوریں بھیجی ہیں، دوسرے دن صبح کو ہم لوگ مدینہ میں آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں خطبہ دے رہے تھے، ہم لوگوں کو دیکھ کر ایک انصاری نے اٹھ کر کہا، یا رسول اللہ! یہ لوگ بنو ثعلبہ کے قبیلہ کے ہیں اور ان کے مورث نے ہمارے خاندان کے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا، اس کے بدلہ میں ان کا ایک آدمی قتل کرا دیجئے۔ آپ نے فرمایا۔ باپ کا بدلہ بیٹے سے نہیں لیا جا سکتا۔[2]

سرق ایک صحابی تھے، انہوں نے ایک بدوی سے ایک اونٹ مول لیا لیکن قیمت نہ ادا ہو سکی۔ بدو ان کو پکڑ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گیا اور واقعہ بیان کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ قیمت ادا کر دو، انہوں نے ناداری کا عذر کیا، آپ نے بدو سے کہا کہ بازار لے جا کر ان کو فروخت کر لو۔ بدو ان کو بازار میں لے گیا، ایک صاحب نے دام دے کر بدو سے خریدا اور آزاد کر دیا۔[3]

ابو حدرد اسلمی ایک صحابی تھے جن پر ایک یہودی کا قرض آتا تھا اور ان کے پاس بدن پر جو کپڑے تھے ان کے سوا کچھ نہ تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خیبر کی مہم کا ارادہ کر رہے تھے، ابو حدرد نے یہودی سے کچھ مہلت طلب کی، لیکن وہ نہ مانا اور ان کو پکڑ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا، آپ نے فرمایا کہ ان کا قرض ادا کر دو۔ انہوں نے عذر کیا، آپ نے پھر فرمایا۔ انہوں نے پھر وہی جواب دیا۔ اور عرض کی کہ یا رسول اللہ غزوہ خیبر قریب ہے، شاید وہاں سے واپسی پر کچھ ہاتھ آئے تو میں اس کو ادا کر دوں۔ آپ نے پھر یہی حکم دیا کہ فوراً ادا کر دو، آخر اپنا تہبند اس یہودی کو قرض میں نذر کیا اور سر سے جو عمامہ بندھا تھا اس کو کھول کر کمر سے لپیٹ لیا۔[4]

---

[1] یہ واقعہ بخاری و نسائی وغیرہ میں (باب القسامۃ) میں باختلاف روایات مذکور ہے [2] دار قطنی ج ۲ ص ۲۰۷، ۲۰۸۔
[3] ایضاً ص ۳۱۴ [4] مسند احمد ج ۳ ص ۴۲۳، معجم صغیر طبرانی معجم عبدان۔

اس عدل و انصاف کا یہ اثر تھا کہ مسلمان ایک طرف یہود بھی جو آپؐ کے شدید ترین دشمن تھے، اپنے مقدمات آپؐ ہی کی بارگاہِ عدالت میں لاتے تھے[1] اور ان کی شریعت کے مطابق اس کا فیصلہ ہوتا تھا، چنانچہ قرآن مجید میں اس واقعہ کا صریح ذکر ہے، اسلام سے پہلے یہودیانِ بنو نضیر و قریظہ میں عزت و شرافت کی عجیب و غریب حد قائم تھی، کوئی قریظی اگر کسی نضیری کو قتل کرتا تو قصاص میں وہ مارا جاتا، لیکن اگر کوئی قریظی نضیری کے ہاتھ سے مارا جاتا تو اس کے خون کی قیمت سو بارِ شتر چھوہارا تھی، اسلام میں جب یہ واقعہ پیش آیا تو قریظہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مقدمہ پیش کیا، آپؐ نے فوراً توراۃ کے مطابق النفس بالنفس کے حکم سے دونوں قبیلوں میں برابر کا قصاص جاری کر دیا[2]۔

عدل و انصاف کا سب سے نازک پہلو یہ ہے کہ خود اپنے مقابلہ میں بھی حق کا رشتہ چھوٹنے نہ پاتے، ایک بار آپؐ مال غنیمت تقسیم فرما رہے تھے، لوگوں کا گرد و پیش ہجوم تھا، ایک شخص آ کر منہ کے بل آپؐ پر لد گیا، دستِ مبارک میں پتلی سی لکڑی تھی، آپؐ نے اس سے اس کا ٹھوکا دیا، اتفاق سے لکڑی کا سرا اس کے منہ میں لگ گیا اور خراش آ گئی، فرمایا مجھ سے انتقام لے لو، اس نے عرض کیا یا رسول اللہ میں نے معاف کر دیا[3]۔ مرض الموت میں آپؐ نے مجمع عام میں اعلان کیا، اگر میرے ذمہ کسی کا قرض آتا ہو، اگر میں نے کسی کی جان و مال یا آبرو کو صدمہ پہنچایا ہو تو میری جان و مال و آبرو حاضر ہے، اسی دنیا میں وہ انتقام لے لے، مجمع میں سناٹا تھا، صرف ایک شخص نے چند درہم کا دعوے کیا جو دلوا دیئے گئے[4]۔

جود و سخا جود و سخا آپؐ کی فطرت تھی (ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ آپؐ تمام لوگوں سے زیادہ سخی تھے اور خصوصاً رمضان کے مہینہ میں آپؐ اور زیادہ سخاوت کرتے تھے[5]، تمام عمر کسی کے سوال پر "نہیں" کا لفظ نہیں فرمایا[6]۔

انما انا قاسم وخازن والله یعطی (بخاری)
میں تو صرف دینے بانٹنے والا اور خازن ہوں اور دیتا اللہ ہے۔

ایک دفعہ ایک شخص خدمت اقدس میں آیا اور دیکھا کہ دور تک آپؐ کی بکریوں کا ریوڑ پھیلا ہوا ہے اس نے آپؐ سے درخواست کی اور آپؐ نے سب کی سب دے دیں، اس نے اپنے قبیلہ میں جا کر کہا کہ اسلام قبول کر لو، محمدؐ ایسے فیاض ہیں کہ مفلس ہو جانے کی پروا نہیں کرتے[7]۔ ایک دفعہ ایک شخص نے کچھ مانگا، آپؐ نے فرمایا، اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے، تم میرے ساتھ آؤ، حضرت عمرؓ بھی ساتھ تھے، عرض کی کہ آپؐ کے پاس کچھ موجود نہیں تو آپؐ پر کیا ذمہ داری ہے؟ ایک اور صاحب حاضر تھے، انہوں نے کہا یا رسول اللہ! آپ دیتے جائیں اور عرش والے خدا سے نہ ڈریئے، وہ آپؐ کو محتاج نہ کرے گا، آپؐ فرطِ بشاشت سے مسکرا دیئے[8]۔

عام فیاضی کا یہ حال تھا کہ جو شخص آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوتا، اگر آپؐ کے پاس کچھ سرمایہ موجود ہوتا تو اس کو کچھ نہ کچھ ضرور عطا فرماتے ورنہ وعدہ فرماتے، اس معمول کی بنا پر لوگ اس قدر دلیر ہو گئے تھے کہ ایک مرتبہ عین اقامتِ نماز کے وقت ایک بدو آیا، آپؐ کا دامن پکڑ کر کہا کہ میری ایک معمولی سی حاجت باقی رہ گئی ہے

[1] ابو داؤد باب تضمین العاریۃ جلد ثانی [2] ابو داؤد کتاب الدیات [3] ابو داؤد باب القود بغیر حدید [4] ابن اسحاق بروایت ابن ہشام [5] صحیح بخاری باب بدء الوحی [6] صحیح بخاری کتاب الادب باب حسن الخلق [7] صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۹۰ [8] ادب المفرد امام بخاری۔

خوف ہے کہ میں اس کو بھول نہ جاؤں اس کو پورا کر دیجئے، چنانچہ آپؐ اس کے ساتھ تشریف لے گئے اور حاجت براری کر کے آئے تو نماز پڑھی[1]۔

بعض اوقات ایسا ہوتا کہ ایک شخص سے ایک چیز خریدتے، قیمت چکا دینے کے بعد پھر وہ چیز اس کو بطور عطیہ کے عنایت فرماتے، چنانچہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ سے ایک اونٹ خریدا اور پھر اسی وقت اس کو عبداللہ بن عمرؓ کو دے دیا، حضرت جابرؓ کے ساتھ بھی اسی قسم کا ایک واقعہ مذکور ہے[2]۔

کھانے پینے کی چیزوں میں معمولی سے معمولی چیز بھی تنہا نہ کھاتے بلکہ تمام صحابہ کو شریک فرما لیتے، کسی غزوہ میں ۱۳۰ صحابہ ہمراہ تھے، آپؐ نے ایک بکری خرید کر ذبح کروائی اور کلیجی کے بھوننے کا حکم دیا، وہ تیار ہوئی تو تمام صحابہ کو تقسیم فرمایا جو لوگ موجود نہ تھے، ان کا حصہ الگ محفوظ رکھا[3]، جو چیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتی جب تک صرف نہ ہو جاتی آپؐ کو چین نہ آتا، بے قراری سی رہتی، ام المومنین ام سلمہؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لاتے تو چہرہ متغیر تھا، ام سلمہؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! خیر ہے؟ فرمایا کل جو سات دینار آئے تھے، شام ہو گئی اور وہ بستر پر پڑے رہ گئے[4]۔

حضرت ابوذرؓ سے مروی ہے کہ ایک شب کو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک راستہ سے گزر رہے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ابوذر! اگر احد کا پہاڑ میرے لئے سونا ہو جاتے تو میں کبھی پسند نہ کروں گا کہ تین راتیں گزر جائیں اور میرے پاس ایک دینار بھی رہ جاتے لیکن ہاں وہ دینار جس کو میں ادائے قرض کیلئے چھوڑ دوں[5]۔

اکثر یہاں تک معمول تھا کہ گھر میں نقد کی قسم سے کوئی چیز موجود ہوتی تو جب تک کل خیرات نہ کر دی جاتی گھر میں آرام نہ فرماتے، رئیس فدک نے ایک دفعہ چار اونٹ پر غلہ بار کر کے خدمتِ نبوی میں بھیجا، حضرت بلالؓ نے بازار میں غلہ فروخت کر کے ایک یہودی کا قرض تھا وہ ادا کیا، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر اطلاع کی، آپ نے پوچھا کچھ بچ تو نہیں رہا، بولے ہاں کچھ بچ بھی رہا، فرمایا کہ جب تک کچھ باقی رہے گا میں نہیں جا سکتا حضرت بلالؓ نے کہا میں کیا کروں، کوئی سائل نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں رات بسر کی، دوسرے دن حضرت بلالؓ نے آ کر کہا یا رسول اللہ! خدا نے آپؐ کو سبکدوش کر دیا، یعنی جو کچھ تھا، وہ بھی تقسیم کر دیا گیا۔ آپؐ نے خدا کا شکر ادا کیا اور اٹھ کر گھر تشریف لے گئے[6]۔

اسی طرح ایک بار عصر کی نماز پڑھ کر خلافِ معمول فوراً گھر کے اندر تشریف لے گئے اور پھر فوراً نکل آئے لوگوں کو تعجب ہوا، آپؐ نے فرمایا مجھ کو نماز میں خیال آیا کہ کچھ سونا گھر میں پڑا رہ گیا ہے، گمان ہوا کہیں ایسا نہ ہو کہ رات ہو جائے اور وہ گھر میں پڑا رہ جائے، اس لئے جا کر اس کو خیرات کر دینے کو کہہ آیا[7]۔

غزوہ حنین میں جو کچھ ملا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو خیرات فرما کر واپس آ رہے تھے، راہ میں بدوؤں کو خبر ملی کہ ادھر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ہونے والا ہے، آس پاس سے دوڑ دوڑ کر آئے اور لپٹ

[1] صحیح بخاری ج ۱ ص ۸۴ [2] ایضاً ص ۲۸۲ [3] صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۹۰ [4] مسند ابن حنبل ج ۶ ص ۲۹۳ [5] صحیح بخاری کتاب الاستقراض ص ۳۲۱ [6] ابو داؤد باب ہدایا المشرکین [7] صحیح بخاری یفکر الرجل الشیٔ فی الصلوٰۃ۔

گئے کہ ہمیں بھی کچھ عنایت ہو، آپؐ اژدہام سے گھبرا کر ایک درخت کی آڑ میں کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے ردائے مبارک تھام لی، بالآخر اس کشاکش میں جسم اطہر سے چادر اتر کر ان کے ہاتھ میں رہ گئی۔ فیاضِ عالم نے کہا میری چادر دے دو، خدا کی قسم اگر ان جنگلی درختوں کے برابر بھی اونٹ میرے پاس ہوتے تو میں سب تم کو دے دیتا اور پھر مجھ کو بخیل نہ پاتے، نہ دروغ گو نہ نامرد[1]۔

لوگوں کو عام حکم تھا کہ جو مسلمان مر جائے اور اپنے ذمہ قرض چھوڑ جائے تو مجھے اطلاع دو، میں اس کو ادا کر دوں گا اور جو ترکہ چھوڑ جائے وہ وارثوں کا حق ہے[2]، مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں۔ ایک دفعہ آپؐ صحابہ کے مجمع میں تشریف فرما تھے، ایک بدو آیا اور آپؐ کا چادر کا گوشہ زور سے کھینچ کر بولا "محمدؐ یہ مال نہ تیرا ہے نہ تیرے باپ کا ہے، ایک بار شتر دے"۔ آپؐ نے اس کے اونٹ کو جو اور کھجوروں سے لدوا دیا[3]۔

ایک دفعہ بحرین سے خراج آیا اور اس قدر کثیر رقم تھی کہ اس سے پہلے کبھی دارالاسلام میں نہیں آئی تھی۔ آپؐ نے حکم دیا کہ اس کو صحنِ مسجد میں ڈلوا دو۔ اس کے بعد جب آپؐ مسجد میں تشریف لائے تو اس پر مڑ کر بھی نظر نہ ڈالی نماز سے فارغ ہو کر آپؐ نے اس کی تقسیم شروع کی جو سامنے آتا اس کو دیتے چلے جاتے۔ حضرت عباسؓ کو جو غزوۂ بدر کے بعد دولت مند نہیں رہے تھے، اتنا دیا کہ اٹھ کر چل نہیں سکتے تھے۔ اسی طرح اور لوگوں کو بھی عنایت فرماتے جاتے تھے، جب کچھ نہ رہا تو کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے[4]۔

اسلام میں قاعدہ یہ ہے کہ اگر کوئی آزاد شدہ غلام مر جائے تو اس کا ترکہ اُس کے آقا کو ملتا ہے۔ ایک دفعہ آپؐ کا اسی قسم کا غلام مر گیا۔ لوگ اس کا متروکہ سامان اٹھا کر آپؐ کے پاس لائے، آپؐ نے دریافت فرمایا کہ کوئی اس کا یہاں ہم وطن ہے؟ لوگوں نے کہا ہاں ہے۔ آپؐ نے فرمایا یہ تمام چیزیں اسی کے حوالہ کر دو[5]۔

ایک دفعہ چند انصار نے آپؐ سے کچھ مانگا، آپؐ نے دے دیا، پھر مانگا پھر دیا، پھر جب تک رہا آپؐ دیتے رہے۔ یہاں تک کہ آپؐ کے پاس کچھ نہیں رہا۔ لیکن وہ باوجود اس کے حاضر ہوئے اور درخواست کی۔ فرمایا میرے پاس جو کچھ ہو میں اس کو تم سے بچا کر نہیں رکھوں گا[6]۔

ایثار آپؐ کے اخلاق و عادات میں جو وصف سب سے زیادہ نمایاں اور جس کا اثر ہر موقع پر نظر آتا تھا وہ ایثار تھا۔ اولاد سے آپؐ کو بے انتہا محبت تھی اور ان میں حضرت فاطمہ زہراؓ اس قدر عزیز تھیں کہ جب آتیں تو فرطِ محبت سے کھڑے ہو جاتے، پیشانی کو بوسہ دیتے اور اپنی جگہ بٹھاتے، تاہم حضرت فاطمہؓ کی عسرت اور تنگدستی کا یہ حال تھا کہ گھر میں کوئی خادمہ نہ تھی، خود چکی پیستیں، خود ہی پانی کی مشک بھر لاتیں، چکی پیستے پیستے ہتھیلیاں گھس گئی تھیں اور مشک کے اثر سے سینہ پر نیل پڑ گئے تھے، ایک دن خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئیں خود تو پاسِ حیا سے عرضِ حال نہ کر سکیں، جنابِ امیرؓ نے ان کی طرف سے یہ حال عرض کیا۔ اور درخواست کی کہ فلاں غزوہ میں جو کنیزیں آئی ہیں ان میں سے ایک کنیز مل جائے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا ابھی اصحابِ صفہ کا انتظام نہیں

[1] صحیح بخاری باب الشجاعۃ فی الحرب [2] صحیح بخاری [3] ابوداؤد کتاب الادب [4] صحیح بخاری ج ۲ باب القسمہ [5] مسند ابن حنبل ج ۲ صفحہ ۱۸۱ [6] صحیح بخاری صفحہ ۱۹۸ کتاب الصدقات۔

ہوا اور جب تک ان کا بندوبست نہ ہو لے میں اور طرف توجہ نہیں کر سکتا[1]۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت زبیرؓ کی صاحبزادیاں اور حضرت زہراؓ خدمتِ اقدس میں گئیں اور اپنے افلاس و تنگدستی کی شکایت کر کے عرض کی کہ اب کی غزوہ میں جو کنیزیں آئی ہیں ان میں سے ایک دو ہم کو مل جائیں، آپؐ نے فرمایا، بدر کے یتیم تم سے پہلے درخواست کر چکے[2]۔

ایک دفعہ حضرت علیؓ نے کسی امر کی درخواست کی۔ فرمایا یہ نہیں ہو سکتا کہ میں تم کو دوں اور اہلِ صفہ کو اس حال میں چھوڑ دوں کہ وہ بھوک سے اپنے پیٹ لپیٹے پھریں[3]۔

ایک دفعہ ایک عورت نے ایک چادر لا کر پیش کی، آپؐ کو ضرورت تھی، آپؐ نے لے لی۔ ایک صاحب حاضرِ خدمت ہوتے، انہوں نے کہا کیا اچھی چادر ہے! آپؐ نے اتار کر اُن کو دے دی، جب اٹھ کر چلے گئے تو لوگوں نے ان کو ملامت کی کہ تم جانتے ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چادر کی ضرورت تھی، یہ بھی جانتے ہو کہ آنحضرتؐ کسی کا سوال رد نہیں کرتے۔ انہوں نے کہا ہاں! لیکن میں نے تو برکت کے لئے لی ہے کہ مجھ کو اسی چادر کا کفن دیا جائے[4]۔

زہد و قناعت کے عنوان سے جو واقعات لکھے گئے ہیں، ان سے ظاہر ہو گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کس عسرت اور تنگدستی میں بسر فرماتے تھے، ۷ھ کے بعد فتوحات کو جو وسعت حاصل ہوئی ہے، عرب میں باغات سب سے بہتر جائیداد تھی، ۳ھ میں یہودیانِ بنو نضیر میں سے مخیریق نامی ایک شخص نے اپنے سات باغ مثیب، صائفہ، دلال، حسینی، برقہ، اعواف، مشربہ ام ابراہیم مرتے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وصیت کر دیئے۔ آپؐ نے سب کو خیرات کر دیا، یعنی وہ خدا کی راہ میں وقف تھے۔ ان میں جو کچھ پیدا ہوتا تھا وہ غرباء اور مساکین کو دیدیا جاتا تھا[5]۔

ایک صحابی نے شادی کی، سامانِ ولیمہ کے لئے گھر میں کچھ نہ تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا کہ عائشہؓ کے پاس جاؤ اور آٹے کی ٹوکری مانگ لاؤ، وہ گئے اور جا کر لے آئے۔ حالانکہ کاشانۂ نبوت میں اس ذخیرہ کے سوا شام کے کھانے کو کچھ نہ تھا[6]۔ ایک دفعہ ایک غفاری آ کر مہمان ہوا، رات کو کھانے کے لئے صرف بکری کا دودھ تھا، وہ آپؐ نے اس کی نذر کر دیا، یہ تمام رات خانۂ نبوت میں فاقہ سے گزری، حالانکہ اس سے پہلی شب میں بھی یہاں فاقہ ہی تھا[7]۔

مہمان نوازی عرب میں مختلف اطراف اور صوبوں سے جوق در جوق لوگ بارگاہِ نبویؐ میں آتے تھے۔ رملہؓ ایک صحابیہ تھیں، ان کا گھر دارالضیوف تھا۔ یہیں لوگ مہمان اترتے تھے[8]۔ اُم شریکؓ جو ایک دولتمند اور فیاض انصاریہ تھیں، ان کا گھر بھی گویا ایک مہمان خانہ تھا، مخصوص لوگ مسجدِ نبویؐ میں اتارے جاتے تھے چنانچہ وفدِ ثقیف یہیں اترا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود بہ نفسِ نفیس ان مہمانوں کی خاطر داری اور تواضع فرماتے تھے یوں بھی جو لوگ حاضر ہوتے تھے، بغیر کچھ کھائے پیئے واپس نہ آتے تھے[9]۔

[1] یہ روایت کتبِ احادیث (سنن ابوداؤد) وغیرہ میں مختلف طریقوں سے مروی ہے، ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے حضرت فاطمہؓ کو ایک دعا بتا دی کہ یہ لونڈی سے بڑھ کر ہے [2] ابوداؤد ج ۲ صفحہ ۳۴۳ [3] مسند احمد ج ۱ صفحہ ۱۰۶ [4] صحیح بخاری باب حسن الخلق والسخاء و باب من استعد الکفن [5] فتح الباری شرح کتاب الفرائض [6] اصابہ تذکرہ مخیریق [7] مسند احمد ج ۴ صفحہ ۵۸ [8] ایضاً ج ۶ صفحہ ۳۹۷ [9] زرقانی ذکر وفود [10] مسلم ج ۲ صفحہ ۵۱۹ [11] شمائل ترمذی۔

فیاضی میں کافر و مسلمان کا امتیاز نہ تھا، مشرک و کافر سب آپؐ کے مہمان ہوتے اور آپ یکساں انکی مہمان نوازی کرتے، جب اہلِ حبشہ کا وفد آیا تو آپؐ نے خود اپنے ہاں ان کو مہمان اتارا اور خود بہ نفسِ نفیس اُن کی خدمت کی[1] ایک دفعہ کافر مہمان ہوا، آپؐ نے ایک بکری کا دودھ اسے پلایا، وہ سارے کا سارا پی گیا، آپؐ نے دوسری بکری منگوائی، وہ بھی کافی نہ ہوئی، غرض سات بکریوں تک نوبت آئی، جب تک وہ سیر نہ ہوا، آپؐ پلاتے گئے[2]، کبھی ایسا ہوتا کہ مہمان آجاتے اور گھر میں جو کچھ موجود ہوتا وہ ان کی نذر ہو جاتا اور تمام اہل و عیال فاقہ کرتے[3]، آپؐ راتوں کو اٹھ اٹھ کر اپنے مہمانوں کی خبر گیری کرتے تھے[4]۔

صحابہ میں سب سے مفلس اور نادار گروہ اصحابِ صفہ کا تھا، وہ مسلمانوں کے مہمان عام تھے، لیکن ان کو زیادہ تر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان ہونے کا شرف حاصل ہوتا، ایک بار آپؐ نے فرمایا کہ جس شخص کے پاس دو آدمی کا کھانا ہو وہ ان میں سے تین آدمی کو اور جن کے پاس چار آدمی کا کھانا ہو وہ اُن میں سے پانچ آدمی کو ساتھ لے جائے، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ تین آدمیوں کو ساتھ لائے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دس آدمیوں کو ہمراہ لے گئے[5]۔

اصحابِ صفہ میں حضرت ابوہریرہؓ اپنے فقر و فاقہ کی داستان نہایت دردانگیز طریقہ سے بیان کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ میں ایک روز شدتِ گرسنگی کی حالت میں گزرگاہِ عام پر بیٹھ گیا، حضرت ابوبکرؓ راستے سے گزرے تو میں نے بطور حسن طلب کے اُن سے قرآن مجید کی ایک آیت پوچھی لیکن وہ گزر گئے اور میری حالت کی طرف توجہ نہ کی، حضرت عمرؓ کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا اور وہی نتیجہ ہوا، اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ہوا تو آپؐ مجھ کو دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا کہ میرے ساتھ ساتھ آؤ، آپؐ گھر میں پہنچے تو دودھ کا ایک پیالہ نظر آیا، آپؐ نے دریافت فرمایا تو معلوم ہوا کہ کسی نے ہدیۃً بھیجا ہے، آپؐ نے مجھ سے کہا کہ اصحابِ صفہ کو بلا لاؤ، میں ان کو بلا لایا تو آپؐ نے مجھ کو دودھ کا پیالہ دیا کہ سب کو تقسیم کر دو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں ایک پیالہ اس قدر بھاری تھا کہ اس کو چار آدمی اٹھا سکتے تھے، جب دوپہر ہوتی تو وہ پیالہ آتا اور اصحابِ صفہ اس کے گرد بیٹھ جاتے، یہاں تک کہ جب زیادہ مجمع ہو جاتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اکڑوں بیٹھنا پڑتا کہ لوگوں کے لئے جگہ نکل آئے[6]۔

مقدادؓ کا بیان ہے کہ میں اور میرے دو رفیق اس قدر تنگ دست تھے کہ بھوک سے بینائی جاتی رہی ہم لوگوں نے اپنے تکفل کی درخواست کی لیکن کسی نے منظور نہیں کیا، آخر ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپؐ دولت خانہ پر لوا گئے اور تین بکریوں کو دکھا کر فرمایا کہ ان کا دودھ پیا کرو، چنانچہ ہم میں ہر شخص دودھ دوھ کر اپنا اپنا حصہ پی لیا کرتا تھا[7]۔

ایک دن اصحابِ صفہ کو لے کر حضرت عائشہؓ کے گھر پہنچے اور فرمایا کھانے کو جو کچھ ہو لاؤ، چونی کا پکا ہوا کھانا سامنے لاکر رکھا گیا، آپؐ نے کھانے کی کوئی اور چیز طلب کی تو چھوہارے کا حریرہ پیش ہوا، اس کے بعد بڑے

[1] شفاء قاضی عیاض بسند متصل [2] صحیح مسلم باب المؤمن یاکل فی معی [3] مسند ابن حنبل ج ۶ ص ۲۹۷ [4] ابوداؤد کتاب الادب
[5] صحیح مسلم ج ۲ [6] ترمذی ص ۲۹۹ [7] ابوداؤد کتاب الاطعمہ [8] صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۹۸۔

پیالہ میں دودھ حاضر کیا گیا اور یہی سامانِ مہمانی کی آخری قسط تھی[8]۔

گداگری اور سوال سے نفرت

باوجود اس کے کہ آپؐ کا ابرِ کرم ہر وقت برستا رہتا تھا، تاہم کسی کا بے ضرورت شدید سوال کرنا آپؐ کو سخت گراں ہوتا تھا، ارشاد فرماتے کہ اگر کوئی شخص لکڑی کا گٹھا پیٹھ پر لاد لاتے اور بیچ کر اپنی آبرو بچائے تو اس سے بہتر ہے کہ لوگوں سے سوال کرتے[1]۔

ایک دفعہ ایک انصاری آئے اور کچھ سوال کیا، آپؐ نے فرمایا تمہارے پاس کچھ نہیں ہے؟ بولے کہ بس ایک بچھونا ہے، جس کا کچھ حصہ اوڑھ لیتا ہوں اور کچھ بچھا لیتا ہوں اور ایک پانی کا پیالہ ہے، آپؐ نے دونوں چیزیں منگوائیں، پھر فرمایا یہ چیزیں کون خریدتا ہے؟ ایک شخص نے دو درہم لگائے، آپؐ نے فرمایا: اس سے بڑھ کر بھی کوئی دام لگاتا ہے؟ ایک صاحب نے ایک کے دو کر دیئے، آپؐ نے دونوں چیزیں دے دیں اور درہم انصاری کو دیئے کہ ایک درہم کا کھانا خرید کر گھر میں دے آؤ اور دوسرے سے رسی خرید و اور جنگل سے لکڑیاں لا کر شہر میں بیچو پندرہ دن کے بعد وہ خدمتِ اقدس میں آئے تو دس درہم اُن کے پاس جمع ہو گئے تھے، اس سے کچھ کپڑا خریدا، کچھ کا غلہ مول لیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یہ اچھا ہے یا یہ کہ قیامت میں چہرہ پر گدائی کا داغ لگا کر جاتے[2]۔

ایک دفعہ چند انصاری آئے اور سوال کیا، آپؐ نے عنایت فرمایا، پھر جب تک کچھ رہا، آپؐ نے انکی درخواست رد نہیں فرمائی، جب کچھ نہیں رہا تو آپؐ نے فرمایا میرے پاس جب تک کچھ رہے گا میں تم سے بچا کر اس کو نہیں رکھوں گا، لیکن جو شخص اللہ سے یہ دعا مانگے کہ وہ اس کو سوال اور گداگری کی ذلت سے بچائے تو وہ اس کو بچا دیتا ہے اور جو خدا سے غنیٰ کا طالب ہوتا ہے وہ اس کو غنیٰ مرحمت فرماتا ہے اور جو صبر کرتا ہے اللہ اس کو صابر بنا دیتا ہے اور صبر سے کوئی بہتر اور وسیع تر دولت کسی کو نہیں دی گئی ہے[3]۔

حکیمؓ بن حزام فتح مکہ میں اسلام لائے تھے، ایک دفعہ انہوں نے آپؐ سے کچھ طلب کیا، آپؐ نے عنایت فرمایا کچھ دن کے بعد پھر مانگا، آپؐ نے پھر ان کو دیا، تیسری دفعہ پھر سوال کیا، پھر کچھ مرحمت کیا، اس کے بعد فرمایا اے حکیم یہ دولت سبز و شیریں ہے جو استغنا کے ساتھ اس کو قبول کرتا ہے اس کو برکت ملتی ہے اور جو حرص و طمع کے ساتھ اس کو حاصل کرتا ہے وہ اس سے محروم رہتا ہے اور اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کھاتا جاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا، دستِ بالا دستِ زیریں سے بہتر ہے، حکیمؓ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحت کا یہ اثر ہوا کہ جب تک وہ زندہ رہے کبھی کسی سے معمولی چیز بھی نہیں مانگی[4]۔

حجۃ الوداع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صدقات کا مال تقسیم فرما رہے تھے کہ دو صاحب آکر شامل ہو گئے آپؐ نے ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ تنومند اور ہاتھ پاؤں کے درست معلوم ہوئے، آپؐ نے فرمایا، اگر تم چاہو تو میں اس میں سے دے سکتا ہوں لیکن غنی اور تندرست کام کرنے کے لائق لوگوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے[5]۔

قبیصہ نام ایک صاحب تھے وہ مقروض ہو گئے تھے، آپؐ کے پاس آئے تو اپنی حاجت عرض کی، آپؐ نے

[1] ابوداؤد کتاب الادب [2] صحیح بخاری کتاب الصدقات ص ۱۹۸ [3] ابوداؤد و ترمذی صدقات [4] کتاب الصدقات [5] صحیح بخاری کتاب
کتاب الصدقات [6] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ۔

وعدہ کیا اس کے بعد ارشاد فرمایا، اے قبیصہ! سوال کرنا اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا صرف تین شخصوں کو روا ہے، ایک اس شخص کو جو قرض سے زیادہ زیر بار ہو، وہ مانگ سکتا ہے، لیکن جب اس کی ضرورت پوری ہو جائے تو اس کو رک جانا چاہیئے، دوسرے اس شخص کو جس پر کوئی ایسی ناگہانی مصیبت آگئی جس نے اس کے تمام مالی سرمایہ کو برباد کیا، اس کو اس وقت تک مانگنا جائز ہے جب تک اس کی حالت کسی قدر درست نہ ہو جائے، تیسرے اس شخص کو جو مبتلائے فاقہ ہو اور محلہ کے تین معتبر آدمی گواہی دیں کہ ہاں اس کو فاقہ ہے، اس کے علاوہ جو کوئی کچھ مانگ کر حاصل کرتا ہے وہ حرام کھاتا ہے۔[1]

صدقہ سے پرہیز

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اور اپنے خاندان کے لئے صدقہ و زکوٰۃ لینے کو سخت موجب ننگ و عار سمجھتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ میں گھر میں آتا ہوں تو کبھی کبھی اپنے بستر پر کھجور پاتا ہوں جی میں آتا ہے کہ اٹھا کر منہ میں ڈال لوں، پھر خیال ہوتا ہے کہ کہیں صدقہ کی کھجور نہ ہو، اس لئے ڈال دیتا ہوں۔[2]

ایک دفعہ راستہ میں ایک کھجور ہاتھ آگئی، فرمایا اگر صدقہ کا شبہ نہ ہوتا تو میں اس کو کھا جاتا۔[3] ایک بار امام حسن علیہ السلام نے صدقہ کی کھجوروں میں سے منہ میں ایک کھجور ڈال لی آپ نے ڈانٹ کر کہا، کیا تمہیں یہ خبر نہیں کہ ہمارا خاندان صدقہ نہیں کھاتا۔ پھر منہ سے اگلوا دیا۔

آپ کے سامنے جب کوئی شخص کوئی چیز لے کر آتا تو دریافت فرماتے کہ ہدیہ ہے یا صدقہ؟ اگر ہدیہ ہوتا قبول فرماتے اور اگر یہ کہتا کہ صدقہ تو آپ ہاتھ روک لیتے اور دوسرے صاحبوں کو عنایت فرما دیتے۔

ہدایا اور تحفے قبول کرنا

دوست و احباب کے ہدایا اور تحفے آپ قبول فرماتے تھے بلکہ آپ نے اس کو ازدیاد محبت کا بہترین ذریعہ فرمایا ہے۔

تہادوا تحابوا (حدیث) — باہم ایک دوسرے کو ہدیہ بھیجو تو باہم محبت ہوگی۔

اسی لئے صحابہ عموماً کچھ نہ کچھ روز آپ کے گھر بھیجا کرتے تھے اور خصوصیت کے ساتھ اس دن بھیجتے تھے، جس دن آپ حجرۂ عائشہؓ میں قیام فرماتے تھے۔[4] اوپر گزر چکا ہے کہ کوئی چیز آپ کے سامنے پیش کی جاتی تو آپ دریافت فرماتے تھے کہ یہ صدقہ ہے یا ہدیہ؟ اگر ہدیہ ہوتا تو قبول فرماتے ورنہ احتراز کرتے، ایک دفعہ ایک عورت نے ایک چادر خدمت اقدس میں پیش کی، آپ نے لے لی اسی وقت ایک صاحب نے مانگ لی، آپ نے ان کو عنایت فرما دی۔[5]

آس پاس کے ملوک و سلاطین بھی آپ کو تحفے بھیجا کرتے تھے، صدود شام کے ایک رئیس نے ایک سفید خچر تحفہ دیا تھا، عزیز مصر نے ایک خچر مصر سے بھیجا تھا، ایک امیر نے آپ کو موزے بھیجے تھے، ایک دفعہ قیصر روم نے آپ کی خدمت میں ایک پوستین بھیجی، جس میں دیبا کی سنجاف لگی ہوئی تھی، آپ نے ذرا دیر کے لئے پہن لی، پھر اتار کر حضرت جعفرؓ (حضرت علیؓ کے بھائی) کے پاس بھیج دی، وہ پہن کر خدمت اقدس میں آئے، آپ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے اس لئے نہیں بھیجی کہ تم خود پہنو، عرض کی، پھر کیا کروں، ارشاد فرمایا کہ اپنے بھائی نجاشی کو بھیج دو[6]، حضرت جعفرؓ ایک مدت

---

[1] ابو داؤد کتاب الزکوٰۃ [2] بخاری ج ۱ ص ۳۲۵ کتاب اللقطہ [3] بخاری ج ۱ ص ۳۲۸ کتاب اللقطہ [4] بخاری جلد ۱ ص ۳۵۰ کتاب الصدقات [5] بخاری مناقب عائشہؓ [6] صحیح بخاری کتاب الصدقہ [7] صحیح بخاری کتاب الجنائز

یعنی فتح خیبر تک حبش میں رہے تھے اور نجاشی نے ان ہی سے اسلام کی تعلیم پائی تھی۔

ہدایا اور تحفے دینا

جن لوگوں کے ہدایا اور تحفے قبول فرماتے تھے، ان کو ان کا صلہ بھی ضرور عطا فرماتے تھے حضرت عائشہؓ سے روایت ہے۔

کان یقبل الھدیۃ ویثیب علیھا۔ — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہدیہ قبول فرماتے تھے اور اس کا معاوضہ دیتے تھے[1]

یمن کا مشہور بادشاہ ذی یزن جس نے حبشی حکومت مٹا کر ایران کے زیر اثر عربی حکومت قائم کی تھی اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک قیمتی حلہ بھیجا جس کو اس نے ۳۳ اونٹوں کے بدلہ میں خریدا تھا آپ نے قبول فرمایا اور پھر اس کو ایک حلہ ہدیۃً بھیجا جو ۲۰ سے کچھ زیادہ اونٹ دے کر خریدا گیا تھا۔[2]

ایک دفعہ قبیلہ بنی فزارہ کے ایک شخص نے آپ کی خدمت میں ہدیۃً ایک اونٹنی پیش کی، آپؐ نے اس کا صلہ دیا تو وہ سخت ناراض ہوا آپ نے منبر پر کھڑے ہو کر خطاب عام کیا اور فرمایا کہ تم لوگ مجھے ہدیہ دیتے ہو اور میں بقدر استطاعت اس کا صلہ دیتا ہوں تو ناراض ہوتے ہو، آئندہ قریش، انصار، ثقیف اور دوس کے سوا کسی قبیلہ کا ہدیہ قبول نہ کروں گا۔[3]

حضرت ایوب انصاریؓ جن کے مکان میں آپ چھ مہینہ تک فروکش رہے تھے، آپ اکثر ان کو بچا ہوا کھانا بھیجا کرتے تھے، ہمسایوں اور پڑوسیوں کے گھروں میں بھی تحفے بھیجتے تھے، اصحاب صفہ اکثر آپ کے تحفوں سے مشرف ہوا کرتے تھے۔

عدم قبول احسان

کبھی کسی کا احسان گوارا نہ فرماتے حضرت ابوبکرؓ سے بڑھ کر جان نثار کون ہو سکتا تھا تاہم ہجرت کے وقت جب انہوں نے سواری کے لئے ناقہ پیش کیا تو آپ نے قیمت ادا کی[4]، مدینہ میں مسجد کے لئے جو زمین درکار تھی مالکان زمین نے مفت نذر کرنا چاہی لیکن آپ نے قیمت دے کر لی، ایک دفعہ عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عمرؓ دونوں ہم سفر تھے، عبداللہ بن عمر کی سواری کا اونٹ سرکش تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ناقہ سے آگے نکل نکل جاتا تھا، عبداللہ بن عمرؓ روکتے تھے لیکن وہ قابو نہ آتا تھا حضرت عمرؓ بار بار عبداللہ بن عمر کو ڈانٹتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے کہا، یہ اونٹ میرے ہاتھ بیچ ڈالو، انہوں نے کہا نذر ہے، آپ نے فرمایا نہیں دام لو، انہوں نے دوبارہ عرض کی کہ یوں ہی حاضر ہے، آپ نے انکار کیا، بالآخر حضرت عمرؓ نے دام لینے منظور کئے، آپ نے خرید کر عبداللہ بن عمرؓ کو دے دیا کہ اب یہ تمہارا ہے۔[5]

عدم تشدد

حضرت معاذؓ بن جبل (جو اکابر صحابہ میں سے تھے) ایک محلہ میں امامت کرتے تھے اور نماز فجر میں بڑی بڑی سورتیں پڑھتے تھے، ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ وہ اس قدر لمبی نماز پڑھتے ہیں کہ میں ان کے پیچھے نماز پڑھنے سے قاصر رہتا ہوں، ابو مسعود انصاریؓ کا بیان ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی اس قدر غضب ناک نہیں دیکھا جس قدر اس موقع پر دیکھا، آپ نے لوگوں سے خطاب کر کے فرمایا،

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجنائز ص ۲۰۳ [2] ادب المفرد امام بخاری ص ۱۸۱ [3] مسلم کتاب الاطعمہ [4] بخاری ص ۵۵۳ [5] ایضاً ص ۲۸۴

[6] بخاری کتاب الصلوٰۃ و باب ہل یقضی الحاکم وھو غضبان ص ۱۰۶۰

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو لوگوں کو متنفر کر دیتے ہیں جو شخص تم میں سے نماز پڑھائے مختصر پڑھائے کیونکہ نماز میں بوڑھے، کمزور، کام والے سبھی طرح کے آدمی ہوتے ہیں۔

حد و قصاص میں نہایت احتیاط فرماتے اور جہاں تک ممکن ہوتا درگزر کرنا چاہتے، ماعز اسلمی ایک صاحب تھے جو زنا میں مبتلا ہو گئے، لیکن فوراً مسجد میں آئے اور کہا یا رسول اللہ میں نے بدکاری کی، آپ نے منہ پھیر لیا، وہ دوسری سمت آئے، آپ نے اور طرف منہ پھیر لیا، آپ بار بار منہ پھیر لیتے اور وہ بار بار سامنے آکر زنا کا اقرار کرتے۔ بالآخر آپ نے فرمایا کہ تم کو جنون تو نہیں ہے؟ بولے نہیں، پھر پوچھا، تمہاری شادی ہو چکی ہے، بولے ہاں آپ نے فرمایا کہ تم نے صرف ہاتھ لگایا ہوگا، بولے نہیں بلکہ مجامعت کی، آخر مجبور ہو کر آپ نے حکم سنا دیا کہ سنگسار کئے جائیں۔

ایک دفعہ ایک شخص نے آکر عرض کی کہ مجھ سے گناہ سرزد ہوا، آپ حد (سزا) کا حکم دیں، آپ چپ رہے اور نماز کا وقت آگیا، نماز کے بعد انہوں نے پھر آکر وہی درخواست کی، آپ نے فرمایا کیا تم نے نماز نہیں پڑھی، بولے ہاں پڑھ لی، ارشاد فرمایا تو خدا نے تمہارا گناہ معاف کر دیا۔

ایک دفعہ قبیلہ غامد کی ایک عورت آئی اور اظہار کیا کہ میں نے بدکاری کی، آپ نے فرمایا، واپس جاؤ، دوسرے دن پھر آئی اور بولی کہ کیا آپ مجھ کو ماعز کی طرح چھوڑ دینا چاہتے ہیں؟ خدا کی قسم! مجھ کو حمل رہ گیا ہے، پھر فرمایا، واپس جاؤ، وہ چلی گئی، تیسرے دن پھر واپس آئی، آپ نے ارشاد فرمایا کہ بچہ کے پیدا ہونے تک انتظار کرو، جب بچہ پیدا ہوا تو بچہ کو گود میں لئے ہوئے آئی (یعنی اب زنا کی سزا دینے میں کیا تامل ہے؟) آپ نے فرمایا کہ دودھ چھٹنے کی مدت تک انتظار کرو، جب دودھ چھوٹ جائے تب آنا، جب رضاعت کا زمانہ گزر گیا تو پھر حاضر ہوئی، اب آپ نے مجبور ہو کر سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ لوگوں نے اس پر پتھر برسانے شروع کئے، ایک صاحب کا پتھر اس کے چہرہ پر لگا اور خون کی چھینٹیں اڑ کر ان کے چہرہ پر آئیں، انہوں نے اس کو گالی دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا زبان روکو، خدا کی قسم! اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ جبراً محصول لینے والا بھی اگر یہ توبہ کرتا تو بخش دیا جاتا۔ ایک دن ایک صاحب نے عرض کی کہ ہم لوگ یہودیوں اور عیسائیوں کے ملک میں رہتے ہیں کیا ان کے برتنوں میں کھانا کھا لیا کریں؟ فرمایا اور برتن ہاتھ آئیں تو ان کے برتنوں میں نہ کھاؤ، ورنہ ان کو دھو کر کھا سکتے ہو۔

ایک بار ایک صحابی نے ماہ رمضان تک کے لئے اپنی بی بی سے ظہار کر لیا، لیکن ابھی یہ مدت گزرنے نہ پائی تھی کہ اس سے مقاربت کر لی، پھر لوگوں کو اس واقعہ کی خبر کی اور کہا مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے چلو، سب نے انکار کر دیا، انہوں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ بیان کیا، آپ نے پہلے تو تعجب ظاہر کیا، پھر ایک غلام کے آزاد کرنے کا حکم دیا، انہوں نے ناداری کا عذر کیا تو آپ نے متصل دو ماہ تک روزے رکھنے کی ہدایت فرمائی۔ انہوں نے کہا یہ سب تو رمضان ہی کی وجہ سے ہوا ہے، اب آپ نے ساٹھ مسکینوں پر صدقہ کرنے کو فرمایا، انہوں نے کہا ہم تو خود فاقہ کر رہے ہیں، آپ نے فرمایا کہ صدقہ کے عامل کے پاس جاؤ وہ تمہیں ایک وسق کھجور دے گا اس میں سے ساٹھ مسکینوں کو دے دینا اور جو بچے وہ اپنے اہل و عیال پر صرف کرنا،

۱ یہ حدیث بخاری کے مختلف ابواب میں ہے موقع کیجئے صفحہ ۱۰۰۵ ۲ دیکھنا چاہیئے ۳ بخاری صفحہ ۱۰۱۳ ۴ ابوداؤد کتاب الحدود ۵ بخاری جلد ۲ صفحہ ۸۲۳۔

وہ پلٹے تو لوگوں سے کہا کہ تم لوگ متشدد اور بدتدبیر تھے، لیکن مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حسن رائے اور آسانی نظر آئی۔

ایک بار ایک اور صحابی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یا رسول اللہ! میں برباد ہو گیا، روزہ میں اپنی بیوی سے ہم بستر ہوا، آپ نے فرمایا، ایک غلام آزاد کر سکتے ہو؟ کہا نہیں، فرمایا دو مہینے تک متصل روزہ رکھ سکتے ہو؟ کہا نہیں، فرمایا ساٹھ محتاجوں کو کھانا کھلا سکتے ہو؟ کہا اس کی بھی قدرت نہیں، آنحضرت نے تامل فرمایا کچھ دیر نہ گزری تھی کہ ایک شخص نے کھجوروں کی ایک ٹوکری ہدیۃً پیش کی، آپ نے فرمایا سائل کہاں گیا سائل نے کہا یا رسول اللہ! میں یہ ہوں، فرمایا ان کھجوروں کو لے جاؤ اور کسی غریب کو خیرات دے دو، سائل نے عرض کی یا رسول اللہ! مدینہ میں مجھ سے زیادہ غریب کون ہوگا؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہنس پڑے اور فرمایا جاؤ گھر ہی والوں کو کھلا دو۔

تقشف ناپسند تھا

رہبانیت اور تقشف کو ناپسند فرماتے تھے، صحابہ میں سے بعض بزرگ میلان طبعی یا عیسائی راہبوں کے اثر سے رہبانیت پر آمادہ تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو باز رکھا بعض صحابہ ناداری کی وجہ سے شادی نہیں کر سکتے تھے اور ضبط نفس پر بھی قادر نہ تھے، انہوں نے قطع اعضا کرنا چاہا، آپ نے سخت ناراضی ظاہر کی، قدامہؓ بن مظعون ایک اور صحابی آئے کہ ہم میں سے ایک نے ترک حیوانات اور دوسرے نے ترک نکاح کا عزم کر لیا ہے، آپ نے فرمایا کہ "میں تو دونوں سے متمتع ہوتا ہوں" آپ کی مرضی نہ پا کر دونوں صاحب اپنے ارادہ سے باز رہے۔ عرب میں صوم وصال کا طریقہ مدت سے جاری تھا یعنی کئی کئی دن متصل روزے رکھتے تھے، صحابہ نے بھی اس کا ارادہ کیا لیکن آپ نے سختی سے روکا، حضرت عبد اللہؓ بن عمرو نہایت مرتاض زاہد تھے، انہوں نے عہد کر لیا تھا کہ ہمیشہ دن کو روزے رکھیں گے اور رات بھر عبادت کریں گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو بلا بھیجا اور پوچھا کہ کیا یہ خبر صحیح ہے، عرض کی، ہاں! فرمایا تم پر تمہارے جسم کا حق ہے آنکھ کا حق ہے، بیوی کا حق ہے، مہینہ میں تین دن کے روزے کافی ہیں، عبد اللہ بن عمروؓ نے کہا، مجھ کو اس سے زیادہ طاقت ہے، فرمایا کہ اچھا تیسرے دن، بولے میں اس سے بھی زیادہ طاقت رکھتا ہوں، ارشاد ہوا کہ ایک دن بیچ دے کر کہ یہی داؤد کا روزہ تھا اور یہی افضل الصیام ہے، انہوں نے عرض کی کہ مجھ کو اس سے بھی زیادہ قدرت ہے، ارشاد ہوا "بس اس سے زیادہ بہتر نہیں"۔

ایک روایت میں ہے کہ عبد اللہ بن عمروؓ کی روزہ داری کا چرچا ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کے پاس تشریف لے گئے، انہوں نے استقبال کیا اور چمڑے کا گدا بچھا دیا، آپ زمین پر بیٹھ گئے اور ان سے کہا کہ تم کو مہینہ میں تین روزے بس نہیں کرتے، عرض کی نہیں، فرمایا پانچ بولے نہیں، غرض آپ بار بار تعداد بڑھاتے جاتے اور وہ اس پر راضی نہ ہوتے، بالآخر آپ نے فرمایا کہ آخیر حد یہ ہے کہ ایک دن افطار کرو اور ایک دن روزہ رکھو۔

ایک دفعہ حضرت ابو ہریرہؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! میں جوان آدمی ہوں اور اتنا مقدور نہیں کہ نکاح

۱ ابوداؤد ج ۱ صفحہ ۲۲ ۲ بخاری صفحہ ۲۶ باب اذا جامع فی رمضان ۳ صحیح بخاری کتاب الصوم ۴ بخاری کتاب النکاح۔

کروں، نہ اپنے نفس پر اطمینان ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چپ رہے، حضرت ابوہریرہؓ نے پھر ان ہی الفاظ کا اعادہ کیا، آپؐ چپ رہے، سہ بارہ کہا تو آپؐ نے فرمایا کہ خدا کا حکم ٹل نہیں سکتا۔[1]

قبیلہ باہلہ کے ایک صاحب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر واپس گئے، سال بھر کے بعد آنے کا اتفاق ہوا، لیکن اتنے ہی زمانہ میں ان کی شکل و صورت اس قدر بدل گئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو نہ پہچان سکے، انھوں نے اپنا نام بتایا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تعجب سے پوچھا کہ تم تو نہایت خوش جمال تھے، تمہاری صورت کیوں بگڑ گئی؟ انھوں نے کہا جب سے آپؐ سے رخصت ہوا متصل روزے رکھتا ہوں، آپؐ نے فرمایا اپنی جان کو کیوں عذاب میں ڈالا، رمضان کے علاوہ ہر مہینہ میں ایک دن کا روزہ کافی ہے، انھوں نے کہا اس سے زیادہ کی قوت رکھتا ہوں، آپؐ نے ایک دن کا اور اضافہ کر دیا، انھوں نے اور اضافہ کی درخواست کی آپؐ نے تین کر دیئے، ان کو اس سے بھی تسکین نہ ہوئی تو آپؐ نے اشہر حرام کے روزوں کا حکم دیا۔[2] ایک دن چند صحابہ خاص اس غرض سے ازواج مطہرات کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے حالات دریافت کریں، وہ سمجھتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات دن عبادت کے سوا کچھ نہ کرتے ہوں گے حالات سنے تو ان کے معیار کے موافق نہ تھے۔ بولے کہ بھلا ہم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا نسبت؟ ان کے اگلے پچھلے گناہ سب خدا نے معاف کر دیئے ہیں، پھر ایک صاحب نے کہا کہ میں رات بھر نماز پڑھا کروں گا، دوسرے صاحب بولے میں عمر بھر روزہ رکھوں گا، ایک اور صاحب نے کہا میں کبھی شادی نہ کروں گا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سن رہے تھے، فرمایا کہ خدا کی قسم! میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں، تاہم روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، جو شخص میرے طریقہ پر نہیں چلتا وہ میرے گروہ سے خارج ہے۔[3]

کسی غزوہ میں ایک صحابی کا ایک غار پر گزر ہوا جس میں پانی تھا اور آس پاس کچھ بوٹیاں تھیں، خدمت اقدس میں حاضر ہوتے تو عرض کی یا رسول اللہ! مجھ کو ایک غار مل گیا ہے جس میں ضرورت کی سب چیزیں ہیں میرا دل چاہتا ہے کہ وہاں گوشہ نشین ہو کر ترک دنیا کر لوں، آپؐ نے فرمایا، میں یہودیت یا نصرانیت لے کر دنیا میں نہیں آیا، میں آسان اور سہل ابراہیمی مذہب لے کر آیا ہوں۔[4]

عیب جوئی اور مداحی کی ناپسندیدگی

مداحی اور تعریف کو بھی دل سے ہوناپسند فرماتے تھے، ایک دفعہ مجلس اقدس میں ایک شخص کا مذکور نکلا، حاضرین میں سے ایک شخص نے ان کی بہت تعریف کی، آپؐ نے فرمایا تم نے اپنے دوست کی گردن کاٹی۔ یہ الفاظ چند بار فرمائے۔ پھر ارشاد کیا کہ تم کو اگر کسی کی خواہی نخواہی مدح کرنی ہو تو یوں کہو کہ میرا ایسا خیال ہے۔[5] ایک دفعہ ایک شخص کسی حاکم کی مدح کر رہا تھا، حضرت مقدادؓ بھی موجود تھے، انھوں نے زمین سے خاک اٹھا کر اس کے منہ میں جھونک دی اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ مداحوں کے منہ میں خاک بھر دینی۔[6] ایک دفعہ آپؐ مسجد میں تشریف لائے، ایک

[1] بخاری کتاب النکاح [2] ابوداؤد ص ۲۴۴ [3] صحیح بخاری کتاب النکاح [4] مسند ابن حنبل ج ۵ ص ۲۶۶ [5] ادب المفرد ص ۶۶ [6] ایضاً ص ۶۶

شخص نماز پڑھ رہا تھا، محجن ثقفیؓ سے پوچھا یہ کون ہے؟ محجنؓ نے ان کا نام بتایا اور بہت تعریف کی، ارشاد فرمایا کہ دیکھو یہ سن نہ پائے ورنہ تباہ ہو جائے گا، یعنی دل میں غرور پیدا ہو گا جو موجب ہلاکت ہو گا۔[1]

ایک دفعہ اسود بن سریع جو شاعر تھے، خدمت عالی میں آئے اور عرض کی کہ میں نے خدا کی حمد و ثنا اور حضورؐ کی مدح میں کچھ اشعار کہے ہیں، فرمایا کہ ہاں خدا کو حمد پسند ہے، اسود نے اشعار پڑھنے شروع کئے، اسی اثنا میں کوئی صاحب باہر سے آ گئے، آپؐ نے اسود کو روک دیا، وہ کچھ دیر باتیں کر کے چلے گئے، پھر اسود نے پڑھنے شروع کئے، وہ صاحب پھر آ گئے، آپؐ نے اسود کو روک دیا، دو تین دفعہ یہی (اتفاق) ہوا۔ اسود نے عرض کی کہ یہ کون صاحب ہیں جن کیلئے آپؐ مجھ کو بار بار روک دیتے ہیں، فرمایا کہ یہ وہ شخص ہے جو فضول باتیں پسند نہیں کرتا۔[2]

اس موقع پر یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حسانؓ کو منبر پر بٹھا کر ان کے اشعار سنتے تھے اور فرماتے تھے اللّٰھم ایدہ بروح القدس حالانکہ یہ اشعار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں ہوتے تھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ حسانؓ کے اشعار کفار کے مطاعن کا جواب تھے، عرب میں شعراء کو یہ رتبہ حاصل تھا کہ زور کلام سے جس شخص کو چاہتے ذلیل اور جس کو چاہتے معزز کر دیتے۔ ان الزبعریٰ اور کعب اشرف وغیرہ نے اس طریقہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ضرر پہنچانا چاہا تھا، حسانؓ کی مداحی ان کا رد عمل تھا۔

سادگی اور بے تکلفی

معمول تھا کہ مجلس سے اٹھ کر گھر میں تشریف لے جاتے تو کبھی کبھی ننگے پاؤں چلے جاتے اور جوتی وہیں چھوڑ جاتے۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ پھر واپس تشریف لائیں گے روز روز کنگھا کرنا ناپسند فرماتے، ارشاد تھا کہ ایک دن بیچ دے کر کنگھا کرنا چاہیئے۔

کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، اٹھنے بیٹھنے کسی چیز میں تکلف نہ تھا، کھانے میں جو سامنے آتا، تناول فرماتے پہننے کو موٹا جھوٹا جو مل جاتا پہن لیتے، زمین پر، چٹائی پر، فرش پر جہاں جگہ ملتی بیٹھ جاتے۔[3] آپ کے لئے آٹے کی بھوسی کبھی صاف نہیں کی جاتی تھی۔[4] کرتہ کا تکمہ اکثر کھلا رکھتے تھے، لباس میں نمائش کو ناپسند فرماتے تھے، سامان آرائش سے طبعاً نفور تھے، غرض ہر چیز میں سادگی اور بے تکلفی پسند خاطر تھی۔[5]

امارت پسندی سے اجتناب

اسلام رہبانیت اور جوگی پن کا سخت مخالف ہے لا رھبانیۃ فی الاسلام اسی بناء پر آپ ہر قسم کے جائز حظوظ دنیوی سے متمتع ہونا جائز رکھتے تھے اور خود بھی کبھی کبھی ان چیزوں سے تمتع اٹھاتے تھے تاہم ناز و نعمت، تکلف و عیش پرستی کو ناپسند فرماتے، اور اوروں کو بھی اس سے روکتے۔

ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت علیؓ کی دعوت کی اور کھانا پکوا کر گھر بھیج دیا حضرت فاطمہ زہراؓ نے کہا کہ رسول اللہ بھی تشریف لاتے اور ہمارے ساتھ کھاتے تو خوب ہوتا، حضرت علیؓ گئے اور آپؐ سے جا کر عرض کی، آپؐ تشریف لاتے لیکن دروازہ پر پہنچے تو یہ دیکھ کر کہ گھر میں دیواروں پر پردے لٹکے ہوئے ہیں واپس چلے گئے، حضرت علیؓ نے واپسی کی

[1] ادب المفرد ص ۶ [2] ادب المفرد ص ۔ [3] ابوداؤد ج ۲ ص ۳۱۸ [4] دیکھو شمائل [5] صحیح بخاری کتاب الاطعمہ ص ۹۱۴ صحاح کی کتاب اللباس میں متعدد واقعات ہیں۔

وجہ دریافت کی تو فرمایا پیغمبر کی شان کے خلاف ہے کہ وہ کسی زیب و زینت کے مکان میں داخل ہو۔ فرمایا کرتے کہ گھر میں ایک بستر اپنے لئے، ایک بیوی کے لئے اور ایک مہمان کے لئے کافی ہے، چوتھا شیطان کا حصہ ہے[1]۔

ایک دفعہ کسی غزوہ میں تشریف لے گئے، حضرت عائشہؓ رہ گئیں۔ لڑائی سے واپس تشریف لائے اور حضرت عائشہؓ کے پاس آئے تو دیکھا کہ گھر میں چھت گیر لگی ہوئی ہے، اسی وقت پھاڑ ڈالی اور فرمایا کہ خدا نے ہم کو دولت اس لئے نہیں دی ہے کہ اینٹ پتھر کو کپڑے پہنائے جائیں[2]۔ ایک انصاری نے ایک مکان بنوایا جس کا گنبد بہت بلند تھا، آپ نے دیکھا تو پوچھا کس نے بنایا ہے؟ لوگوں نے نام بتایا آپ چپ ہو رہے، جب وہ حسب معمول خدمت میں آئے اور سلام کیا تو آپ نے منہ پھیر لیا، انھوں نے پھر سلام کیا، آپ نے پھر منہ پھیر لیا۔ وہ سمجھ گئے کہ ناراضی کی کیا وجہ ہے، جا کر گنبد کو زمین کے برابر کر دیا، ایک دن آپ بازار میں نکلے تو گنبد نظر نہ آیا، معلوم ہوا کہ انصاری نے اس کو ڈھا دیا، ارشاد فرمایا کہ ضروری عمارت کے سوا ہر عمارت انسان کے لئے وبال ہے[3]۔

ایک دفعہ کسی نے کمخواب کی قبا بھیجی، آپ نے پہن لی، پھر خیال آیا اور اتار کر حضرت عمرؓ کے پاس بھیج دی، حضرت عمرؓ روتے ہوئے آئے اور عرض کی کہ آپ نے جو چیز ناپسند کی وہ مجھ کو عنایت ہوتی ہے۔ ارشاد ہوا کہ میں نے استعمال کے لئے نہیں بلکہ فروخت کے لئے بھیجی، چنانچہ حضرت عمرؓ نے فروخت کیا تو وہ ہزار درہم پر اٹھی[4]۔

ایک دفعہ کسی نے ایک مخطط جوڑا بھیجا، آپ نے حضرت علیؓ کو عنایت فرمایا، وہ پہن کر خدمتِ اقدس میں آئے آپ کے چہرہ پر غضب کے آثار پیدا ہوتے اور فرمایا کہ میں نے اس لئے بھیجا تھا کہ پھاڑ کر زنانی چادریں بنائی جائیں[5]۔

مہر کرنے کی غرض سے جب آپ نے انگوٹھی بنوائی تو پہلے سونے کی بنوائی، آپ کی تقلید میں صحابہ نے بھی زریں انگوٹھیاں بنوائیں۔ آپ منبر پر چڑھے اور انگوٹھی اتار کر پھینک دی اور فرمایا کہ اب نہ پہنوں گا، صحابہ نے بھی اسی وقت اتار کر پھینک دیں[6]۔

(جس طرح آپ خود سادگی پسند فرماتے تھے، اسی طرح آپ یہ بھی چاہتے تھے کہ آپ کے اہل و عیال بھی سادہ زندگی بسر کریں اور تکلف و تنعم سے پاک رہیں، عورتوں کو شریعت میں سونے کے زیور کا استعمال مباح ہے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اہل بیت کرام کے لئے اس بات کو بھی خلافِ اولیٰ تصور فرماتے تھے)

ایک دفعہ حضرت فاطمہؓ کے گلے میں سونے کا ہار دیکھا تو فرمایا کہ تم کو یہ ناگوار نہ ہوگا جب لوگ کہیں گے کہ پیغمبر کی لڑکی کے گلے میں آگ کا ہار ہے[7]۔

ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن (مسکتہ) دیکھے، فرمایا کہ اگر اس کو اتار کر ورس کے کنگنی کو زعفران سے رنگ کر پہن لیتیں تو بہتر ہوتا[8]۔

ایک دفعہ نجاشی نے کچھ زیورات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہدیۃً بھیجے، ان میں ایک انگوٹھی تھی جس میں حبشی پتھر کا نگینہ جڑا تھا، آپ کے چہرہ پر کراہت کے آثار ظاہر ہوتے تھے اور لکڑی سے اس کو

[1] ابوداؤد ج ۲ ص ۱۷۱ [2] ابوداؤد ج ۲ ص ۲۱۸ کتاب اللباس [3] ابوداؤد ج ۲ ص ۲۱۹ [4] ایضاً ص ۳۶۴ [5] ایضاً کتاب اللباس [6] ابوداؤد ج ۲ ص ۲۹۰ کتاب اللباس [7] ابوداؤد کتاب الخاتم [8] نسائی ج ۲ ص ۲۸۳ [9] ایضاً۔

چھوتے تھے، ہاتھ نہیں لگاتے تھے[1]۔

ایک دفعہ کسی نے ریشم کا شلوکہ ہدیۃً بھیجا، آپ نے پہن لیا اور اس کو پہن کر نماز ادا فرمائی، نماز سے فارغ ہو کر نہایت کراہت اور نفرت کے ساتھ نوچ کر اتار ڈالا پھر فرمایا "پرہیزگاروں کے لئے یہ کپڑے مناسب نہیں"[2]۔

تواضع اور خاکساری کی راہ سے اکثر معمولی کپڑے استعمال فرماتے تھے، حضرت عمرؓ کو خیال تھا کہ جمعہ و عیدین میں یا سفراء کے ورود کے موقع پر آپ شان و تجمل کے کپڑے زیب تن فرمائیں، اتفاق سے ایک بار راستہ میں ایک ریشمی کپڑا (حلہ سیرا) بک رہا تھا حضرت عمرؓ نے موقع پا کر عرض کیا، یا رسول اللہ! یہ کپڑا حضور خرید لیں اور جمعہ میں اور سفراء کی آمد کے موقع پر ملبوس فرمائیں، ارشاد فرمایا کہ "یہ وہ پہنے جس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں"[3]۔ اکثر موٹے جھوٹے اور بھیڑ کے بال کے بنے ہوئے کپڑے پہنتے تھے اور انہی کپڑوں میں وفات پائی[4]۔

بستر کمبل کا تھا، کبھی چمڑے کا جس میں کھجور کی کھال بھری ہوتی تھی، کبھی معمولی کپڑے کا جو دو تہہ کر دیا جاتا تھا، حضرت حفصہؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک شب کو میں نے بستر مبارک چار تہہ کر کے بچھایا کہ ذرا نرم ہو جائے۔ صبح اٹھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ناگواری ظاہر فرمائی[5]۔

۹ھ میں جب کہ یمن سے شام تک صرف اسلامی حکومت تھی، فرمانروائے اسلام کے گھر میں صرف ایک کھری چارپائی اور چمڑے کا سوکھا ہوا مشکیزہ تھا[6]۔ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ جب آپ نے وفات پائی تو تھوڑے سے جَو کے سوا گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا۔ صحابہ سے فرمایا کرتے تھے کہ دنیا میں انسان کے لئے اتنا کافی ہے، جتنا ایک مسافر کو زادِ راہ کے لئے[7]۔ ایک دفعہ ایک بوریئے پر آرام فرما رہے تھے، اٹھے تو لوگوں نے دیکھا کہ پہلوئے مبارک پر نشان پڑ گئے ہیں۔ عرض کی یا رسول اللہ! کیا ہم لوگ کوئی گدا بنوا کر حاضر کریں۔ ارشاد ہوا کہ مجھ کو دنیا سے کیا تعلق؛ مجھ کو دنیا سے اس قدر تعلق ہے جس قدر اس سوار کو جو تھوڑی دیر کے لئے راہ میں کسی درخت کے سایہ میں بیٹھ جاتا ہے پھر اس کو چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے[8]۔

ایلاء کے زمانہ میں حضرت عمرؓ جب مشربہ میں جو اسباب کی کوٹھڑی تھی حاضر ہوئے تو ان کو نظر آیا کہ سرورِ عالم کے بیت قدس میں دنیاوی ساز و سامان کی کیا کیفیت ہے! جسم مبارک پر صرف ایک تہبند ہے ایک کھری چارپائی بچھی ہے، سرہانے ایک تکیہ پڑا ہے جس میں خرمے کی چھال بھری ہے۔ ایک طرف مٹھی بھر جَو رکھے ہیں ایک کونے میں پائے مبارک کے پاس کسی جانور کی کھال پڑی ہے، کچھ مشکیزہ کی کھالیں سر کے پاس کھونٹی پر لٹک رہی ہیں، یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رونے کا سبب دریافت فرمایا، عرض کی یا رسول اللہ! میں کیوں نہ روؤں، چارپائی کے بان سے جسمِ اقدس میں بدھیاں پڑ گئی ہیں، یہ آپ کے اسباب کی کوٹھڑی ہے، اس میں جو سامان ہے وہ نظر آ رہا ہے، قیصر و کسریٰ تو باغ و بہار کے مزے لوٹیں اور آپ خدا کے پیغمبر اور برگزیدہ ہو کر آپ کے سامان خانہ کی یہ کیفیت ہو۔ ارشاد ہوا،

[1] مسند ابن حنبل ج ۲ ص ۱۱۹ [2] اوپر کی تمام روایتیں صحیح بخاری کتاب اللباس سے ماخوذ ہیں [3] شمائل ترمذی [4] صحیح بخاری کتاب اللباس [5] مسند ابن حنبل ج ۶ ص ۴۲ [6] ابن ماجہ کتاب الزہد [7] جامع ترمذی کتاب الزہد۔

اے ابن خطاب! تم کو یہ پسند نہیں کہ وہ دنیا لیں اور ہم آخرت۔[1]

مساوات

آپؐ کی نظر میں امیر و غریب، صغیر و کبیر، آقا و غلام سب برابر تھے، سلمانؓ و صہیبؓ و بلالؓ کو سب کے سب غلام رہ چکے تھے، آپؐ کی بارگاہ میں رؤسائے قریش سے کم رتبہ نہ تھا، ایک دفعہ حضرت سلمانؓ و بلالؓ ایک موقع پر جمع تھے، اتفاق سے ابوسفیان نکلے، ان لوگوں نے کہا ابھی تلوار نے اس دشمن خدا کی گردن پر پورا قبضہ نہیں پایا ہے، حضرت ابوبکرؓ نے ان لوگوں سے کہا، سرداران قریش کی شان میں یہ الفاظ؟ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور واقعہ بیان کیا، آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ کہیں تم نے ان لوگوں کو ناراض تو نہیں کیا، ان لوگوں کو ناراض کیا تو خدا کو ناراض کیا، حضرت ابوبکرؓ نے فوراً جا کر ان بزرگوں سے کہا بھائیو! آپ لوگ مجھ سے ناراض تو نہیں ہوئے، ان لوگوں نے کہا نہیں، خدا تم کو معاف کرے۔[2] قبیلہ مخزوم کی ایک عورت چوری کے جرم میں گرفتار ہوئی، اسامہ بن زیدؓ جن سے آنحضرتؐ نہایت محبت رکھتے تھے، لوگوں نے ان کو شفیع بنا کر خدمت نبویؐ میں بھیجا، آپؐ نے فرمایا، اسامہ! کیا تم حدود خداوندی میں سفارش کرتے ہو، پھر آپؐ نے لوگوں کو جمع کر کے خطاب فرمایا، تم سے پہلے کی امتیں اسی لئے برباد ہو گئیں کہ جب معزز آدمی کوئی جرم کرتا تو تسامح کرتے اور معمولی آدمی مجرم ہوتے تو سزا پاتے۔ خدا کی قسم! اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ سرقہ کرتی تو اس کے بھی ہاتھ کاٹے جاتے۔[3]

غزوۂ بدر میں دوسرے قیدیوں کے ساتھ آپؐ کے چچا حضرت عباس بھی گرفتار ہو کر آئے تھے، قیدیوں کو زر فدیہ لے کر رہا کیا جاتا تھا، بعض نیک دل انصار نے اس بنا پر کہ وہ آپؐ سے قرابت قریبہ رکھتے تھے عرض کی کہ یا رسول اللہ! اجازت دیجئے کہ ہم اپنے بھانجے (عباس) کا زر فدیہ معاف کر دیں، آپؐ نے فرمایا نہیں، ایک درہم بھی معاف نہ کرو۔[4] مجلس میں جو چیز آتی ہمیشہ داہنی طرف سے اس کی تقسیم شروع فرماتے اور ہمیشہ اس میں امیر و غریب، صغیر و کبیر سب کی مساوات کا لحاظ ہوتا۔

ایک دفعہ خدمت اقدس میں صحابہ کا مجمع تھا، اتفاق سے داہنی طرف حضرت عبداللہ بن عباسؓ بیٹھے ہوئے تھے جو بہت کم سن تھے، بائیں جانب بڑے بڑے معمر صحابہ تھے، کہیں سے دودھ آیا، آپؐ نے نوش فرما کر عبداللہ بن عباسؓ سے کہا تم اجازت دو تو میں ان لوگوں کو دوں۔ انہوں نے عرض کی، اس عطیہ میں کسی ایثار نہیں کر سکتا چونکہ وہ داہنی جانب تھے اور ترتیب مجلس کی رو سے انہی کا حق تھا، آپؐ نے انہی کو ترجیح دی،[5] حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میرے مکان پر تشریف لاتے اور پینے کا پانی مانگا، میں نے بکری کا دودھ پیش کیا، مجلس کی ترتیب یہ تھی کہ حضرت ابوبکرؓ بائیں جانب، حضرت عمرؓ سامنے اور ایک بدو داہنی جانب تھا، آپؐ نے پی لیا تو حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی طرف اشارہ کیا یعنی بقیہ ان کو عنایت ہو، آپؐ نے فرمایا پہلے داہنی طرف والے کا حق ہے، یہ کہہ کر بچا ہوا دودھ بدو کو عنایت فرمایا۔[6]

قریش اپنے فخر و امتیاز کے لئے مزدلفہ میں قیام کرتے تھے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تفریق کو

[1] صحیح مسلم کتاب الطلاق باب تخییر الازواج [2] صحیح مسلم فضائل سلمانؓ و صہیبؓ [3] بخاری و مسلم و ابوداؤد کتاب الحدود [4] صحیح بخاری باب فداء المشرکین [5] صحیح بخاری صفحہ ۸۹ [6] بخاری صفحہ ۳۵۰۔

کبھی پسند نہ فرمایا۔ بعثت سے پہلے اور بعثت کے بعد بھی ہمیشہ عام لوگوں کے ساتھ مقام کرتے تھے،[1] علاوہ بریں یہ بھی گوارا نہ تھا کہ وہاں خاص طور سے کوئی عمدہ جگہ دیکھ کر آپؐ کے لئے مخصوص کر دی جائے اور وہاں سایہ کیلئے کوئی چھپر ڈال دیا جائے، صحابہ نے یہ تجویز پیش کی تو فرمایا جو پہلے پہنچ جائے اس کا مقام ہے۔[2]

صحابہ جب سب مل کر کوئی کام کرتے تو ہمیشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ شریک ہو جاتے اور معمولی مزدور کی طرح کام انجام دیتے، مدینہ میں آکر سب سے پہلا کام مسجد نبویؐ کی تعمیر تھی، اس مسجد اقدس کی تعمیر میں دیگر صحابہ کی طرح خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی بنفس نفیس شریک تھے، خود اپنے دست مبارک سے اینٹ اٹھا اٹھا کر لاتے تھے، صحابہ عرض کرتے تھے، ہماری جانیں قربان آپ کیوں زحمت فرماتے ہیں، لیکن آپ اپنے فرض سے باز نہ آتے۔[3] غزوۂ احزاب کے موقع پر بھی جب تمام صحابہ مدینہ کے چاروں طرف خندق کھود رہے تھے، آپ بھی ایک ادنیٰ مزدور کی طرح کام کر رہے تھے، یہاں تک کہ شکم مبارک پر مٹی اور خاک کی تہہ جم گئی تھی۔[4]

ایک سفر میں کھانا تیار نہ تھا، تمام صحابہ نے مل کر کھانا پکانے کا سامان کیا، لوگوں نے ایک ایک کام بانٹ لیا، جنگل سے لکڑیاں لانے کا کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ذمہ لیا، صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ! یہ کام ہم خدام کر لیں گے۔ فرمایا ہاں سچ ہے لیکن مجھے یہ پسند نہیں کہ میں تم سے اپنے کو ممتاز کروں، خدا اس بندہ کو پسند نہیں کرتا جو اپنے ہمراہیوں میں ممتاز بنتا ہے۔[5]

غزوۂ بدر میں سواریوں کا انتظام بہت کم تھا، تین تین آدمیوں کے بیچ میں ایک ایک اونٹ تھا، لوگ باری باری سے چڑھتے اترتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی عام آدمیوں کی طرح ایک اونٹ میں دو اور آدمیوں کے ساتھ شریک تھے، ہمراہ جان نثارانہ اپنی باری پیش کرتے اور عرض کرتے کہ یا رسول اللہ آپ سوار رہیں، حضور کے بدلے میں ہم پیادہ چلیں گے۔ ارشاد ہوتا کہ نہ تم مجھ سے زیادہ پیادہ پا چل سکتے ہو اور نہ میں تم سے کم ثواب کا محتاج ہوں۔[6]

تواضع

گھر کا کام کاج خود کرتے، کپڑوں میں پیوند لگاتے، گھر میں خود جھاڑو دیتے، دودھ دوہ لیتے، بازار سے سودا لاتے، جوتی پھٹ جاتی تو خود گانٹھ لیتے، گدھے کی سواری سے آپؐ کو عار نہ تھا، غلاموں اور مسکینوں کے ساتھ بیٹھنے اور ان کے ساتھ کھانا کھانے سے پرہیز نہ تھا،[7] ایک دفعہ گھر سے باہر تشریف لائے، لوگ تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوئے، فرمایا کہ اہل عجم کی طرح تعظیم کے لئے نہ اٹھو۔[8] غریب سے غریب بیمار ہوتا تو عیادت کو تشریف لے جاتے، مفلسوں اور فقیروں کے ہاں جا کر ان کے ساتھ بیٹھتے تو اس طرح مل بیٹھتے کہ امتیازی حیثیت کی بنا پر کوئی آپ کو پہچان نہ سکتا، کسی مجمع میں جاتے تو جہاں جگہ مل جاتی بیٹھ جاتے۔[9]

ایک دفعہ ایک شخص ملنے آیا، لیکن نبوت کا رعب اس قدر طاری ہوا کہ کانپنے لگا، آپؐ نے فرمایا کہ گھبراؤ

[1] ابوداؤد کتاب المناسک [2] ایضاً [3] مسند ابن حنبل ج ۲ صفحہ ۱۸۱ [4] صحیح بخاری باب الہجرۃ و بناء المسجد [5] صحیح بخاری باب غزوۂ احزاب [6] زرقانی ج ۴ صفحہ ۳۰۴ بحوالہ سیرت محب طبری، یہ روایت کسی اور کتاب میں نہیں ہے [7] مسند ابن حنبل ج ۱ صفحہ ۱۴۲ و مسند ابوداؤد طیالسی [8] شمائل ترمذی [9] ابوداؤد و ابن ماجہ [10] شمائل ترمذی۔

نہیں میں بادشاہ نہیں، ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت پکا کر کھایا کرتی تھی۔[1]

تواضع اور خاکساری کی راہ سے آپ اکڑوں بیٹھ کر کھانا تناول فرماتے تھے اور فرمایا کرتے تھے "میں بندہ اور بندوں کی طرح کھاتا اور بندوں ہی کی طرح بیٹھتا ہوں"۔ ایک دفعہ کھانے کے موقع پر جگہ تنگ تھی اور لوگ زیادہ آگئے، آپ اکڑوں بیٹھ گئے کہ جگہ نکل آئے، ایک بدو بھی مجلس میں شریک تھا، اس نے کہا محمدؐ! یہ کیا طرز نشست ہے؟ آپ نے فرمایا خدا نے مجھے خاکسار بندہ بنایا ہے، جبار اور سرکش نہیں بنایا ہے۔[2]

تواضع کی انتہا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے متعلق جائز تعظیمی الفاظ بھی نہیں پسند فرماتے تھے۔

ایک بار ایک شخص نے ان الفاظ سے آپ کو خطاب کیا، اے ہمارے آقا اور ہمارے آقا کے فرزند! اور اے ہم میں سب سے بہتر اور ہم میں سب سے بہتر کے فرزند! آپ نے فرمایا۔ لوگو! پرہیزگاری اختیار کرو، شیطان تمہیں بگڑا نہ دے، میں عبداللہ کا بیٹا محمد ہوں، خدا کا بندہ اور اس کا رسول، مجھ کو خدا نے جو مرتبہ بخشا میں پسند نہیں کرتا کہ تم مجھے اس سے زیادہ بڑھاؤ۔[3] ایک دفعہ ایک شخص نے آپ کو یا خیر البریۃ (یعنی اے بہترین خلق) کہہ کر مخاطب کیا، آپ نے فرمایا وہ ابراہیم تھے۔[4]

عبداللہ بن شخیر کا بیان ہے کہ بنی عامر کی سفارت کے ساتھ جب ہم لوگ خدمت اقدس میں آئے تو عرض کی کہ حضورؐ ہمارے آقا سید ہیں، ارشاد فرمایا کہ آقا خدا ہے، پھر ہم لوگوں نے عرض کی کہ آپ ہم میں سب سے افضل اور سب سے برتر ہیں، ارشاد ہوا کہ بات کہو تو دیکھو کہ شیطان تم کو نہیں چلا رہا ہے۔[5]

مدینہ منورہ میں ایک عورت تھی جس کے دماغ میں کچھ فتور تھا، آپ کی خدمت میں آئی اور کہا کہ محمدؐ! مجھ کو تم سے کچھ کام ہے، فرمایا جہاں کہو چل سکتا ہوں، وہ آپ کو ایک کوچہ میں لو گئی اور وہیں بیٹھ گئی، آپ بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئے اور جو کام تھا انجام دے دیا۔ مخرمہؓ ایک صحابی تھے، ایک دفعہ انہوں نے اپنے بیٹے مسورؓ سے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کہیں سے چادریں آئی ہیں اور وہ تقسیم فرما رہے ہیں، آؤ ہم بھی چلیں، آئے تو آپ زنانہ میں تشریف لا چکے تھے، کہا آواز دو۔ انہوں نے کہا میرا یہ رتبہ ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آواز دوں؟ مخرمہ نے کہا بیٹے! محمد جبار نہیں ہیں، ان کی جرأت دلانے سے مسور نے آواز دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوراً نکل آئے اور ان کو دیبا کی قبا عنایت کی جس کی گھنڈیاں زریں تھیں۔[6] ایک دفعہ ایک انصاری نے ایک یہودی کو یہ کہتے سنا کہ اس خدا کی قسم! جس نے موسیٰؑ کو تمام انسانوں پر فضیلت دی، یہ سمجھ کر کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تعریض ہے غصہ میں آکر اس کے منہ پر تھپیڑ کھینچ مارا، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس فریادی آیا، آپ نے انصاری کو بلا بھیجا اور واقعہ کی تحقیق کے بعد فرمایا کہ مجھ کو انبیاء پر فضیلت نہ دو۔[7]

(انسان کے غرور و ترفع کا اصلی موقع وہ ہوتا ہے جب وہ اپنے چپ و راست جلو میں ہزاروں آدمیوں کو چلتے ہوئے دیکھتا ہے جو اس کے ایک اشارہ پر اپنی جان تک قربان کر دینے کو تیار ہو جاتے ہیں، خصوصاً جب وہ فاتح

[1] مستدرک ج ۳ ص ۴۸ علی شرط الشیخین واقعہ فتح مکہ۔ [2] ابوداؤد کتاب الاطعمہ۔ [3] مسند ابن حنبل ج ۳ ص ۱۵۳۔ [4] صحیح بخاری باب فضائل ابراہیم۔ [5] ابوداؤد کتاب الادب و باب کراہیۃ التمادح۔ [6] ایضاً بخاری ص ۱۵۱۔ [7] بخاری کتاب الانبیاء۔ ذکر موسیٰ۔

ایک جرار و پرجوش لشکر کے ساتھ شہر میں داخل ہوتا ہے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تواضع و خاکساری کا منظر اس وقت اور نمایاں ہو جاتا ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر جب آپ شہر میں داخل ہوئے تو تواضع سے سر مبارک کو اس قدر جھکا دیا کہ کجاوہ سے آکر مل گیا، غزوہ خیبر میں جب آپ کا داخلہ ہوا تو آپ ایک گدھے پر سوار تھے جس میں لگام کی جگہ کھجور کی چھال بندھی تھی۔ حجۃ الوداع میں جس کجاوہ پر آپ سوار تھے، شاید چکے ہو کہ اس کی قیمت کیا تھی)[1]

تعظیم اور مدح مفرط سے روکتے تھے

اس نکتہ کا بڑا لحاظ فرماتے تھے، حضرت عیسیٰؑ کی مثال پیش نظر تھی، فرمایا کرتے تھے کہ میری اس قدر مبالغہ آمیز مدح نہ کیا کرو جس قدر نصاریٰ ابن مریمؑ کی کرتے ہیں، میں تو خدا کا بندہ اور اس کا فرستادہ ہوں۔ قیس بن سعدؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں حیرہ گیا، وہاں لوگوں کو دیکھا کہ رئیس شہر کے دربار میں جاتے ہیں تو اس کے سامنے سجدہ کرتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واقعہ بیان کیا اور عرض کی کہ آپ کو سجدہ کیا جائے کہ آپ اس کے زیادہ مستحق ہیں، آپ نے فرمایا کہ تم میری قبر پر گزرو گے تو سجدہ کرو گے؟ کہا نہیں۔ تو فرمایا، جیتے جی بھی سجدہ نہیں کرنا چاہیئے۔[2]

معوذ بن عفراء کی صاحبزادی (ربیع) کی جب شادی ہوئی تو آپ ان کے گھر تشریف لے گئے اور دلہن کے لئے جو فرش بچھایا گیا تھا اس پر بیٹھ گئے، گھر کی لڑکیاں آس پاس جمع ہو گئیں اور دف بجا بجا کر شہدائے بدر کا مرثیہ گانے لگیں۔ گاتے گاتے ایک نے یہ مصرعہ گایا۔

فینا نبیٌّ یعلم ما فی غد — ہم میں ایک پیغمبر ہے جو کل کی باتیں جانتا ہے۔

فرمایا یہ چھوڑ دو اور وہی کہو جو پہلے کہہ رہی تھیں۔[3]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیمؑ نے جس روز انتقال کیا، اتفاق سے اس روز سورج گرہن لگا، لوگوں کے خیال میں ایک پیغمبر کی ظاہری عظمت کا فرضی تخیل یہ تھا کہ اس درد و صدمہ سے کم از کم اجرام سماوی میں انقلاب پیدا ہو جاتے گا۔ لوگوں نے اس اتفاقی واقعہ کو اسی کے واقعہ پر محمول کیا، ایک جاہ پسند انسان کے لئے اس قسم کا اتفاق بہترین موقع ہو سکتا تھا، لیکن نبوت کی شان اس سے بدرجہا ارفع و اعلیٰ ہے آنحضرتؐ نے اسی وقت لوگوں کو مسجد میں جمع کیا اور خطبہ دیا کہ چاند اور سورج میں گرہن لگنا خدا کی آیات قدرت میں ہے کسی کی زندگی اور موت سے ان میں گرہن نہیں لگتا۔[4]

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وضو کر رہے تھے، وضو کا پانی جو دست مبارک سے گرتا، فدائی برکت کے خیال سے اس کو چلوؤں میں لے کر بدن میں مل لیتے، آپ نے پوچھا کہ تم یہ کیوں کر رہے ہو؟ انہوں نے عرض کیا کہ خدا اور خدا کے رسول کی محبت میں۔ فرمایا، اگر کوئی اس بات کی خوشی حاصل کرنا چاہے کہ وہ خدا اور خدا کے رسول سے محبت رکھتا ہے تو اس کو چاہیئے کہ جب باتیں کرے سچ بولے، جب امین بنایا جائے ادائے امانت

[1] شرح شفا قاضی عیاض و سیرت ابن ہشام و مستدرک حاکم ج ۴ ص ۳۱۰۔ [2] مشکوٰۃ اخلاق النبی بحوالہ حاکم ابن ماجہ و بیہقی۔ [3] صحیح بخاری ج ۲ ص ۴۲۱ کتاب الانبیاء۔ ابوداؤد کتاب النکاح باب حق الزوج علی المرأۃ۔ [4] صحیح مسلم باب ضرب الدف فی النکاح۔ صحیح بخاری و مسلم باب صلوٰۃ الکسوف۔

کرے اور کسی کا پڑوسی ہے تو ہمسائیگی کو اچھی طرح نباہے۔[1]

ایک صاحب بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوئے، اثنائے گفتگو میں انہوں نے کہا: جو خدا چاہے اور جو آپ چاہیں۔ ارشاد ہوا: تم نے خدا کا شریک اور ہمسر ٹھہرایا کہو کہ جو خدا تنہا چاہے۔[2]

شرم و حیا صحاح میں ہے کہ آپ دوشیزہ لڑکیوں سے بھی زیادہ شرمیلے تھے اور شرم و حیاء کا اثر آپ کی ایک ایک ادا سے ظاہر ہوتا تھا، کبھی کسی کے ساتھ بد زبانی نہیں کی، بازاروں میں جاتے تو چپ چاپ گزر جاتے، تبسم کے سوا کبھی لب مبارک خندہ و قہقہہ سے آشنا نہیں ہوئے، بھری محفل میں کوئی بات ناگوار ہوتی تو لحاظ کی وجہ سے زبان سے کچھ نہ فرماتے، چہرہ کے اثر سے ظاہر ہوتا اور صحابہ متنبہ ہو جاتے۔

عرب میں اور ممالک کی طرح شرم و حیاء کا بہت کم لحاظ تھا، ننگے نہانا عام بات تھی، حرم کعبہ کا طواف ننگے ہو کر کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بالطبع یہ باتیں سخت ناپسند تھیں۔ ایک دفعہ فرمایا کہ حمام سے پرہیز کرو لوگوں نے عرض کی کہ حمام میں نہانے سے میل چھوٹتا ہے اور بیماری میں فائدہ ہوتا ہے۔ ارشاد فرمایا کہ نہاؤ تو پردہ کر لیا کرو۔[3] عرب میں حمام نہ تھے لیکن شام و عراق کے جو شہر عرب کی سرحد سے ملے ہوئے تھے وہاں کثرت سے حمام تھے اس بنا پر آپ نے فرمایا کہ جب عجم فتح کرو گے تو وہاں حمام ملیں گے، ان میں جانا تو چادر کے ساتھ جانا۔

ایک دفعہ کچھ عورتیں حضرت ام سلمہؓ کے پاس آئیں، انھوں نے وطن پوچھا، بولیں حمص (شام کا ایک شہر ہے) حضرت ام سلمہؓ نے کہا تم ہی وہ عورتیں ہو جو حمام میں نہاتی ہیں؟ بولیں کیا حمام کوئی بری چیز ہے؟ فرمایا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو عورت اپنے گھر کے سوا کسی گھر میں کپڑے اتارتی ہے خدا اس کی پردہ دری کرتا ہے۔[4] ابوداؤد میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حمام میں نہانے کو مطلقاً منع کر دیا تھا، پھر مردوں کو بردوں کی قید کے ساتھ اجازت دی لیکن عورتوں کے لئے وہی حکم قائم رہا، عرب میں جائے ضرور نہ تھے[5] لوگ میدانوں میں رفع حاجت کے لئے جایا کرتے تھے لیکن پردہ نہیں کرتے تھے بلکہ آمنے سامنے بیٹھ جایا کرتے اور ہر قسم کی بات چیت کرتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی سخت ممانعت کی اور فرمایا کہ خدا اس سے ناراض ہوتا ہے۔[6]

معمول تھا کہ رفع حاجت کے لئے اس قدر دور نکل جاتے کہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے، مکہ معظمہ میں جب تک قیام تھا، حدود حرم سے باہر چلے جاتے جس کا فاصلہ مکہ معظمہ سے کم از کم تین میل تھا۔[7]

اپنے ہاتھ سے کام کرنا اگرچہ تمام صحابہ آپ کے جاں نثار خادموں میں داخل تھے، بایں ہمہ آپ خود اپنے ہاتھ سے کام کرنے کو پسند کرتے تھے، حضرت عائشہؓ، ابو سعید خدریؓ اور امام حسنؓ سے روایت ہے کہ کان یخدم نفسہ یعنی آپ اپنے کام خود اپنے دستِ مبارک سے انجام دیا کرتے تھے۔ ایک شخص نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ آپ گھر میں کیا کیا کرتے تھے؟ جواب دیا کہ گھر کے کام کاج میں مصروف رہتے تھے

---

[1] مشکوٰۃ بحوالہ شعب الایمان بیہقی [2] ادب المفرد امام بخاری ص ۱۱۵ مصر [3] یہ تمام روایتیں ترغیب و ترہیب میں کتب حدیث کے حوالے سے منقول ہیں [4] صحیح بخاری حدیث الملک [5] ابوداؤد و ابن ماجہ [6] شرح شفائے قاضی عیاض ج ۲ ص ۱۱۶۔

کپڑوں میں اپنے ہاتھ سے خود پیوند لگاتے تھے، گھر میں خود جھاڑو دے لیتے تھے، دودھ دوہ لیتے تھے بازار سے سودا خرید لاتے تھے، جوتی پھٹ جاتی تو خود گانٹھ لیتے تھے، ڈول میں ٹانکے لگا دیتے تھے، اونٹ کو اپنے ہاتھ سے باندھ دیتے تھے، اس کو چارہ دیتے تھے، غلام کے ساتھ مل کر آٹا گوندھتے تھے۔[1]

حضرت انسؓ بن مالک ایک دفعہ خدمت مبارک میں حاضر ہوئے تو دیکھا، آپ خود اپنے ہاتھ سے ایک اونٹ کے بدن پر تیل مل رہے تھے، ان سے دوسری روایت ہے کہ انہوں نے دیکھا کہ آپ صدقہ کے اونٹوں کو داغ رہے ہیں، تیسری روایت میں وہ کہتے ہیں کہ آپ بکریوں کو داغ لگا رہے تھے۔[2]

ایک دفعہ مسجد نبوی میں تشریف لے گئے، دیکھا تو مسجد میں کسی نے ناک صاف کی ہے، آپ نے خود دستِ مبارک سے ایک کنکر لے کر اس کو کھرچ ڈالا اور آئندہ لوگوں کو اس فعل سے منع فرمایا۔[3]

آپ جب بچے تھے اور خانہ کعبہ کی تعمیر ہو رہی تھی تو اس وقت بھی پتھر اٹھا اٹھا کر معماروں کے پاس لاتے تھے۔[4] مسجد قبا اور مسجد نبوی کی تعمیر اور خندق کے کھودنے میں جس طرح عام مزدوروں کے ساتھ مل کر آپ نے کام کیا، خود دستِ مبارک سے جس طرح پتھر اٹھا اٹھا کر دیا اور جس طرح زمین کھود دی اس کی تفصیل جلد اول کے واقعات میں گزر چکی ہے، ایک سفر میں صحابہ نے بکری ذبح کی اور اس کو پکانے کے لئے آپس میں کام بانٹ لئے، آپ نے فرمایا جنگل سے لکڑی میں لاؤں گا، صحابہ نے تامل کیا تو فرمایا: میں امتیاز پسند نہیں کرتا، ایک اور سفر میں آپ کی جوتی کا تسمہ ٹوٹ گیا۔ آپ نے خود اس کو درست کرنا چاہا۔ ایک صحابی نے عرض کی یا رسول اللہ! لائیے میں ٹانک دوں، فرمایا یہ تشخص پسندی ہے جو مجھے محبوب نہیں ہے۔ دو صحابی بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم لوگ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ آپ خود اپنے دستِ مبارک سے مکان کی مرمت کر رہے ہیں، ہم لوگ بھی اس کام میں شریک ہو گئے، جب کام ختم ہو گیا تو آپ نے ہمارے لئے دعائے خیر فرمائی۔[5]

دوسروں کے کام کر دینا خبابؓ بن ارت ایک صحابی تھے، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کسی غزوہ پر بھیجا، خبابؓ کے گھر میں کوئی مرد نہ تھا اور عورتوں کو دودھ دوہنا نہیں آتا تھا، اس بنا پر آپ ہر روز ان کے گھر جاتے اور دودھ دوہ دیا کرتے۔ حبش سے جو مہمان آتے تھے صحابہ نے چاہا کہ وہ ان کی خدمت گزاری کریں، لیکن آپ نے ان کو روک دیا اور فرمایا کہ انہوں نے میرے دوستوں کی خدمت کی ہے اس لئے میں خود ان کی خدمت گزاری کا فرض انجام دوں گا۔ کفار ثقیف جنہوں نے طائف میں آپ کے پائے مبارک کو زخمی کر دیا تھا ۹ھ میں وفد لے کر آئے تو آپ نے ان کو مسجد نبوی میں اتارا اور بہ نفسِ نفیس ان کی

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب اور باب ما یکون الرجل فی مہنۃ اہلہ میں مجمل ہے، قاضی عیاض نے شفا میں متعدد حدیثوں سے لے کر اور ٹکڑے بھی جمع کر دیئے ہیں، زرقانی نے ج ۴ ص ۳۰۴ میں مسند احمد و ابن سعد سے یہ روایت نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے [2] یہ تینوں روایتیں صحیح مسلم میں ہیں، پہلی روایت کتاب الادب میں اور دوسری اور تیسری باب جواز وسم الحیوان میں ہے [3] سنن نسائی کتاب المساجد [4] صحیح بخاری باب الجاہلیۃ [5] زرقانی ج ۴ ص ۳۰۴ بحوالہ سیرت محب طبری [6] ایضاً بحوالہ کتاب تمثال النعل الشریف لابی الیمن ابن عساکر [7] مسند ابن حنبل ج ۳ ص ۴۶۹۔

مہمانی کے فرائض ادا کئے۔

مدینہ کی لونڈیاں آپ کی خدمت میں آتیں اور کہتیں، یارسول اللہ میرا یہ کام ہے، آپ فوراً اٹھ کھڑے ہوتے اور ان کا کام کردیتے۔ مدینہ میں ایک پاگل لونڈی تھی، وہ ایک دن حاضر ہوئی اور آپ کا دستِ مبارک پکڑ لیا۔ آپ نے فرمایا، اے عورت! مدینہ کی جس گلی میں تو چاہے بیٹھ، میں تیرا کام کردوں گا، چنانچہ آپ اس کے ساتھ مدینہ کی ایک گلی میں جاکر بیٹھے اور اس کی ضرورت پوری کی۔ عبداللہ بن ابی اوفی ایک صحابی ہیں، وہ فرماتے ہیں۔

ولا یانف ان یمشی مع الارملة والمسکین فیقضی له الحاجة (نسائی ودارمی)

بیوہ اور مسکین کے ساتھ چل کر ان کا کام کردینے میں آپ کو عار نہ تھا۔

ایک دفعہ آپ نماز کے لئے کھڑے ہوچکے تھے کہ ایک بدو آیا اور آپ کا دامن پکڑ کر بولا، میرا ذرا سا کام رہ گیا ہے، ایسا نہ ہو کہ میں بھول جاؤں، پہلے اس کو کردو، آپ اس کے ساتھ فوراً مسجد سے باہر نکل آتے اور اس کا کام انجام دے کر نماز ادا کی۔[1]

عزم واستقلال

خدا نے قرآن مجید میں اولوالعزم من الرسل کہہ کر انبیائے کبار کی مدح فرمائی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ خاتم الرسل تھے اس لئے خصوصیت کے ساتھ خدا نے یہ وصف آپ کی ذات میں ودیعت کیا تھا۔ ابتدا سے انتہا تک اسلام کا ایک ایک کارنامہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عزم واستقلال کا مظہر اتم ہے، عرب کے کفرستان میں ایک شخص تنہا کھڑا ہوتا ہے بے یار ومددگار دعوتِ حق کی صدائیں بلند کرتا ہے، ریگستان کا ذرہ ذرہ اس کی مخالفت میں پہاڑ بن کر سامنے آتا ہے، لیکن وقارِ نبوت اور عزم ربانی سے ٹھوکر کھاکر پیچھے ہٹ جاتا ہے اور مخالفتوں کی تمام قوت اس کے سامنے چور چور ہوجاتی ہے۔

تیرہ برس کی متواتر ناکامیوں کے بعد بھی ذاتِ اقدس جبن ویاس سے آشنا نہیں ہوتی اور بالآخر وہ دن آتا ہے جب ایک تنہا انسان ایک لاکھ جان نثاروں کو چھوڑ کر دنیائے فانی کو الوداع کہتا ہے، ہجرت سے قبل ایک دفعہ صحابہ نے کفار کی ایذارسانیوں سے تنگ آکر خدمتِ مبارک میں عرض کہ آپ ہمارے لئے کیوں دعا نہیں فرماتے آپ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہوگیا اور فرمایا کہ تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں ان کو آرے سے چیر کر دو ٹکڑے کردیا جاتا تھا، ان کے بدن پر لوہے کی کنگھیاں چلائی جاتی تھیں جس سے گوشت پوست علیحدہ ہوجاتا تھا لیکن یہ آزمائشیں بھی ان کو مذہب سے برگشتہ نہیں کرسکتی تھیں، خدا کی قسم! دین اسلام اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچ کر رہے گا، یہاں تک کہ صنعاء سے حضر موت تک ایک سوار اس طرح بے خطر چلا آئے گا کہ اس کو خدا کے سوا کسی کا ڈر نہ ہوگا۔[2]

مکہ میں رؤسائے قریش جب ہر قسم کی تدبیروں سے تھک گئے تو انہوں نے آپ کے سامنے حکومت کا تخت، زر وجواہر کا خزانہ اور حسن کی دولت پیش کی، ان میں سے ہر چیز بہادر سے بہادر انسان کے قدم کو ڈگمگانے کے لئے کافی تھی، لیکن آپ نے ذلت کے ساتھ ان کی درخواست کو ٹھکرا دیا اور بالآخر وہ وقت آیا جب آخری ہمدم

[1] مسلم اور ابوداؤد اخلاق وآداب [2] ابوداؤد کتاب الادب وبخاری کتاب صلوٰۃ مختصراً [3] صحیح بخاری ج ۱ باب مالقی النبی۔

ودمساز یعنی ابوطالب نے بھی ساتھ چھوڑنا چاہا تو یہ غور وفکر کا آخری لمحہ اور عزم واستقلال کا آخری امتحان تھا، اس وقت آپ نے جواب میں جو فقرے فرمائے عالم کائنات میں ثبات وپامردی کے اظہار کا سب سے آخری طریقۂ تعبیر ہے، آپ نے فرمایا چچا جان! اگر قریش میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں میں چاند رکھ دیں تب بھی اپنے اعلانِ حق سے باز نہ آؤں گا۔ (ابن ہشام)

غزوۂ بدر میں جب تین سو بے سروسامان مسلم، ایک ہزار ساز وسامان فوج سے معرکہ آرا تھے، کفار قریش اپنے زور وکثرت سے بپھرے آتے تھے، اس وقت مسلمان سمٹ سمٹ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں آجاتے تھے اور بایں ہمہ نبوت کا کوہ وقار اپنی جگہ پر قائم تھا۔[1]

غزوۂ اُحد میں آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا تو سب نے حملہ کی رائے دی لیکن جب آپ زرہ پہن کر تیار ہوگئے تو صحابہ نے رک جانے کا مشورہ دیا، آپ نے فرمایا "پیغمبر زرہ پہن کر اتار نہیں سکتا۔"[2] غزوۂ حنین میں جب قبیلۂ ہوازن کے قدر اندازوں نے متصل تیروں کی بوچھاڑ کی تو اکثر صحابہ کے قدم اکھڑ گئے، لیکن آپ نہایت سکون واطمینان سے چند جان نثاروں کے ساتھ میدان میں جمے رہے، اس وقت زبان مبارک پر یہ رجز جاری تھا۔

انا النبی لاکذب انا ابن عبد المطلب۔[3]

میں پیغمبر صادق ہوں، میں فرزند عبدالمطلب ہوں۔

ایک بار آپ کسی غزوہ میں درخت کے نیچے آرام فرمارہے تھے، ایک کافر آیا اور اسی حالت خواب میں تلوار کھینچ کر بولا۔ محمد! اب تم کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: خدا: اس عزم واستقلال اور جرأت صادقہ نے اس کو اس قدر مرعوب کردیا کہ فوراً اس نے تلوار میان میں کرلی اور پاس بیٹھ گیا۔[4]

شجاعت

یہ وصف انسانیت کا اعلیٰ جوہر اور اخلاق کا سنگِ بنیاد ہے، عزم استقلال، حق گوئی، راست گفتاری، پردلی، یہ تمام باتیں شجاعت ہی سے پیدا ہوتی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سینکڑوں مصائب وخطرات اور بیسیوں معرکے اور غزوات پیش آئے لیکن کبھی پامردی اور ثبات کے قدم نے لغزش نہیں کھائی، غزوۂ بدر میں گھمسان کی لڑائی میں ۳۰۰ نہتے مسلمانوں کے قدم جب ایک ہزار مسلح فوج کے حملوں سے ڈگمگا جاتے تھے تو دوڑ کر مرکزِ نبوت ہی کے دامن میں آکر پناہ لیتے تھے، حضرت علیؓ جن کے دست وبازو نے بڑے بڑے معرکے سر کئے کہتے ہیں کہ جب بدر میں زور کا رن پڑا تو ہم لوگوں نے آپ ہی کی آڑ میں آکر پناہ لی، آپ سب سے زیادہ شجاع تھے مشرکین کی صف سے اس دن آپ سے زیادہ کوئی قریب نہ تھا۔[5]

غزوۂ حنین میں ہوازن کے بے پناہ تیروں کی بارش ہوئی تو مسلمانوں کی کثیر التعداد فوج دفعۃً میدان سے ہٹ گئی، لیکن آپ مع چند جاں نثاروں کے بدستور میدان میں کھڑے رہے، اس وقت بار بار آپ اپنے خچر کو ایڑ لگاکر آگے بڑھانے کا قصد فرمارہے تھے لیکن جان نثار مانع آتے تھے، اب دشمنوں کی تمام فوج کا نشانہ صرف آپ کی ذات تھی، بایں ہمہ پائے اقدس میں لغزش نہیں ہوئی، حضرت براءؓ جو اس معرکہ میں شریک تھے کسی نے

[1] مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۱۲۶ [2] بخاری ج ۲ ص ۱۰۹۰ باب قول اللہ وامرہم شوری بینہم [3] صحیح بخاری حنین [4] بخاری ج ۲ ص ۵۹۳ غزوۂ ذات الرقاع [5] مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۱۲۶۔

اُن سے پوچھا کہ کیا حنین میں تم بھاگ کھڑے ہوئے تھے؟ جواب دیا ہاں یہ سچ ہے، لیکن میں گواہی دیتا ہوں کہ آنحضرتؐ اپنی جگہ سے نہیں ہٹے تھے۔ خدا کی قسم! جب لڑائی پورے زور پر ہوتی تھی تو ہم لوگ آپؐ ہی کے پہلو میں آ کر پناہ لیتے تھے، ہم میں، سب سے بڑا بہادر وہ شمار ہوتا تھا جو آپؐ کے ساتھ کھڑا ہوتا تھا[1]۔

حضرت انسؓ بن مالک کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ شجاع تھے، ایک دفعہ مدینہ میں شور ہوا کہ دشمن آ گئے، لوگ مقابلہ کے لئے تیار ہو گئے، لیکن سب سے پہلے جو آگے بڑھ کر نکلا وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے، جلدی میں آپؐ نے اس کا بھی انتظار نہیں کیا کہ گھوڑے پر زین کسی جائے، گھوڑے کی برہنہ پشت پر سوار ہو کر آپؐ تمام خطروں کے مقامات میں گشت لگا آئے اور واپس آ کر لوگوں کو تسکین دی کہ کوئی خطرہ کی بات نہیں[2]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی کو اپنے دستِ خاص سے قتل نہیں کیا، ابی بن خلف آپؐ کا سخت دشمن تھا، بدر میں فدیہ دے کر رہا ہوا تو ساتھ ساتھ یہ کہتا گیا "میرے پاس ایک گھوڑا ہے جس کو میں ہر روز جوار کھلاتا ہوں، اسی پر چڑھ کر محمدؐ کو قتل کروں گا" اُحد میں اسی گھوڑے کو اڑاتا اور صفوں کو چیرتا ہوا آپؐ کے پاس پہنچ گیا، مسلمانوں نے چاہا کہ اس کو بیچ میں روک لیں، آپؐ نے منع فرمایا اور ایک مسلمان کے ہاتھ سے نیزہ لے کر آپؐ اس کی طرف بڑھے اور آہستہ سے اس کی گردن میں انی چبھو دی، وہ چنگھاڑ مار کر بھاگا، لوگوں نے کہا یہ تو کوئی بڑا زخم نہیں تم اس قدر خوف زدہ کیوں ہو؟ اس نے کہا ہاں سچ ہے، لیکن یہ محمدؐ کے ہاتھ کا زخم ہے[3]۔

راست گفتاری

راست گفتاری پیغمبر کی ایک ضروری صفت ہے اور اس کا وجود ان کی ذات سے کبھی منفک نہیں ہو سکتا، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے عنوان میں اس کے جزئیات کی تفصیل کی ضرورت نہ تھی، لیکن اس موقع پر ہم صرف اُن شہادتوں کو قلمبند کرنا چاہتے ہیں جو دشمنوں کے اعتراف سے ہاتھ آ سکی ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب نبوت کا دعویٰ کیا تو کفار میں جو لوگ آپؐ سے واقف تھے انہوں نے آپؐ کو کاذب اور دروغ گو یقین نہیں کیا بلکہ یہ سمجھا کہ نعوذ باللہ آپؐ کے حواس درست نہیں یا آپؐ کی عقل نہیں بجا رہی ہے یا یہ کہ ان میں اب شاعرانہ تخیل پرستی آ گئی ہے۔ اسی بنا پر انہوں نے آپؐ کو مجنوں کہا، مسحور کہا، شاعر کہا، لیکن کاذب نہیں کہا۔

ایک روز قریش کے بڑے بڑے رؤسا۔ جلسہ جمائے بیٹھے تھے اور آپؐ کا ذکر ہو رہا تھا۔ نضر بن حارث نے جو قریش میں سب سے زیادہ جہاندیدہ تھا، کہا اے قریش! تم پر جو مصیبت آئی ہے، اب تک تم اس کی کوئی تدبیر نہ نکال سکے۔ محمدؐ تمہارے سامنے بچہ سے جوان ہوا، وہ تم میں سب سے زیادہ پسندیدہ، صادق القول اور امین تھا اب جب اس کے بالوں میں سپیدی آ چلی اور تمہارے سامنے یہ باتیں پیش کیں تو کہتے ہو کہ وہ ساحر ہے، کاہن ہے شاعر ہے، مجنون ہے، خدا کی قسم! میں نے اس کی باتیں سُنی ہیں، محمدؐ میں یہ کوئی بات نہیں، تم پر یہ کوئی مصیبت ہی نئی آئی ہے[4]۔ ابوجہل کہا کرتا تھا "محمدؐ! میں تم کو جھوٹا نہیں کہتا، البتہ جو کچھ کہتے ہو اس کو صحیح نہیں سمجھتا۔" قرآن مجید کی

[1] صحیح مسلم غزوہ حنین [2] صحیح بخاری کے متفرق ابواب میں یہ حدیث ہے، مثلاً باب الشجاعت فی الحرب و باب لنا فزعوا باللیل [3] شفا قاضی عیاض ج ۲ ص ۶۴ بحوالہ بیہقی بسند صحیح و مصنف عبدالرزاق و ابن سعد و واقدی۔ [4] ابن ہشام۔

یہ آیت اسی موقع پر نازل ہوئی ہے[1]۔

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ۔ (انعام-۴)

ہم جانتے ہیں کہ اے پیغمبر ان کافروں کی باتیں تم کو غمگین کرتی ہیں کیونکہ وہ تجھ کو نہیں جھٹلاتے، البتہ یہ ظالم اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پیشگاہِ الٰہی سے حکم ہوا کہ اپنے اہل خاندان کو اسلام کی دعوت دو تو آپؐ نے ایک پہاڑ پر چڑھ کر پکارا "یا معشر قریش!" جب سب لوگ جمع ہو گئے تو فرمایا "اگر میں تم سے یہ کہوں کہ پہاڑ کے عقب سے ایک لشکر آ رہا ہے تو تم کو یقین آئے گا؟" سب نے کہا "ہاں! کیونکہ ہم نے تم کو کبھی جھوٹ بولتے نہیں دیکھا"[2]۔

قیصر روم نے دربار میں ابوسفیان سے پوچھا کہ تمہارے ہاں جو مدعی پیدا ہوا ہے اس دعویٰ سے پہلے کبھی تم نے اس کو دروغ گو بھی پایا، ابوسفیان نے کہا نہیں، آخر میں قیصر نے جو تقریر کی اس میں کہا میں نے تم سے پوچھا کہ تمہارے نزدیک وہ کبھی کذب کا بھی مرتکب ہوا تو تم نے جواب دیا کہ نہیں، مجھے یقین ہے کہ اگر وہ خدا پر افترا باندھتا تو وہ آدمیوں پر افترا باندھنے سے کب باز رہتا[3]۔

ایفائے عہد

ایفائے عہد آپؐ کی ایک ایسی عام خصوصیت تھی کہ دشمن بھی اس کا اعتراف کرتے تھے، چنانچہ قیصر نے اپنے دربار میں آپؐ کے متعلق ابوسفیان سے جو سوالات کئے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ کیا کبھی محمدؐ نے بدعہدی بھی کی ہے؟ ابوسفیان کو مجبوراً یہ جواب دینا پڑا کہ "نہیں"[4]۔ وحشی، جنہوں نے حضرت حمزہؓ کو شہید کیا تھا، اسلام کے ڈر سے شہر بشہر پھرا کرتے تھے۔ اہل طائف نے مدینہ بھیجنے کے لئے جو وفد مرتب کیا اس میں ان کا نام بھی تھا لیکن ان کو ڈر تھا کہ کہیں مجھ سے انتقام نہ لیا جائے، لیکن خود دشمنوں نے ان کو یقین دلایا کہ تم بے خوف و خطر جاؤ، محمدؐ سفراء کو قتل نہیں کرتے، چنانچہ وہ اس اعتماد پر دربارِ نبوت میں حاضر ہوئے اور اسلام لائے[5]۔ صفوان بن امیہ (قبل اسلام) شدید ترین دشمنوں میں تھے، جب مکہ فتح ہوا تو وہ بھاگ کر یمن کے ارادہ سے جدہ چلے گئے، عمیر بن وہب نے حاضرِ خدمت ہو کر واقعہ عرض کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمامہ مبارک عنایت کیا اور فرمایا کہ یہ صفوان کی امان کی نشانی ہے۔ عمیر عمامہ مبارک لے کر صفوان کے پاس پہنچے اور کہا تم کو بھاگنے کی ضرورت نہیں تم کو امان ہے، جب خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے تو عرض کی کہ کیا آپؐ نے مجھے امان دی ہے؟ ارشاد ہوا کہ ہاں یہ سچ ہے[6]۔

ابو رافع ایک غلام تھے، حالاتِ کفر میں قریش کی طرف سے سفیر بن کر مدینہ منورہ آئے، روئے اقدس پر نظر پڑی تو بے اختیار اسلام کی صداقت ان کے دل میں جاگزین ہو گئی، عرض کی یا رسول اللہ! اب میں کبھی کافروں کے پاس لوٹ کر نہ جاؤں گا۔ ارشاد ہوا، نہ میں عہد شکنی کر سکتا ہوں اور نہ قاصدوں کو اپنے پاس روک سکتا ہوں تم اس وقت واپس جاؤ، اگر وہاں پہنچ کر بھی تمہارے دل کی یہی کیفیت باقی رہے تو آ جانا، چنانچہ وہ اس وقت

[1] جامع ترمذی تفسیر انعام [2] صحیح بخاری تفسیر سورۂ تبت [3] صحیح بخاری باب بدء الوحی [4] ایضاً [5] صحیح بخاری غزوۂ احد [6] ابن ہشام۔

واپس گئے، پھر اسلام لائے[1]۔

صلح حدیبیہ میں ایک شرط یہ تھی کہ مکہ سے جو مسلمان ہو کر مدینہ جائے گا وہ اہل مکہ کے مطالبہ پر واپس کر دیا جائے گا، عین اس وقت جب معاہدہ کی شرطیں زیر تحریر تھیں، ابو جندلؓ پا بزنجیر اہل مکہ کی قید سے بھاگ کر آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فریادی ہوئے۔ تمام مسلمان اس دردانگیز منظر کو دیکھ کر تڑپ اٹھے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باطمینان تمام ان کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا، "اے ابو جندل صبر کرو! ہم بدعہدی نہیں کر سکتے اللہ تعالیٰ عنقریب تمہارے لئے کوئی راستہ نکالے گا[2]"۔

نبوت سے پہلے کا واقعہ ہے کہ عبداللہ بن ابی الحمساء نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ معاملہ کیا اور آپ کو بٹھا کر چلے گئے کہ آ کر حساب کر دیتا ہوں۔ اتفاق سے ان کو خیال نہ رہا، تین دن کے بعد آئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی جگہ تشریف رکھتے تھے، ان کو دیکھ کر فرمایا، میں تین دن سے یہاں تمہارے انتظار میں بیٹھا ہوں[3]۔

غزوۂ بدر میں کافروں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی تعداد ایک ثلث سے بھی کم تھی، ایسے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قدرتی خواہش یہ ہونی چاہئے تھی کہ جس قدر آدمی بڑھ سکیں بہتر ہے، لیکن آپ اس وقت بھی ہمہ تن وفا تھے، حذیفہؓ بن الیمان اور ابو حسیلؓ دو صحابی مکہ سے آ رہے تھے، راہ میں کفار نے ان کو روکا کہ محمدؐ کے پاس جا رہے ہو، انہوں نے انکار کیا۔ آخر اس شرط پر ان کو رہائی ملی کہ وہ جنگ میں آپ کا ساتھ نہ دیں گے، یہ دونوں صاحب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو صورت حال عرض کی، فرمایا تم دونوں واپس جاؤ، ہم ہر حال میں وعدہ وفا کریں گے، ہم کو صرف خدا کی مدد درکار ہے[4]۔

زہد و قناعت

مصنفین یورپ کا عام خیال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ میں تھے، پیغمبر تھے مدینہ پہنچ کر پیغمبر سے بادشاہ بن گئے لیکن واقعہ یہ ہے کہ آپ تمام عرب کے زیر نگین ہو جانے پر بھی فاقہ کش رہے۔ صحیح بخاری باب الجہاد میں روایت ہے کہ وفات کے وقت آپ کی زرہ ایک یہودی کے یہاں تین صاع جو پر گروی تھی، جن کپڑوں میں آپ نے وفات پائی ان میں اوپر تلے پیوند لگے ہوئے تھے، یہ وہ زمانہ ہے جب تمام عرب حدود شام سے لے کر عدن تک فتح ہو چکا ہے اور مدینہ کی سرزمین میں زر و سیم کا سیلاب آ چکا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ آپ کی مہمات فرائض میں رہبانیت کا قلع قمع کرنا بھی تھا جس کی نسبت خدا نے نصاریٰ کو ملامت کی تھی کہ رھبانیۃ ابتدعوھا اس بنا پر آپ نے کبھی کبھی اچھے کھانے اور اچھے کپڑے بھی استعمال کئے ہیں لیکن اصلی میلان طبع زخارف دنیوی سے اجتناب تھا۔ فرمایا کرتے، فرزند آدم کو ان چند چیزوں کے سوا اور کسی چیز کا حق نہیں، رہنے کے لئے گھر، ستر پوشی کے لئے ایک کپڑا اور شکم سیری کے لئے روکھی سوکھی روٹی اور پانی[5]۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں لم یطو لہ ثوب کبھی آپ کا کوئی کپڑا تہہ کر کے نہیں رکھا گیا، یعنی صرف ایک جوڑا کپڑا ہوتا تھا دوسرا نہیں ہوتا تھا جو تہہ کر کے رکھا جا سکتا۔

[1] ابو داؤد باب الوفاء بالعہد [2] صحیح بخاری کتاب الشروط آخری فقرے ابن ہشام میں ہیں [3] ابو داؤد کتاب الادب [4] صحیح مسلم باب الوفاء بالعہد ج ۲ ص ۱۹ [5] جامع ترمذی ابواب الزہد

ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ گھر کی دیوار کی مرمت کر رہے تھے، اتفاقاً آپ کسی طرف سے آ گئے۔ پوچھا کیا شغل ہے؟ عبداللہ بن عمرؓ نے عرض کی، دیوار کی مرمت کر رہا ہوں، ارشاد ہوا کہ اتنی مہلت کہاں؟[1]

گھر میں اکثر فاقہ رہتا تھا اور رات کو تو اکثر آپ اور سارا گھر بھوکا سو رہتا تھا۔

کان رسول اللہ یبیت اللیالی المتتابعۃ طاویا ھو واھلہ لا یجدون عشاء[2]۔ آپ اور آپ کے اہل و عیال متصل کئی کئی رات بھوکے رہ جاتے تھے کیونکہ رات کا کھانا میسر نہیں ہوتا تھا۔

پیہم دو دو مہینے تک گھر میں آگ نہیں جلتی تھی، حضرت عائشہؓ نے ایک موقع پر جب یہ واقعہ بیان کیا تو عروہ بن زبیرؓ نے پوچھا کہ آخر گزارا کس چیز پر تھا؟ بولیں کہ پانی اور کھجور، البتہ ہمسائے کبھی کبھی بکری کا دودھ بھیج دیتے تو پی لیتے تھے[3]۔ آپ نے تمام عمر کبھی چپاتی کی صورت نہیں دیکھی[4]۔ میدہ جس کو عرب میں حواری اور نقی کہتے ہیں کبھی نظر سے نہیں گزرا۔ سہل بن سعد جو اس واقعہ کے راوی ہیں ان سے لوگوں نے پوچھا کہ کیا آنحضرتؐ کے زمانہ میں چھلنیاں نہ تھیں، بولے نہیں، لوگوں نے پھر پوچھا کہ آخر کس چیز سے آٹا چھانتے تھے، بولے منہ سے پھونک کر بھوسی اڑا دیتے تھے جو رہ جاتا اسی کو گوندھ کر پکا لیتے[5]۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ تمام عمر یعنی مدینہ کے قیام سے وفات تک آپ نے کبھی دو وقت سیر ہو کر روٹی نہیں کھائی[6]۔

فدک اور خیبر وغیرہ کے ذکر میں محدثین اور ارباب سیر لکھتے ہیں کہ آپ ان کی آمدنی سے سال بھر کا خرچ لے لیا کرتے تھے۔ یہ واقعہ بظاہر روایات مذکورہ بالا کے مخالف معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت دونوں صحیح ہیں، بے شبہ آپ بقدر نفقہ آمدنی میں سے لے لیتے۔ باقی فقراء اور اہل حاجت کو دے دیتے تھے، لیکن آپ اپنے لئے جو رکھ لیتے تھے وہ بھی اہل حاجت کے نذر ہو جاتا تھا۔ احادیث میں آپ کی فاقہ کشی اور تنگ دستی کے واقعات نہایت کثرت سے موجود ہیں، چند روایتیں اس موقع پر ہم درج کرتے ہیں۔

ایک دفعہ ایک شخص خدمت اقدس میں حاضر ہوا کہ سخت بھوکا ہوں۔ آپ نے ازواج مطہراتؓ میں سے کسی کے ہاں کہلا بھیجا کہ کچھ کھانے کو بھیج دو۔ جواب آیا کہ گھر میں پانی کے سوا کچھ نہیں۔ آپ نے دوسرے گھر کہلا بھیجا، وہاں سے بھی یہی جواب آیا، مختصر یہ کہ آٹھ نو گھروں میں پانی کے سوا کھانے کی کوئی چیز نہ تھی[7]۔

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ ایک دن خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ آپ نے شکم کو کپڑے سے کس کر باندھا ہے، سبب پوچھا تو حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا کہ بھوک کی وجہ سے[8]۔

حضرت ابو طلحہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ مسجد میں زمین پر لیٹے ہوتے ہیں اور بھوک کی وجہ سے بار بار کروٹیں بدلتے ہیں[9]۔

ایک دفعہ صحابہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں فاقہ کشی کی شکایت کی اور پیٹ کھول کر دکھایا کہ پتھر بندھے تھے، آپ نے شکم کھولا تو ایک کے بجائے دو دو پتھر تھے[10]۔

[1] ابن ماجہ کتاب اللباس [2] جامع ترمذی معیشۃ النبیؐ [3] صحیح بخاری کتاب الرقاق [4] ایضاً [5] شمائل [6] ایضاً [7] صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۹۵ مطبوعہ مصر و صحیح بخاری صفحہ ۵۳۵ [8] صحیح مسلم صفحہ ۱۹۳ [9] ایضاً [10] ایضاً

اکثر بھوک کی وجہ سے آواز اس قدر کمزور ہو جاتی تھی کہ صحابہ آپ کی حالت سمجھ جاتے تھے۔ ایک دن ابوطلحہؓ گھر میں آئے اور بیوی سے کہا کہ کچھ کھانے کو ہے، میں نے ابھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ اُن کی آواز کمزور ہو گئی ہے۔[1]

ایک دن بھوک میں ٹھیک دوپہر کے وقت گھر سے نکلے، راہ میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ دونوں ملے، یہ دونوں صاحب بھی بھوک سے بے تاب تھے، آپ سب کو لے کر حضرت ابوایوب انصاریؓ کے گھر آئے ان کا معمول تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دودھ مہیا رکھتے تھے، آج آپ کے آنے میں دیر ہوئی تو انھوں نے بچوں کو کھلا دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے گھر پہنچے تو وہ نخلستان میں چلے گئے تھے، ان کی بیوی کو خبر ہوئی تو باہر نکل آئیں اور عرض کی حضورؐ کا آنا مبارک: آپ نے پوچھا ابوایوب کہاں ہیں؟ نخلستان پاس ہی تھا، وہ آواز سُن کر دوڑے آئے اور مرحبا کہہ کر عرض کی، یہ حضورؐ کے آنے کا وقت نہیں، آپ نے حالت بیان کی، وہ نخلستان میں جاکر کھجوروں کا ایک خوشہ توڑ لائے اور کہا میں گوشت تیار کراتا ہوں، ایک بکری ذبح کی، آدھے کا سالن، آدھے کے کباب تیار کرائے، کھانا سامنے لاکر رکھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روٹی پر تھوڑا سا گوشت رکھ کر فرمایا کہ فاطمہؓ کو بھجوا دو، کئی دن سے اس کو کھانا نصیب نہیں ہوا ہے، پھر خود صحابہ کے ساتھ مل کر کھانا نوش فرمایا، متعدد قسم کے کھانے دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور فرمایا کہ خدا نے جو کہا ہے کہ قیامت میں نعیم سے سوال ہوگا وہ یہی چیزیں ہیں۔[2]

اکثر ایسا ہوتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صبح کو ازواجِ مطہراتؓ کے پاس تشریف لاتے اور پوچھتے کہ آج کچھ کھانے کو ہے؟ عرض کرتی نہیں، آپ فرماتے کہ اچھا میں نے روزہ رکھ لیا۔[3]

عفو و حلم

اربابِ سیر نے تصریح کی ہے کہ تمام واقعات شاہد ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا، صحیحین میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی سے اپنے ذاتی معاملہ میں انتقام نہیں لیا، بجز اس صورت کے اس نے احکام الٰہی کی تفضیح کی ہو۔[4]

جنگِ اُحد کی شکست سے زیادہ رؤسائے طائف کے تحقیر آمیز برتاؤ کی یاد خاطرِ اقدس پر گراں تھی،[5] تاہم دس برس کے بعد غزوۂ طائف میں جب ایک منجنیق سے مسلمانوں پر پتھر برساتے تھے تو دوسری طرف ایک سراپائے حلم و عفو انسان (خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) یہ دُعا مانگ رہا تھا کہ خدایا انہیں سمجھ عطا کر اور ان کو آستانۂ اسلام پر جھکا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ۹ھ میں جب ان کے وفد نے مدینہ کا رُخ کیا تو آپ نے ان کو صحنِ مسجد میں مہمان اتارا اور عزت اور حرمت کے ساتھ ان سے پیش آئے۔[6]

قریش نے آپ کو گالیاں دیں، مارنے کی دھمکی دی، راستوں میں کانٹے بچھائے، جسم اقدس پر نجاستیں ڈالیں گلے میں پھندا ڈال کر کھینچا، آپ کی شان میں گستاخیاں کیں، نعوذ باللہ کبھی جادوگر، کبھی پاگل، کبھی شاعر کہا، لیکن

[1] صحیح مسلم صفحہ ۱۹۱ [2] ترغیب و ترہیب ج ۲ صفحہ ۱۰۵ یہ واقعہ صحیح مسلم ج ۲ صفحہ ۱۵۰ میں بھی جزئی اختلافات کے ساتھ موجود ہے۔ [3] مسند احمد بن حنبل ج ۶ صفحہ ۴۹ [4] صحیح بخاری ج ۴ صفحہ ۱۰۹ کتاب الادب [5] صحیح بخاری بدء الخلق [6] ابوداؤد ذکر طائف و مسند ابن حنبل ج ۴ صفحہ ۲۱۸

آپ نے کبھی ان باتوں پر برہمی ظاہر نہیں فرمائی، غریب سے غریب آدمی بھی جب کسی مجمع میں جھٹلایا جاتا ہے تو وہ غصہ سے کانپ اٹھتا ہے، ایک صاحب جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ذی المجاز کے بازار میں اسلام کی دعوت دیتے ہوئے دیکھا تھا بیان کرتے ہیں کہ حضورؐ فرما رہے تھے کہ لوگو لا الٰہ الا اللہ کہو تو نجات پاؤ گے پیچھے پیچھے ابوجہل تھا، وہ آپ پر خاک اڑا اڑا کر کہہ رہا تھا، لوگو اس شخص کی باتیں تم کو اپنے مذہب سے برگشتہ نہ کر دیں، یہ، یہ چاہتا ہے کہ تم اپنے دیوتاؤں لات و عزیٰ کو چھوڑ دو۔ راوی کہتا ہے کہ آپ اس حالت میں اس کی طرف مڑ کر دیکھتے بھی نہ تھے (مسند احمد جلد ۴ ص ۶۳)

سب سے بڑھ کر طیش اور غضب کا موقع افک کا واقعہ تھا، جبکہ منافقین نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کو نعوذ باللہ تہمت لگائی تھی، حضرت عائشہؓ آپ کی محبوب ترین ازواج اور ابوبکرؓ جیسے یارِ غار اور افضل الصحابہ کی صاحبزادی تھیں، شہر منافقوں سے بھرا پڑا تھا جنھوں نے دم بھر میں اس خبر کو اس طرح پھیلا دیا کہ سارا مدینہ گونج اٹھا، دشمنوں کی شماتت، ناموس کی بدنامی، محبوب کی تفضیح، یہ باتیں انسانی صبر و تحمل کے پیمانہ میں نہیں سما سکتیں، تاہم رحمت عالم نے ان سب باتوں کے ساتھ کیا کیا؟ تہمت کا تمام تر بانی رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی تھا اور آپ کو اس کا بخوبی علم تھا، بایں ہمہ آپ نے صرف اس قدر کیا کہ مجمع عام میں منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا، مسلمانو! جو شخص میرے ناموس کے متعلق مجھ کو ستاتا ہے اس سے میری داد کون لے سکتا ہے؟ حضرت سعدؓ بن معاذ غصہ سے بے تاب ہو گئے اور اٹھ کر کہا میں اس خدمت کے لئے حاضر ہوں، آپ نام بتائیں تو اس کا سر اڑا دوں، سعدؓ بن عبادہ نے جو عبداللہ بن ابی کے حلیف تھے، مخالفت کی اور اس پر دونوں طرف سے حمایتی کھڑے ہو گئے، قریب تھا کہ تلواریں کھنچ جائیں، آپ نے دونوں کو ٹھنڈا کیا، واقعہ کی تکذیب خود خدا نے کر دی اور تہمت لگانے والوں کو شرعی سزا دی گئی، تاہم عبداللہ بن ابی اس بنا پر چھوڑ دیا گیا کہ اس کو تہمت لگانے کا اقرار نہ تھا اور ثبوت کے لئے شرعی شہادت موجود نہ تھی، تہمت لگانے والوں میں جن کو سزا دی گئی، ایک صاحب مسطح بن اثاثہ تھے، ان کی معاش کے کفیل حضرت ابوبکرؓ تھے۔ تہمت لگانے کے جرم میں حضرت ابوبکرؓ نے ان کا روزینہ بند کر دیا، اس پر یہ آیت اُتری۔

وَلَا يَأْتَلِ أُولُو الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (نور)	تم میں سے جو لوگ صاحبِ فضیلت اور ذی مقدور ہیں ان کو یہ قسم نہیں کھانا چاہئے کہ قرابتداروں اور مسکینوں اور مجاہدوں سے سلوک نہ کریں گے تم کو عفو اور درگزر سے کام لینا چاہیئے کیا تم نہیں چاہتے کہ خدا تم کو بخش دے، خدا غفور رحیم ہے۔

اور حضرت ابوبکرؓ نے ان کا روزینہ بدستور جاری کر دیا۔

تہمت لگانے والوں میں (جیسا کہ صحیح ترمذی کتاب التفسیر سورۂ نور میں تصریح ہے) حضرت حسانؓ بھی تھے حضرت عائشہؓ کو ان سے جو رنج تھا وہ عفو کی حد سے متجاوز تھا، لیکن یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت کا اثر تھا کہ جب عروہ بن زبیر نے حضرت عائشہؓ کے سامنے حضرت حسانؓ کو برا کہنا شروع کیا تو حضرت عائشہؓ نے روک

دیا کہ یہ (حسانؓ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کفار کو جواب دیتے تھے۔[1]

مدینہ کے منافق یہودیوں میں سے لبید بن اعصم نے آپؐ پر سحر کیا، تاہم آپؐ نے کچھ تعارض نہ فرمایا، (حضرت عائشہؓ نے مزید تحقیق کی تحریک کی تو فرمایا، میں لوگوں میں شورش نہیں پیدا کرنا چاہتا۔[2])

زید بن سعنہ جس زمانہ میں یہودی تھے، لین دین کا کاروبار کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کچھ قرض لیا، میعادِ ادا میں ابھی کچھ دن باقی تھے، تقاضے کو آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر پکڑ کر کھینچی اور سخت سست کہہ کر کہا، عبدالمطلب کے خاندان والو! تم ہمیشہ یونہی حیلے حوالے کیا کرتے ہو، حضرت عمرؓ غصہ سے بے تاب ہو گئے، اس کی طرف مخاطب ہو کر کہا او دشمنِ خدا تو رسول اللہ کی شان میں گستاخی کرتا ہے، آنحضرتؐ نے مسکرا کر فرمایا، عمر! تم سے کچھ اور امید تھی اس کو سمجھانا چاہیے تھا کہ نرمی سے تقاضا کرے اور مجھ سے یہ کہنا چاہیے کہ میں اس کا قرض ادا کر دوں۔ یہ فرما کر حضرت عمرؓ کو ارشاد فرمایا کہ قرضہ ادا کر کے بیس صاع کھجور کے اور زیادہ دے دو۔[3]

ایک دفعہ آپؐ کے پاس صرف ایک جوڑا کپڑا رہ گیا تھا اور وہ بھی موٹا اور گندہ تھا، پسینہ آتا تو اور بھی بوجھل ہو جاتا، اتفاق سے ایک یہودی کے یہاں شام سے کپڑے آئے۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کی کہ ایک جوڑا اس سے قرض منگوا لیجیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی کے پاس آدمی بھیجا، اس گستاخ نے کہا میں سمجھا مطلب یہ ہے کہ میرا مال یونہی اڑا لیں اور دام نہ دیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ناگوار جملے سن کر صرف اس قدر فرمایا کہ وہ خوب جانتا ہے کہ میں سب سے زیادہ محتاط اور سب سے زیادہ امانت کا ادا کرنے والا ہوں۔[4]

ایک دفعہ کہیں تشریف لے جا رہے تھے، ایک عورت قبر کے پاس بیٹھی رو رہی تھی، آپؐ رک گئے اور اس سے مخاطب ہو کر فرمایا "صبر کرو"۔ وہ آپؐ کو پہچانتی نہ تھی (گستاخی کے ساتھ بولی) ہٹو تم کیا جان سکتے ہو کہ مجھ پر کیا کیفیت ہے؟ آپؐ چلے آئے، لوگوں نے عورت سے کہا تو نے نہیں پہچانا، وہ رسول اللہ تھے، دوڑی ہوئی آئی اور کہا میں حضور کو پہچانتی نہ تھی، ارشاد فرمایا، صبر وہی معتبر ہے جو عین مصیبت کے وقت کیا جائے۔[5]

ایک دفعہ حضرت سعد بن عبادہؓ بیمار ہوئے، آپؐ عیادت کو سواری پر تشریف لے گئے راہ میں ایک جلسہ تھا، آپؐ ٹھہر گئے، عبداللہ بن ابی جو رئیس المنافقین تھا، وہ بھی جلسہ میں موجود تھا، آپؐ کی سواری کی گرد اڑی تو اس نے چادر ناک پر رکھ لی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا دیکھو گرد نہ اڑاؤ۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قریب پہنچے تو اس نے کہا محمدؐ اپنا گدھا ہٹاؤ، تمہارے گدھے کی بدبو نے میرا دماغ پریشان کر دیا، آنحضرتؐ نے سلام کیا، پھر سواری سے اترے اور اسلام کی دعوت دی، عبداللہ ابن ابی نے کہا، ہمارے گھر اگر ہم کو نہ ستاؤ جو شخص خود تمہارے پاس آئے اس کو تعلیم دو۔ عبداللہؓ بن رواحہ جو مشہور شاعر تھے، انہوں نے کہا۔ آپؐ ضرور تشریف لائیے، بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچی کہ قریب تھا تلواریں نکل آئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں فریق کو

[1] صحیح بخاری قصہ افک [2] صحیح بخاری صفحہ ۹۰۲ [3] یہ روایت بیہقی، ابن حبان، طبرانی اور ابو نعیم نے روایت کی ہے اور سیوطی نے کہا کہ اس کی سند صحیح ہے (از شرح شفا مصنفہ شہاب خفاجی) [4] جامع ترمذی کتاب البیوع [5] بخاری کتاب الجنائز۔

سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا۔ جلسہ سے اٹھ کر آپؐ سعدؓ بن عبادہ کے پاس آئے اور ان سے کہا، تم نے عبداللہ کی باتیں سنیں، سعدؓ بن عبادہ نے عرض کی کہ آپؐ کچھ خیال نہ فرمائیں، یہ وہ شخص ہے کہ آپؐ کی تشریف آوری سے پہلے اہل مدینہ نے اس کے لئے ریاست کا تاج تیار کر لیا تھا۔[1]

غزوۂ حنین میں آپؐ نے مالِ غنیمت تقسیم فرمایا تو ایک انصاری نے کہا، یہ تقسیم خدا کی رضامندی کے لئے نہیں ہے۔ آپؐ نے سنا تو فرمایا، خدا موسیٰؑ پر رحم کرے ان کو لوگوں نے اس سے بھی زیادہ ستایا تھا۔[2]

ایک دفعہ ایک بدو خدمتِ اقدس میں آیا، آپؐ مسجد میں تشریف رکھتے تھے، اس کو پیشاب کی حاجت معلوم ہوئی، آدابِ مسجد سے واقف نہ تھا، وہیں کھڑے ہو کر پیشاب کرنے لگا، لوگ ہر طرف سے دوڑ پڑے کہ اس کو سزا دیں۔ آپؐ نے فرمایا، جانے دو اور پانی کا ایک ڈول لا کر بہا دو، خدا نے تم لوگوں کو دشواری کے لئے نہیں بلکہ آسانی کے لئے بھیجا ہے۔[3]

حضرت انسؓ جو خادمِ خاص تھے ان کا بیان ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو کسی کام کیلئے بھیجنا چاہا میں نے کہا نہ جاؤں گا، آپؐ چپ رہ گئے میں یہ کہہ کر باہر چلا گیا۔ دفعۃً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیچھے سے آکر میری گردن پکڑ لی، میں نے مڑ کر دیکھا تو آپؐ ہنس رہے ہیں، پھر پیار سے فرمایا "انس! جس کام کے لئے کہا تھا، اب تو جاؤ" میں نے عرض کی اچھا جاتا ہوں، انسؓ نے اسی واقعہ کے ساتھ بیان کیا کہ میں نے سات برس آپؐ کی ملازمت کی کبھی یہ نہ فرمایا کہ تم نے یہ کام کیوں کیا یا یہ کیوں نہیں کیا۔[4]

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپؐ کی عادت تھی کہ ہم لوگوں کے ساتھ مسجد میں بیٹھ جاتے اور باتیں کرتے جب اٹھ کر گھر میں جاتے تو ہم لوگ بھی چلے جاتے، ایک دن حسبِ معمول مسجد سے نکلے، ایک بدو آیا اور اس نے آپؐ کی چادر اس زور سے پکڑ کر کھینچی کہ آپؐ کی گردن سرخ ہو گئی، آپؐ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا، بولا کہ میرے اونٹوں کو غلہ سے لاد دے، تیرے پاس جو مال ہے وہ نہ تیرا ہے نہ تیرے باپ کا ہے۔ آپؐ نے فرمایا پہلے میری گردن کا بدلہ دو، تب غلہ دیا جائے گا، وہ بار بار کہتا تھا کہ خدا کی قسم! میں ہرگز بدلہ نہ دوں گا۔ آپؐ نے اس کے اونٹوں پر جو اور کھجوریں لدوا دیں[5] اور کچھ تعرض نہ فرمایا۔

قریش (نعوذ باللہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیتے تھے، برا بھلا کہتے تھے۔ ضد سے آپؐ کو محمد (تعریف کیا گیا) نہیں کہتے تھے بلکہ مذمم (مذمت کیا گیا) کہتے تھے، لیکن آپؐ اس کے جواب میں اپنے دوستوں کو خطاب کر کے صرف اسی قدر فرمایا کرتے کہ تمہیں تعجب نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ قریش کی گالیوں کو مجھ سے کیونکر پھیرتا ہے وہ مذمم کو گالیاں دیتے ہیں اور مذمم پر لعنت بھیجتے ہیں اور میں محمد ہوں۔[6]

جس زمانہ میں آپؐ فتح مکہ کے لئے تیاریاں کر رہے تھے، اس بات کی خاص احتیاط فرما رہے تھے کہ قریش کو ہمارے ارادوں کی خبر نہ ہو، حاطب بن بلتعہ ایک صحابی تھے، انہوں نے چاہا کہ قریش کو اس کی اطلاع

[1] صحیح بخاری، ج ۲ ص ۸۴۶ [2] ایضاً غزوۂ حنین ص ۶۲۰ [3] ایضاً ص ۳۵ [4] صحیح مسلم و ابو داؤد کتاب الادب [5] ابو داؤد کتاب الادب یہی واقعہ حضرت انسؓ سے بخاری و مسلم میں مروی ہے بتغیر یسیر [6] مشکوٰۃ باب اسماء النبیؐ۔

کردیں، چنانچہ ایک خط لکھ کر انہوں نے چپکے سے ایک عورت کی معرفت مکہ روانہ کیا، آپؐ کو اس کی خبر ہوگئی، حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ اسی وقت بھیجے گئے جو قاصد کو مع خط کے گرفتار کر لاتے، حاطب کو بُلا کر دریافت کیا تو انھوں نے صاف صاف اپنے قصور کا اعتراف کیا اور معذرت چاہی، یہ موقع تھا کہ ہر سیاست دان مجرم کی سزا کا فتویٰ دیتا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لئے ان کو معاف فرمایا کہ وہ شرکائے بدر میں تھے، عورت جو اس جرم میں شریک تھی اس سے بھی کسی قسم کا تعرض نہیں فرمایا[1]۔ حالانکہ یہ خط اگر دشمنوں تک پہنچ جاتا تو مسلمانوں کو سخت خطرات کا سامنا ہو جاتا۔

فرات بن حیان ایک شخص تھا، ابوسفیان کی طرف سے مسلمانوں کی جاسوسی پر مامور تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں اشعار کہا کرتا تھا، ایک دفعہ وہ پکڑا گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قتل کا حکم دیا، لوگ اس کو پکڑ کر لے چلے، جب انصار کے ایک محلہ میں پہنچا تو بولا کہ میں مسلمان ہوں، ایک انصاری نے آکر اطلاع دی کہ وہ کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں، آپؐ نے فرمایا کہ تم میں کچھ لوگ ایسے ہیں جن کے ایمان کا حال ہم انہی پر چھوڑتے ہیں ان میں سے ایک فرات بن حیان ہے[2]، مورخین نے لکھا ہے کہ وہ بعد کو صدق دل سے مسلمان ہوگئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یمامہ میں ایک زمین عنایت فرمائی جس کی آمدنی ۴۲۰۰ تھی[3]۔

دشمنوں سے عفو و درگزر اور حسن سلوک

انسان کے ذخیرۂ اخلاق میں سب سے زیادہ کم یاب، نادر الوجود چیز دشمنوں پر رحم اور ان سے عفو و درگزر ہے، لیکن حامل وحی و نبوت کی ذاتِ اقدس میں یہ جنس فراواں تھی، دشمن سے انتقام لینا انسان کا قانونی فرض ہے، لیکن اخلاق کے دائرہ شریعت میں آکر یہ فرضیت مکروہ تحریمی بن جاتی ہے تمام روایتیں اس بات پر متفق ہیں کہ آپؐ نے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا۔

دشمنوں سے انتقام کا سب سے بڑا موقع فتحِ حرم کا دن تھا جب کہ وہ کینہ خواہ سامنے آئے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خون کے پیاسے تھے اور جن کے دستِ ستم سے آپؐ نے طرح طرح کی اذیتیں اٹھائی تھیں لیکن ان سب کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا۔

لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقاء — تم پر کوئی ملامت نہیں جاؤ تم سب آزاد ہو۔

وحشی جو اسلام کے قوتِ بازو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عزیز ترین چچا حضرت حمزہؓ کا قاتل تھا مکہ میں رہتا تھا، جب مکہ میں اسلام کی قوت نے ظہور کیا وہ بھاگ کر طائف آیا، طائف نے بھی آخر سر اطاعت خم کیا، اور وحشی کے لئے یہ بھی مامن نہ رہا، لیکن اس نے سُنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سفراء سے کبھی سختی کے ساتھ پیش نہیں آتے، ناچار خود رحمتِ عالم کے دامن میں پناہ لی اور اسلام قبول کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اس قدر فرمایا کہ میرے سامنے نہ آیا کرنا کہ تم کو دیکھ کر مجھے چچا کی یاد آتی ہے[4]۔

[1] صحیح بخاری فتح مکہ [2] ابوداؤد کتاب الجہاد باب الجاسوس الذمی، یہ حدیث سفیان ثوریؒ کے واسطہ سے دو طریقوں سے مروی ہے ایک میں ابوہمام الدلال ہے اور یہی ابوداؤد کا طریق ہے، یہ طریق ضعیف ہے، دوسرا طریق بشر بن سری البصری کے ذریعہ سے ہے جو صحیح ہے امام احمد نے بھی مسند میں یہ روایت نقل کی ہے [3] اصابہ ترجمہ فرات مذکور [4] صحیح بخاری قتل حمزہ۔

ہند ابوسفیان کی بیوی جس نے حضرت حمزہؓ کا سینہ چاک کیا اور دل و جگر کے ٹکڑے کئے، فتح مکہ کے دن نقاب پوش آئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہچان نہ سکیں اور بے خبری میں بیعت اسلام کرکے سند امان حاصل کرے پھر اس موقع پر بھی گستاخی سے باز نہ آئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہند کو پہچان لیا لیکن اس واقعہ کا ذکر تک نہ فرمایا، ہند اس کرشمۂ اعجاز سے متاثر ہوکر بے اختیار بول اٹھی، یا رسول اللہ! آپؐ کے خیمہ سے مبغوض تر خیمہ میری نگاہ میں نہ تھا، لیکن آج آپؐ کے خیمہ سے کوئی محبوب خیمہ میری نگاہ میں دوسرا نہیں[1]۔

عکرمہ، دشمن اسلام ابوجہل کے فرزند تھے اور اسلام سے پہلے باپ کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت ترین دشمن تھے، فتح مکہ کے وقت بھاگ کر یمن چلے گئے، ان کی بیوی مسلمان ہو چکی تھی، وہ یمن گئیں اور عکرمہ کو تسکین دی اور ان کو مسلمان کیا اور خدمتِ اقدس میں لے کر حاضر ہوئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کو دیکھا تو فرطِ مسرت سے فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے اور اس تیزی سے ان کی طرف بڑھے کہ جسم مبارک پر چادر تک نہ تھی[2] اور زبانِ مبارک پر یہ الفاظ تھے۔

مرحبا یا الراکب المہاجر[3]۔ — اے ہجرت کرنے والے سوار تمہارا آنا مبارک ہو۔

صفوان بن امیہ قریش کے رؤسائے کفر میں سے اور اسلام کے شدید ترین دشمن تھے، ان ہی نے عمیر بن وہب کو انعام کے وعدہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل پر مامور کیا تھا، جب مکہ فتح ہوا تو اسلام کے ڈر سے جدہ بھاگ گئے اور قصد کیا کہ سمندر کے راستہ سے یمن چلے جائیں، عمیر بن وہب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کی کہ یا رسول اللہ! صفوان ابن امیہ اپنے قبیلہ کے رئیس ہیں وہ ڈر سے بھاگ گئے ہیں کہ اپنے کو سمندر میں ڈال دیں، ارشاد ہوا کہ اس کو امان ہے، مکرر عرض کی یا رسول اللہ! امان کی کوئی نشانی مرحمت فرمایئے جس کو دیکھ کر ان کو میرا اعتبار آئے۔ آپؐ نے عمامہ مبارک ان کو عنایت فرمایا جس کو لے کر وہ صفوان کے پاس پہنچے صفوان نے کہا مجھے وہاں جانے میں اپنی جان کا ڈر ہے، عمیر نے جواب دیا، صفوان! ابھی تمہیں محمدؐ کے حلم و عفو کا حال معلوم نہیں، یہ سُن کر وہ عمیر کے ساتھ دربارِ نبویؐ میں حاضر ہوئے اور سب سے پہلا سوال یہ کیا کہ عمیر کہتے ہیں کہ تم نے مجھے امان دیا ہے؟ فرمایا سچ ہے، صفوان نے کہا تو مجھے دو مہینے کی مہلت دو۔ ارشاد ہوا کہ دو نہیں تم کو چار مہینے کی مہلت دی جاتی ہے، اس کے بعد وہ اپنی خوشی سے مسلمان ہوگئے، یہ واقعہ بتفصیل ابن ہشام میں مذکور ہے۔

ہبار بن الاسود وہ شخص تھا جس کے ہاتھ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی زینبؓ کو سخت تکلیف پہنچی تھی، حضرت زینبؓ حاملہ تھیں اور مکہ سے مدینہ ہجرت کر رہی تھیں، کفار نے مزاحمت کی، ہبار بن الاسود نے جان بوجھ کر ان کو اونٹ سے گرا دیا جس سے ان کو سخت چوٹ آئی اور حمل ساقط ہوگیا، اس کے علاوہ اور بھی بعض جرائم کا وہ مرتکب ہوا تھا اور اسی بنا پر فتح مکہ کے وقت ہبار اشتہاریانِ قتل میں داخل تھا، چاہا کہ بھاگ کر ایران چلا جائے کہ داعئ ہدایت نے خود آستانۂ نبوت کی طرف جھکا دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کی یا رسول اللہ! میں بھاگ کر ایران چلا جانا چاہتا تھا لیکن پھر مجھے حضورؐ کے احسانات اور حلم و عفو یاد آئے، میری نسبت

[1] صحیح بخاری ذکر ہند [2] موطا امام مالک کتاب النکاح [3] مشکوٰۃ کتاب الادب بحوالہ ترمذی۔

آپ کو جو خبریں پہنچی تھیں وہ صحیح تھیں، مجھے اپنی جہالت اور قصور کا اعتراف ہے، اب اسلام سے مشرف ہونے آیا ہوں، اُدھر یہ باب رحمت وا تھا اور دوست و دشمن کی تمیز یکسر مفقود تھی۔[1]

ابوسفیان اسلام سے پہلے جیسے کچھ تھے، غزوات نبوی کا ایک ایک حرف اس کا شاہد ہے، بدر سے لیکر فتح مکہ تک جتنی لڑائیاں اسلام کو لڑنی پڑیں ان میں سے اکثر میں ان کا ہاتھ تھا، لیکن فتح مکہ کے موقع پر جب وہ گرفتار کر کے لائے گئے اور حضرت عباسؓ اُن کو لے کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو آپؐ ان کے ساتھ محبت سے پیش آئے، حضرت عمرؓ نے گزشتہ جرائم کی پاداش میں ان کے قتل کا ارادہ کیا، لیکن آپؐ نے منع فرمایا، اور نہ صرف یہ بلکہ ان کے گھر کو امن و امان کا حرم بنا دیا، فرمایا کہ جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا اس کا قصور معاف ہوگا، کیا دنیا کے کسی فاتح نے اپنے دشمن کے ساتھ یہ برتاؤ کیا ہے؟[2]

عرب کا ایک ایک قبیلہ اطاعت کیشانہ اسلام کے پرچم کے نیچے جمع ہو رہا تھا، اگر کسی قبیلہ نے آخر تک سرتابی کی تو وہ بنو حنیفہ کا قبیلہ تھا جس میں مسیلمہ نے ادعائے نبوت کیا تھا، ثمامہ ابن آثال اس قبیلہ کے رؤسا میں تھا اتفاق سے وہ مسلمانوں کے ہاتھ لگ گیا، گرفتار کر کے مدینہ لے آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اس کو مسجد کے ستون میں باندھ دیا جائے، اس کے بعد آپؐ مسجد میں تشریف لائے اور اس سے دریافت کیا کہ کیا کہتے ہو؟ اس نے کہا اے محمدؐ! اگر تم مجھے قتل کرو گے تو ایک خونی کو کرو گے اور اگر احسان کرو گے تو ایک شکر گزار پر احسان ہوگا اور اگر زر فدیہ چاہتے ہو تو تم مانگو میں دوں گا، یہ سن کر آپؐ خاموش رہے، دوسرے دن بھی یہی تقریر ہوئی، تیسرے دن بھی جب اس نے یہی جواب دیا تو آپؐ نے حکم دیا کہ ثمامہ کی رسی کھول دو اور آزاد کر دو، ثمامہ پر اس خلاف توقع لطف و عنایت کا یہ اثر ہوا کہ قریب ایک درخت کی آڑ میں جا کر غسل کیا اور مسجد میں واپس آکر کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا اور عرض کی یا رسول اللہ! دنیا میں کوئی شخص میری نظر میں آپؐ سے زیادہ مبغوض نہ تھا اور اب آپؐ سے زیادہ دنیا میں مجھے کوئی محبوب نہیں، کوئی مذہب آپؐ کے مذہب سے زیادہ میری آنکھوں میں برا نہ تھا اور اب وہی سب سے زیادہ پیارا ہے، کوئی شہر آپؐ کے شہر سے زیادہ ناپسند نہ تھا اور اب وہی پسندیدہ ہے،

قریش کی ستمگری و جفاگری کی داستان دہرانے کی ضرورت نہیں، یاد ہوگا کہ شعب ابی طالب میں تین برس تک ان ظالموں نے آپؐ کو اور آپؐ کے خاندان کو اس طرح محصور کر رکھا تھا کہ غلہ کا ایک دانہ اندر پہنچ نہیں سکتا تھا بچے بھوک سے روتے اور تڑپتے تھے اور یہ بے درد ان کی آوازیں سن کر ہنستے اور خوش ہوتے تھے، لیکن معلوم ہے کہ رحمت عالمؐ نے اس کے معاوضہ میں قریش کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ مکہ میں غلہ یمامہ سے آتا تھا یمامہ کے رئیس یہی ثمامہ بن آثال تھے، مسلمان ہو کر جب یہ مکہ گئے تو قریش نے تبدیل مذہب پر اُن کو طعنہ دیا، انہوں نے غصہ سے کہا کہ خدا کی قسم! اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر گیہوں کا ایک دانہ نہیں ملے گا اس بندش سے مکہ میں اناج کا کال پڑ گیا، آخر گھبرا کر قریش نے اس آستانہ کی طرف رجوع کیا جس سے کوئی سائل کبھی

[1] ابن اسحاق و اصابہ ذکر ہبار۔ [2] صحیح بخاری و صحیح مسلم فتح مکہ مع فتح الباری۔

محروم نہیں گیا، حضورؐ کو رحم آیا اور کہلا بھیجا کہ بندش اٹھا لو، پھر حسب دستور غلہ جانے لگا۔[1]

کفار اور مشرکین کے ساتھ برتاؤ

کفار کے ساتھ آپؐ کے حسن سلوک کے بہت سے واقعات مذکور ہیں، مؤرخین یورپ مدعی ہیں کہ یہ اس وقت تک کے واقعات ہیں جب تک اسلام ضعیف تھا اور مجاملت اور لطف و آشتی کے سوا چارہ نہ تھا، اس لئے ہم اس عنوان کے نیچے صرف وہ واقعات نقل کریں گے جو اس زمانہ کے ہیں جب کہ مخالفین کی قوتیں پامال ہو چکی تھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پورا اقتدار حاصل ہو چکا تھا،

ابوبصرہ غفاری کا بیان ہے کہ جب وہ کافر تھے، مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر مہمان رہے، رات کو گھر کی تمام بکریوں کا دودھ پی گئے، لیکن آپؐ نے کچھ نہ فرمایا، رات بھر تمام اہل بیت نبویؐ بھوکا رہا،[2] اسی طرح ایک اور واقعہ حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں، شب کو ایک کافر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مہمان ہوا، آپؐ نے ایک بکری کا دودھ اس کے سامنے پیش کیا وہ پی گیا، پھر دوسری بکری دوہی گئی، وہ دودھ بھی بے تامل پی گیا پھر تیسری، پھر چوتھی، یہاں تک کہ سات بکریاں دوہی گئیں اور وہ دودھ سب پیتا گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی تنفص ظاہر نہ فرمایا، شاید اسی حسن اخلاق کا اثر تھا کہ وہ صبح کو مسلمان تھا اور صرف ایک بکری کے دودھ پر قانع ہو گیا۔[3]

حضرت اسماءؓ بیان کرتی ہیں کہ صلح حدیبیہ کے زمانہ میں ان کی ماں جو مشرکہ تھیں، اعانت خواہ مدینہ حضرت اسماءؓ کے پاس آئیں، ان کو خیال ہوا کہ اہل شرک کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر دریافت کیا، آپؐ نے فرمایا اُن کے ساتھ نیکی کرو،[4] حضرت ابوہریرہؓ کی ماں کافرہ تھیں اور بیٹے کے ساتھ مدینہ میں رہتی تھیں، جہالت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیتی تھیں، ابوہریرہؓ نے خدمت اقدس میں عرض کی آپؐ نے بجائے غیظ و غضب کے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔[5]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کا تمام کاروبار حضرت بلالؓ کے سپرد تھا، روپیہ پیسہ جو کچھ آتا تھا ان کے پاس رہتا، ناداری کی حالت میں وہ بازار سے سود اسلف قرض لاتے اور جب کہیں سے کوئی رقم آجاتی تو اس سے ادا کیا کرتے، ایک دفعہ بازار جا رہے تھے، ایک مشرک نے دیکھا، ان سے کہا تم قرض لیتے ہو تو مجھ سے لیا کرو، انہوں نے قبول کیا، ایک دن اذان دینے کے لئے کھڑے ہوئے تو وہ مشرک چند سوداگروں کے ساتھ آیا اور ان سے کہا، او حبشی! انہوں نے اس بدتہذیبی کے جواب میں لبیک کہا، بولا کچھ خبر ہے، وعدہ کے صرف چار دن رہ گئے ہیں، تم نے اس مدت میں قرضہ ادا نہ کیا تو تم سے بکریاں چرواکے چھوڑ دوں گا، یہ عشاء پڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور سارا حال بیان کر کے کہا کہ خزانہ میں کچھ نہیں ہے، کل وہ مشرک اگر مجھ کو فضیحت کرے گا، اس لئے مجھ کو اجازت ہو کہ میں کہیں نکل جاؤں، پھر جب قرضہ ادا کرنے کا سامان ہو جائے گا تو واپس آجاؤں گا، غرض رات کو جا کر سو رہے اور سامان سفر یعنی تھیلا، جوتی، ڈھال سر کے نیچے

[1] ثمامہ کا پورا واقعہ صحیح بخاری میں ص ۶۲۷ باب وفد بنی حنیفہ میں ہے، آخری ٹکڑا ابن ہشام میں مذکور ہے۔ [2] مسند ابن حنبل ۶ صفحہ ۳۹۷ [3] جامع ترمذی باب ان المومن یاکل فی معیً واحد۔ [4] صحیح بخاری باب صلۃ الوالد المشرک [5] صحیح بخاری۔

رکھ لی، صبح اٹھ کر سفر کا سامان کر رہے تھے کہ ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور کہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یاد فرمایا ہے، یہ گئے تو دیکھا کہ چار اونٹ غلّے سے لدے ہوئے دروازہ پر کھڑے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مبارک ہو یہ اونٹ رئیس فدک نے بھیجے ہیں، انہوں نے بازار میں جا کر سب چیزیں فروخت کیں اور مشرک کا قرضہ ادا کر کے مسجد نبوی میں آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ سارا قرضہ ادا ہو گیا۔[1]

یہ واقعہ فدک کی فتح کے بعد کا ہے جو ہجرت کا ساتواں سال ہے، حضرت بلالؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرب خاص اور گھر کے منتظم تھے، ایک مشرک ان کو حبشی کہہ کر پکارتا ہے اور کہتا ہے کہ تجھ سے بکریاں چروا کے چھوڑوں گا، حضرت بلالؓ اس کی تنگ گیری کے ڈر سے بھاگ جانے کا ارادہ کرتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ باتیں سنتے ہیں، لیکن مشرک کی نسبت ایک لفظ نہیں فرماتے، نہ بلالؓ کی حمایت اور دلدہی کی تدبیر کرتے، اتفاق سے غلہ آجاتا ہے اور مشرک کا قرضہ ادا کیا جاتا ہے اور اس کی بدزبانی اور سخت گیری سے درگزر کیا جاتا ہے، یہ حلم، یہ عفو، یہ تحمل رحمت عالمؐ کے سوا کس سے ہو سکتا ہے؟

سب سے مشکل معاملہ منافقین کا تھا، یہ کفار کا ایک گروہ تھا جس کا رئیس عبداللہ بن ابی تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس زمانہ میں مدینہ میں تشریف لائے، اس سے کچھ پہلے تمام شہر نے اس پر اتفاق کر لیا تھا کہ وہ مدینہ کا فرماں روا بنا دیا جائے، جنگ بدر کے بعد اس نے اسلام کا اعلان کیا، لیکن دل سے کافر تھا، اس کے پیرو بھی اسی قسم کا منافقانہ اسلام لائے اور منافقین کی ایک مستقل جماعت قائم ہوگئی، یہ لوگ در پردہ اسلام کے خلاف ہر قسم کی تدبیریں کرتے تھے، قریش اور دیگر مخالف قبائل سے سازش رکھتے، ان کو مسلمانوں کے مخفی رازوں کی خبر دیتے رہتے، بایں ہمہ بظاہر اسلام کے مراسم ادا کرتے، جمعہ جماعت میں شریک ہوتے اور لڑائیوں میں ساتھ جاتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے حالات اور ایک ایک کے نام و نشان سے واقف تھے، لیکن چونکہ شریعت اور قانون کے احکام دلوں کے اسرار سے نہیں بلکہ ظاہری اعمال سے متعلق ہیں، اس لئے آپ اُن پر کفر کے احکام جاری نہیں فرماتے تھے، یہاں تک تو شریعت اور قانون کا معاملہ تھا، لیکن فیاض دلی اور عفو و حلم کے اقتضا سے آپ ان سے ہمیشہ حسن اخلاق کا بھی برتاؤ کرتے تھے۔

ایک دفعہ ایک غزوہ میں ایک مہاجر نے ایک انصاری کو تھپڑ مارا، انصاری نے کہا یا للانصار (یعنی انصار کی دہائی) مہاجر نے بھی مہاجر کی دہائی دی، قریب تھا کہ دونوں میں تلوار چل جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یہ کیا جاہلیت کی باتیں ہیں۔ دونوں رُک گئے۔ عبداللہ بن ابی نے سُنا تو کہا۔ مدینہ چل کر ذلیل مسلمانوں کو نکال دوں گا، ساتھیوں سے کہا آسان بات یہ ہے کہ تم لوگ مہاجرین کی خبر گیری سے ہاتھ اٹھا لو، یہ خود تباہ ہو جائیں گے چنانچہ قرآن مجید میں یہ واقعہ مذکور ہے۔

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا (منافقون)

یہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ پیغمبر کے ساتھیوں پر خرچ نہ کرو تا کہ وہ منتشر ہو جائیں۔

[1] ابوداؤد جلد ۲ باب قبول ہدایا المشرکین۔

يقولون لئن رجعنا الى المدينة ليخرجن الاعز منها الاذل (منافقون)

کہتے ہیں کہ جب ہم مدینہ کو واپس چلیں گے تو معزز لوگ کمینوں کو مدینہ سے نکال دیں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ابی کو بلا بھیجا کہ تم نے یہ الفاظ کہے تھے، اس نے صاف انکار کیا حضرت عمرؓ موجود تھے، بولے یا رسول اللہ! اجازت دیجئے کہ اس منافق کی گردن اڑا دوں، آپ نے فرمایا لوگ چرچا کریں گے کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔[1] جنگ اُحد میں عبداللہ بن ابی عین لڑائی کے پیش آنے کے وقت تین سو آدمیوں کے ساتھ واپس چلا آیا، جس سے مسلمانوں کی قوت کو سخت صدمہ پہنچا تاہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے درگزر فرمایا، اور وہ جب مرا تو اس احسان کے معاوضہ میں کہ حضرت عباسؓ کو اس نے اپنا کرتا دیا تھا، مسلمانوں کی ناراضی کے باوجود آپ نے اپنا قمیص مبارک اس کو پہنا کر دفن کیا۔[2]

یہود و نصارٰی کے ساتھ برتاؤ

خلق عمیم میں کافر و مسلم، دوست و دشمن، عزیز و بیگانہ کی تمیز نہ تھی، ابر رحمت دشت و چمن پر یکساں برستا تھا، یہود کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جس شدت کی عداوت تھی اس کی شہادت غزوۂ خیبر تک کے ایک ایک واقعہ سے ملتی ہے، لیکن آپ کا طرز عمل مدت تک یہ رہا کہ جن امور کی نسبت مستقل حکم نازل نہ ہوتا، آپ ان میں ان ہی کی تقلید فرماتے۔[3]

ایک دفعہ ایک یہودی نے بر سر بازار کہا۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے موسٰیؑ کو تمام انبیاء پر فضیلت دی ایک صحابی یہ کھڑے سُن رہے تھے، ان سے رہا نہ گیا، انھوں نے پوچھا کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی؟ اس نے کہا ہاں۔ انہوں نے غصہ میں ایک تھپڑ اس کے مار دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عدل اور اخلاق پر دشمنوں کو بھی اس درجہ اعتبار تھا کہ وہ یہودی سیدھا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور واقعہ عرض کیا، آپ نے اُن صحابی پر برہمی ظاہر فرمائی۔[4]

ایک یہودی کا لڑکا بیمار ہوا تو آپ اس کی عیادت کو تشریف لے گئے اور اس کو اسلام کی دعوت دی، اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا، گویا باپ کی رضامندی دریافت کی، اس نے کہا کہ آپ جو فرماتے ہیں اس کو بجا لاؤ۔ چنانچہ اس نے کلمہ پڑھا۔[5] ایک دفعہ سر راہ ایک یہودی کا جنازہ گزرا تو آپ کھڑے ہو گئے۔[6]

ایک دفعہ چند یہودی آپ کی خدمت میں آئے اور شرارت سے اسلام علیکم کے بجائے السام علیکم (تم پر موت) کہا، حضرت عائشہؓ نے غصہ میں آکر ان کو بھی سخت جواب دیا، لیکن آپ نے روکا اور فرمایا۔ عائشہ بدزبان نہ ہو، نرمی کرو، اللہ تعالیٰ ہر بات میں نرمی پسند کرتا ہے۔[7]

یہودیوں کے ساتھ داد و ستد کرتے تھے، ان کے سخت و ناجائز تقاضوں اور درشت کلمات کو برداشت کرتے تھے، یہودیوں اور مسلمانوں میں اگر معاملات میں اختلاف پیش آتا تو مسلمانوں کی بلاوجہ جنبہ داری نہ فرماتے اس قسم کی متعدد مثالیں دوسرے عنوانات میں مذکور ہیں۔ ایک دفعہ ایک یہودی نے آکر شکایت کی کہ محمدؐ! دیکھو ایک

[1] صحیح بخاری تفسیر سورہ منافقون [2] بخاری میں یہ واقعہ متعدد روایتوں اور متعدد طریقوں سے منقول ہے [3] صحیح بخاری [4] ایضاً [5] صحیح بخاری کتاب الجنائز [6] ایضاً [7] صحیح مسلم کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۲۳۹ مصر۔

مسلمان نے مجھ کو تھپڑ مارا ہے۔ آپ نے اس مسلمان کو اسی وقت بلوا کر زجر فرمایا۔ نصاریٰ کا وفد جب نجران سے مدینہ حاضر ہوا تو آپ نے اس کی مہمانداری کی، مسجدِ نبویؐ میں ان کو جگہ دی، بلکہ ان کو اپنے طریق پر مسجد میں نماز پڑھنے کی بھی اجازت دے دی اور جب عام مسلمانوں نے ان کو اس کام سے روکنا چاہا تو آپؐ نے منع فرمایا۔[1]

یہود و نصاریٰ کے ساتھ کھانے پینے، نکاح و معاشرت کی اجازت تھی اور ان کے لئے مخصوص امتیازی احکام شریعتِ اسلامیہ میں جاری فرمائے۔

غریبوں کے ساتھ محبت و شفقت

مسلمانوں میں امیر بھی تھے اور غریب بھی، دولت مند بھی اور فاقہ کش بھی لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا برتاؤ سب کے ساتھ یکساں تھا بلکہ غریبوں کے ساتھ آپؐ اس طرح پیش آتے تھے کہ دنیاوی دولت کی محرومی ان کے دلوں کو صدمہ نہیں پہنچاتی تھی۔ ایک دفعہ تقاضائے بشریت سے آپؐ کا ایک فعل اس کے خلاف ہوا تو بارگاہِ احدیت سے اس پر باز پرس ہوئی، مکہ کا واقعہ ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چند اکابرِ قریش بیٹھے تھے اور آپؐ ان کو اسلام کی دعوت دے رہے تھے کہ اتفاق سے عبداللہ بن ام مکتوم جو آنکھوں سے معذور اور غریب تھے، ادھر آنکلے اور وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر آپؐ سے باتیں کرنے لگے، رؤسائے قریش چونکہ سخت متکبر اور مغرور تھے، ان کو یہ برابری ناگوار گزری، آپؐ نے ابن ام مکتوم کی طرف توجہ نہیں فرمائی اور اس امید پر ان ہی سے باتیں کرتے رہے کہ شاید اشقیا اسلام کی سعادت کو قبول کر لیں اور ان کے دل حق کی لذت سے آشنا ہوں، لیکن خدا کو یہ امتیاز پسند نہ آیا اور یہ آیت اتری۔[2]

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى وَهُوَ يَخْشٰى فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ۔

(عبس)

پیغمبر نے ترش روئی کی اور منہ پھیر لیا کہ اس کے پاس اندھا آیا۔ اے پیغمبر، تجھے کیا خبر کہ تیری باتوں سے وہ پاک ہو جاتا یا نصیحت حاصل کرتا تو نصیحت اس کو نفع پہنچاتی لیکن جو بے پروائی برتتا ہے اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور تیرا کیا نقصان ہے اگر وہ پاک و صاف نہ بنے اور تیرے پاس دوڑا آتا ہے اور وہ خدا سے ڈرتا بھی ہے تو تو اس سے بے اعتنائی کرتا ہے نہیں ہرگز نہیں یہ نصیحت عام ہے جو چاہے اس کو قبول کرے۔

یہی غربا اور مفلس اسلام کے سب سے پہلے جان نثار بنے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو لے کر حرم میں نماز پڑھنے جاتے تھے تو رؤسائے قریش ان کی ظاہری بدحیثیتی کو دیکھ کر استہزاء کہتے تھے۔

اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر خدا نے ہم لوگوں کو چھوڑ کر احسان کیا ہے

لیکن آپؐ ان کے اس استہزاء کو خوشی سے برداشت کرتے تھے۔ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے مزاج میں کسی قدر تعلی تھی اور وہ اپنے آپ کو غریبوں سے بالاتر سمجھتے تھے، آپؐ نے ان کی طرف خطاب کر کے فرمایا۔ تم کو جو نصرت اور روزی میسر آتی ہے وہ ان ہی غریبوں کی بدولت آتی ہے۔[3] اسامہ بن زیدؓ سے فرمایا۔ میں نے درِ جنت پر کھڑے ہو کر دیکھا کہ زیادہ تر غریب مفلس ہی لوگ اس میں داخل ہیں۔[4]

---

[1] زاد المعاد [2] ترمذی تفسیر سورۂ عبس [3] مشکوٰۃ باب فضل الفقراء، بروایت صحیح مسلم [4] حوالہ مذکور بروایت بخاری ومسلم۔

عبداللہ بن عمرو بن العاص روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں مسجد نبویؐ میں بیٹھا تھا اور غریب مہاجر لوگ حلقہ باندھے ایک طرف بیٹھے تھے، اس اثنا میں آپؐ تشریف لے آئے اور انہی کے ساتھ مل کر بیٹھ گئے، یہ دیکھ کر میں بھی اپنی جگہ سے اٹھا اور ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا، آپؐ نے فرمایا۔ فقرائے مہاجرین کو بشارت ہو کہ وہ دولتمندوں سے چالیس برس پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ عبداللہ بن عمروؓ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ یہ سن کر ان کے چہرے خوشی سے چمک اٹھے اور مجھے حسرت ہوئی کہ کاش میں بھی ان ہی میں ہوتا۔[1]

ایک دفعہ آپؐ ایک مجلس میں تشریف فرما تھے، اس اثنا میں ایک شخص سامنے سے گزرا، آپؐ نے اپنے پہلو کے ایک آدمی سے دریافت فرمایا کہ اس کی نسبت تمہاری کیا رائے ہے؟ اس نے جواب دیا کہ یہ امراء کے طبقہ میں سے ایک صاحب ہیں۔ خدا کی قسم! یہ اس لائق ہے کہ اگر رشتہ چاہے تو کیا جائے اور اگر کسی کی سفارش کرے تو قبول کی جائے۔ یہ سن کر آپؐ خاموش ہو گئے، کچھ دیر کے بعد ایک اور صاحب اسی راہ سے گزرے آپؐ نے پھر اس سے استفسار فرمایا کہ اس کی نسبت کیا کہتے ہو؟ عرض کی یا رسول اللہ! یہ فقرائے مہاجرین میں سے ہے اور اس لائق ہے کہ اگر رشتہ چاہے تو واپس کر دیا جائے اور سفارش کرے تو رد کر دی جائے اگر کچھ کہنا چاہے تو نہ سنا جائے۔ ارشاد ہوا کہ تمام روئے زمین میں اگر اس امیر جیسے آدمی ہوں تو اس سے یہ ایک غریب بہتر ہے۔[2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر دعا میں فرمایا کرتے تھے۔ خداوندا! مجھے مسکین زندہ رکھ، مسکین اٹھا اور مسکینوں ہی کے ساتھ میرا حشر کر، حضرت عائشہؓ نے دریافت کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کیوں؟ فرمایا۔ اس لئے کہ یہ دولت مندوں سے پہلے جنت میں جائیں گے۔ پھر فرمایا اے عائشہ! کسی مسکین کو اپنے دروازہ سے نامراد نہ پھیرو، گو چھوہارے کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو۔ اے عائشہؓ! غریبوں سے محبت رکھو اور ان کو اپنے سے نزدیک کرو تو خدا بھی تم کو اپنے سے نزدیک کرے گا۔[3]

ایک دفعہ چند غریب مسلمانوں نے آ کر خدمتِ اقدس میں عرض کی کہ یا رسول اللہ! امراء ہم سے درجۂ اخروی میں بھی بڑھتے جاتے ہیں، نماز، روزہ جس طرح ہم کرتے ہیں، وہ بھی کرتے ہیں، لیکن صدقات و خیرات سے جو نیکیاں ان کو ملتی ہیں ان سے ہم محروم ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کیا میں تم کو وہ بات نہ بتاؤں جس سے تم اگلوں کے برابر ہو جاؤ اور پچھلوں سے بڑھ جاؤ اور پھر کوئی تمہاری برابری نہ کر سکے، عرض کی ہاں یا رسول اللہ! بتائیے؟ ارشاد ہوا۔ ہر نماز کے بعد ۳۳، ۳۳ دفعہ سبحان اللہ، الحمد للہ اور اللہ اکبر پڑھ لیا کرو۔ کچھ دن کے بعد یہ دفعہ پھر حاضرِ خدمت ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ! ہمارے دولت مند بھائیوں نے بھی یہ وظیفہ سن لیا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ فرمایا ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ یعنی یہ خدا کی دین ہے جس کو چاہے دیدے۔ مسلمانوں سے جو زکوٰۃ وصول ہوتی تھی اُس کی نسبت عام حکم تھا کہ۔

---

[1] حوالہ مذکور بروایت دارمی [2] حوالہ مذکور بروایت صحیح بخاری و صحیح مسلم [3] مشکوٰۃ باب فضل الفقراء بروایت ترمذی و بیہقی و ابن ماجہ [4] صحیح بخاری و مسلم باب استحباب الذکر بعد الصلوٰۃ۔

تؤخذ من امرائہم و ترد علی فقرائہم۔ ہر قبیلہ کے یا ہر شہر کے امراء سے لیکر وہیں کے غرباء میں تقسیم کر دی جائے۔

صحابہ اس کی شدت سے پابندی کرتے تھے اور ایک جگہ کی زکوٰۃ دوسری جگہ نہیں بھیجتے تھے۔[1]

مساوات کے بیان میں یہ واقعہ بہ تفصیل مذکور ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابوبکرؓ نے کسی بات پر حضرت سلمانؓ وبلالؓ کو جن کا شمار فقرائے مہاجرین میں ہے ڈانٹا، آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا کہ تم نے ان لوگوں کو آزردہ تو نہیں کیا؟ یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ ان لوگوں کے پاس آئے اور معافی مانگی اور ان لوگوں نے معاف کیا۔

عوالی میں ایک عورت رہتی تھی وہ بیمار پڑی، اس کے بچنے کی کوئی امید نہ تھی، خیال تھا کہ وہ آج کسی وقت مر جائے گی، آپؐ نے لوگوں سے کہا کہ وہ مرجائے تو میں جنازہ کی نماز خود پڑھاؤں گا، اس کے بعد دفن کی جائے۔ اتفاق سے اس نے کچھ رات گئے انتقال کیا، اس کا جنازہ جب تیار ہو کر لایا گیا تو آپؐ آرام فرما رہے تھے صحابہ نے اس وقت آپؐ کو تکلیف دینا مناسب نہ سمجھی اور رات ہی کو دفن کر دیا، صبح کو آپؐ نے دریافت فرمایا تو لوگوں نے واقعہ عرض کیا، آپؐ یہ سن کر کھڑے ہو گئے اور صحابہ کو ساتھ لے کر دوبارہ اس کی قبر پر جا کر نمازِ جنازہ ادا کی۔[2]

حضرت جریرؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن پہلے پہر ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک پورا قبیلہ مسافر وار حاضرِ خدمت ہوا، ان کی ظاہری حالت اس درجہ خراب تھی کہ کسی کے بدن پر کوئی کپڑا ثابت نہ تھا، برہنہ تن، برہنہ پا کھالیں بدن سے بندھی ہوئی، تلواریں گلوں میں پڑی ہوئی، ان کی یہ حالت دیکھ کر آپؐ بیحد متاثر ہوئے، چہرۂ مبارک کا رنگ بدل گیا، اضطراب میں آپؐ اندر گئے باہر آئے، پھر حضرتِ بلالؓ کو اذان دینے کا حکم دیا، نماز کے بعد آپؐ نے خطبہ دیا اور تمام مسلمانوں کو ان کی امداد و اعانت کے لئے آمادہ کیا۔[3]

دشمنانِ جان سے عفو و درگزر

جانی دشمنوں اور قاتلانہ حملہ آوروں سے عفو و درگزر کا واقعہ پیغمبروں کے صحیفۂ اخلاق کے سوا اور کہاں مل سکتا ہے، جس شب کو آپؐ نے ہجرت فرمائی ہے کفارِ قریش کے نزدیک یہ طے شدہ تھا کہ صبح کو محمدؐ کا سر قلم کر دیا جائے، اس لئے دشمنوں کا ایک دستہ رات بھر خانۂ نبویؐ کا محاصرہ کئے کھڑا رہا۔ اگرچہ اس وقت دشمنوں سے انتقام لینے کی آپؐ میں ظاہری قوت نہ تھی لیکن ایک وقت آیا جب ان میں سے ایک ایک کی گردن اسلام کی تلوار کے نیچے تھی اور اس کی جان صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رحم و کرم پر موقوف تھی لیکن ہر شخص کو معلوم ہے کہ ان میں سے کوئی شخص اس جرم میں کبھی مقتول نہیں ہوا۔

ہجرت کے دن قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سر کی قیمت مقرر کی تھی اور اعلان کیا تھا کہ جو محمدؐ کا سر لائے گا یا زندہ گرفتار کرے گا اس کو سو اونٹ انعام میں دیئے جائیں گے، سراقہ بن جعشم پہلے شخص تھے جو اس نیت سے اپنے صبا رفتار گھوڑے پر سوار ہاتھ میں نیزہ لئے ہوئے آپؐ کے قریب پہنچے، آخر دو تین دفعہ کرشمۂ اعجاز دیکھ کر اپنی نیتِ بد سے توبہ کی اور خواہش کی کہ مجھ کو سندِ امان لکھ دی جائے، چنانچہ سندِ امان لکھ کر ان کو دی گئی،[4] اس

[1] ابوداؤد زکوٰۃ [2] یہ واقعہ بخاری وغیرہ میں بھی ہے لیکن سنن نسائی کتاب الجنائز باب الصلوۃ فی اللیل سے لیا گیا ہے [3] صحیح مسلم صدقات [4] صحیح بخاری باب الہجرۃ۔

کے آٹھ برس کے بعد فتحِ مکہ کے موقع پر حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے اور اس جرم کے متعلق ایک حرفِ سوال بھی درمیان میں نہیں آیا۔[1]

عمیر بن وہب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سخت دشمن تھا، مقتولینِ بدر کے انتقام کے لیے جب سارا قریش بے تاب تھا تو صفوان بن امیہ نے اس کو بیش قرار انعام کے وعدہ پر مدینہ بھیجا تھا کہ وہ چھپکے سے جا کر نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کام تمام کر دے، عمیر اپنی تلوار زہر میں بجھا کر مدینہ آیا، لیکن وہاں پہنچنے کے ساتھ اس کے تیور دیکھ کر لوگوں نے پہچان لیا، حضرت عمرؓ نے اس کے ساتھ سختی کرنی چاہی، لیکن آپؐ نے اس سے منع فرمایا اور اپنے قریب بٹھا کر اس سے باتیں کیں اور اصلی راز ظاہر کر دیا، یہ سن کر وہ سناٹے میں آگیا، لیکن آپؐ نے اس سے کوئی تعرض نہیں فرمایا، یہ دیکھ کر وہ اسلام لایا اور مکہ میں جا کر دعوتِ اسلام پھیلائی۔ یہ واقعہ ۲؁ھ کا ہے۔[2] ایک دفعہ آپؐ ایک غزوہ سے واپس آرہے تھے، راہ میں ایک میدان آیا، دھوپ تیز تھی، لوگوں نے درختوں کے نیچے بستر لگا دیئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک درخت کے نیچے آرام فرمایا، تلوار درخت کی شاخ سے لٹکا دی، کفار موقع کے منتظر رہتے تھے، لوگوں کو غافل دیکھ کر ناگاہ ایک طرف سے ایک بدو نے آکر بے خبری میں تلوار اتار لی، دفعۃً آپؐ بیدار ہوتے تو دیکھا کہ ایک شخص سرہانے کھڑا ہے اور ننگی تلوار اس کے ہاتھ میں ہے آپؐ کو بیدار دیکھ کر بولا، کیوں محمدؐ! اب بتاؤ تم کو اس وقت مجھ سے کون بچا سکتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا۔ "اللہ" یہ پر اثر آواز سن کر اس نے تلوار نیام میں کر لی، اتنے میں صحابہ آگئے، آپؐ نے ان سے واقعہ دہرایا اور بدو سے کسی قسم کا تعرض نہیں فرمایا۔[3] ایک دفعہ ایک اور شخص نے آپؐ کے قتل کا ارادہ کیا، صحابہ اس کو گرفتار کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لائے، وہ آپؐ کو دیکھ کر ڈر گیا، آپؐ نے اس کو مخاطب کر کے فرمایا، ڈرو نہیں، اگر تم مجھے قتل کرنا چاہتے بھی تو نہیں کر سکتے تھے۔[4]

صلح حدیبیہ کے زمانہ میں ایک دفعہ اسّی آدمیوں کا ایک دستہ منہ اندھیرے جبل تنعیم سے اتر کر آیا اور چپ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنا چاہا، اتفاق سے وہ لوگ گرفتار ہو گئے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو چھوڑ دیا اور کچھ تعرض نہیں کیا۔ قرآن مجید کی یہ آیت اسی واقعہ کے متعلق نازل ہوئی ہے۔[5]

وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُم (فتح) اسی خدا نے ان کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے روک لئے

خیبر میں ایک یہودیہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کھانے میں زہر دیا، آپؐ نے کھانا کھایا تو زہر کا اثر محسوس کیا، آپؐ نے یہودیوں کو بلا کر دریافت کیا تو انہوں نے اقرار کیا، لیکن آپؐ نے کسی سے کچھ تعرض نہیں فرمایا لیکن ہی زہر کے اثر سے جب ایک صحابی نے انتقال کیا تو آپؐ نے صرف اس یہودیہ کو قصاص کی سزا دی حالانکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر کا اثر مرتے دم تک محسوس ہوتا رہتا تھا۔[6]

[1] سراقہ بن مالک بن جعشم مدلجی کا حال استیعاب و اصابہ وغیرہ میں دیکھو [2] تاریخ طبری بروایت عروہ بن زبیر [3] صحیح بخاری کتاب الجہاد ص ۴۰۸ [4] ابن حنبل ج ۳ ص ۴۷۱ [5] جامع ترمذی تفسیر فتح [6] بخاری وفات النبی۔

دشمنوں کے حق میں دعائے خیر

دشمنوں کے حق میں بد دعا کرنا انسان کی فطری عادت ہے لیکن پیغمبروں کا مرتبہ عام انسانی سطح سے بدرجہا بلند ہوتا ہے، جو لوگ ان کو گالیاں دیتے ہیں وہ ان کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں اور جو ان کے تشنۂ خون ہوتے ہیں وہ ان کو پیار کرتے ہیں، ہجرت سے قبل مکہ میں مسلمانوں پر اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جو پیہم مظالم ہو رہے تھے، اس داستان کے دہرانے کے لئے بھی سنگ دلی درکار ہے، اسی زمانہ میں خبابؓ بن ارت ایک صحابی نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! دشمنوں کے حق میں بد دعا فرمائیے، یہ سن کر چہرۂ مبارک سرخ ہو گیا[1]۔ ایک دفعہ چند صاحبوں نے مل کر اسی قسم کی بات کہی تو فرمایا: میں دنیا کے لئے لعنت نہیں بلکہ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں[2]۔

وہ قریش جنھوں نے تین برس تک آپ کو محصور رکھا اور جو آپ کے پاس غلہ کے ایک دانہ کے پہنچنے کے روادار نہ تھے، ان کی شرارتوں کی پاداش میں دعائے نبوی کی استجابت نے ابر رحمت کا سایہ ان کے سر سے اٹھا لیا اور مکہ میں اس قدر قحط پڑا کہ لوگ ہڈی اور مردار کھانے لگے۔ ابو سفیان نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ محمدؐ! تمہاری قوم ہلاک ہو رہی ہے، خدا سے دعا کرو کہ یہ مصیبت دور ہو۔ آپ نے بلا عذر فوراً دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور خدا نے اس مصیبت سے ان کو نجات دی[3]۔

جنگ احد میں دشمنوں نے آپ پر پتھر پھینکے، تیر برسائے، تلواریں چلائیں، دندانِ مبارک کو شہید کیا، جبینِ اقدس کو خون آلود کیا، لیکن ان حملوں کا وار آپ نے جس سپر پر روکا وہ صرف یہ دعا تھی۔

اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون۔ — خدایا ان کو معاف کرنا کہ یہ نادان ہیں۔

وہ طائف جس نے دعوتِ اسلام کا جواب استہزاء اور تمسخر سے دیا تھا، وہ طائف جس نے داعیٔ اسلام کو اپنی پناہ میں لینے سے انکار کر دیا تھا، وہ طائف جس نے پائے مبارک کو لہولہان کیا تھا ان کی نسبت فرشتۂ غیب پوچھتا ہے کہ حکم ہو تو ان پر پہاڑ الٹ دیا جائے، جواب ملتا ہے کہ شاید ان کی نسل سے کوئی خدا کا پرستار پیدا ہو[5]۔ دس بارہ برس کے بعد یہی طائف اسلام کی دعوت کا جواب تیر و تفنگ (منجنیق) سے دیتا ہے، جاں نثاروں کی لاشوں پر لاشیں گر رہی ہیں، اصحاب عرض کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ! ان کے حق میں بد دعا کیجئے۔ آپ دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہیں، لوگ سمجھتے ہیں کہ حضورؐ ان کے حق میں بد دعا فرمائیں گے، لیکن زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلتے ہیں۔ خداوندا ثقیف (اہل طائف) کو اسلام نصیب کر اور دوستانہ ان کو مدینہ لا[6]۔ وہ تیر جو میدان جنگ میں نشانہ پر نہیں لگے تھے، وہ مدینہ کے صحن مسجد میں زبان مبارک سے نکل کر ٹھیک اپنے ہدف پر پہنچے، یعنی وہ مدینہ آ کر خاص مسجد نبوی میں بیٹھ کر جہاں وہ مہمان ٹھہرائے گئے تھے، مسلمان ہو گئے[7]۔

دوس کا قبیلہ یمن میں رہتا تھا، طفیلؓ بن عمرو دوسی اسی قبیلہ کے رئیس تھے، وہ قدیم الاسلام تھے، مدت تک وہ اپنے قبیلہ کو اسلام کی دعوت دیتے رہے، لیکن وہ اپنے کفر پر اڑا رہا، ناچار وہ خدمت اقدس میں حاضر ہوتے

۱ صحیح بخاری مبعث النبی ۲ مشکوٰۃ اخلاق النبیؐ بحوالہ صحیح مسلم ۳ صحیح بخاری تفسیر سورۃ دخان ۲۲۰ ۵ صحیح بخاری ۶ ابن سعد غزوۂ طائف۔

اور تعلیے کی حالت عرض کر کے گزارش کی کہ ان کے حق میں بد دعا فرمائیے، لوگوں نے یہ سنا تو کہا کہ اب دوس کی بربادی میں کوئی شک نہیں رہا، لیکن رحمت عالمؐ نے جن الفاظ میں دعا فرمائی وہ یہ تھے[1]۔

اللھم اھد دوسا وأت بھم۔ — خداوندا دوس کو ہدایت کر اور ان کو لا۔

حضرت ابوہریرہؓ کی ماں مشرکہ تھیں، اپنی ماں کو وہ جس قدر اسلام کی تبلیغ کرتے تھے وہ ابا کرتی تھیں، ایک دن انہوں نے اسلام کی دعوت دی تو ان کی ماں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی، حضرت ابوہریرہؓ کو اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ رونے لگے اور اسی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور واقعہ عرض کیا، آپ نے دعا کی۔ الٰہی! ابوہریرہؓ کی ماں کو ہدایت نصیب کر، وہ خوش خوش گھر واپس آئے تو دیکھا کواڑ بند ہیں اور ماں نہا رہی ہیں، غسل سے فارغ ہو کر کواڑ کھولے اور کلمہ پڑھا[2]۔

عبداللہ بن ابی بن سلول وہ شخص تھا جو عمر بھر منافق رہا اور کوئی موقع اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف خفیہ سازشوں اور اعلانیہ استخفاف و اہانت کا ہاتھ سے جانے نہ دیا، کفار قریش کے ساتھ اس کی خفیہ خط و کتابت تھی، غزوۂ احد میں عین موقع پر اپنے ہمراہیوں کے ساتھ مسلمانوں کی فوج سے الگ ہو گیا، واقعہ افک میں حضرت عائشہؓ پر الزام لگانے والوں میں وہ سب سے آگے تھا، بایں ہمہ اس کی فرد جرم کو رحمت عالم کا عفو ہمیشہ دھوتا رہا، وہ مرا تو آپؐ نے اس کی مغفرت کی نماز پڑھی، اس پر حضرت عمرؓ نے کہا یا رسول اللہ! آپ اس کے جنازہ کی نماز پڑھتے ہیں حالانکہ اس نے یہ کہا اور یہ کہا۔ یہ سن کر آپ متبسم ہوتے اور فرمایا، ہٹو اے عمر! جب زیادہ اصرار کیا تو فرمایا، اگر مجھے اختیار دیا جاتا کہ اگر ستر دفعہ میں نماز پڑھوں گا اس کی بخشش ہو سکتی ہے تو اس سے بھی زیادہ پڑھتا[3]۔

بچوں پر شفقت

بچوں پر نہایت شفقت فرماتے تھے، معمول تھا کہ سفر سے تشریف لاتے تو راہ میں جو بچے ملتے، ان میں سے کسی کو اپنے ساتھ سواری پر آگے پیچھے بٹھاتے، راستہ میں بچے ملتے تو ان کو خود سلام کرتے[4]۔

ایک دن خالدؓ بن سعید خدمت اقدس میں آئے ان کی چھوٹی لڑکی بھی ساتھ تھی اور سرخ رنگ کا کرتہ پہنے ہوئے تھا۔ آپ نے فرمایا سنہ سنہ، حبشی زبان میں حسنہ کو سنہ کہتے ہیں، چونکہ ان کی پیدائش حبش میں ہوئی تھی، اس لئے آپ نے اس کی مناسبت سے حبشی تلفظ میں حسنہ کے بجائے سنہ کہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت پر جو مہر نبوت تھی ابھری ہوئی تھی، بچوں کی عادت ہوتی ہے کہ غیر معمولی چیز نظر آئے تو اس سے کھیلنے لگتے ہیں، وہ بھی مہر نبوت سے کھیلنے لگیں، خالدؓ نے ڈانٹا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا کہ کھیلنے دو[5]۔

ایک دفعہ آپ کے پاس کہیں سے کپڑے آئے جن میں ایک سیاہ چادر بھی تھی جس میں دونوں طرف آنچل تھے آپ نے حاضرین سے کہا یہ چادر کس کو دوں؟ لوگ چپ رہے، آپ نے فرمایا ام خالد کو لاؤ[6]۔ وہ آئیں تو آپ نے ان کو

۱ صحیح مسلم مناقب دوس ۲ صحیح مسلم فضائل ابی ہریرہؓ ۳ صحیح بخاری کتاب الجنائز ۴ ابو داؤد کتاب الادب ۵ بخاری ج ۲ ص ۸۸۶

۶ اصابہ میں ہے کہ وہ اس قدر چھوٹی تھیں کہ لوگ ان کو گود میں اٹھا کر لائے (اصابہ ترجمہ ام خالد)۔

پہنایا اور دو دفعہ فرمایا "پہننا اور پرانی کرنا" چادر میں جو بوٹے تھے، آپؐ ان کو دکھا دکھا کر فرماتے تھے، ام خالد دیکھنا یہ سناہے یہ سناہے[1]. اوپر گزر چکا ہے کہ ام خالد حبش میں پیدا ہوئی تھی اور کئی مہینے تک وہیں رہی تھیں، اس لئے ان سے حبشی زبان میں خطاب کیا۔

ایک صحابی کا بیان ہے کہ بچپن میں انصار کے نخلستان میں چلا جاتا اور ڈھیلوں سے مار کر کھجوریں گراتا، لوگ مجھ کو خدمتِ اقدس میں لے گئے، آپؐ نے کہا ڈھیلے کیوں مارتے ہو؟ میں نے کہا کھجوریں کھانے کے لئے، ارشاد فرمایا کہ کھجوریں جو زمین پر ٹپکتی ہیں ان کو اٹھا کر کھا لیا کرو، ڈھیلے نہ مارو، یہ کہہ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا دی[2]۔

ماں بچے کی محبت کے واقعات سے آپؐ پر سخت اثر ہوتا تھا، ایک دفعہ ایک نہایت غریب عورت حضرت عائشہؓ کے پاس آئی، دو چھوٹی چھوٹی لڑکیاں بھی ساتھ تھیں، اس وقت حضرت عائشہؓ کے پاس کچھ نہ تھا، ایک کھجور زمین پر پڑی ہوئی تھی، وہی اٹھا کر دے دی، عورت نے کھجور کے دو ٹکڑے کئے اور دونوں میں برابر تقسیم کر دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باہر سے تشریف لائے تو حضرت عائشہؓ نے یہ واقعہ سنایا، ارشاد فرمایا خدا جس کو اولاد کی محبت میں ڈالے اور وہ ان کا حق بجا لائے وہ دوزخ سے محفوظ رہے گا[3]. حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ میں نماز شروع کرتا ہوں اور ارادہ ہوتا ہے کہ دیر میں ختم کروں گا کہ دفعۃً صف سے کسی بچہ کے رونے کی آواز آتی ہے اور مختصر کر دیتا ہوں کہ اس کی ماں کو تکلیف ہوتی ہوگی[4]۔

یہ محبت اور شفقت مسلمان بچوں تک محدود نہ تھی، بلکہ مشرکین کے بچوں پر بھی اسی طرح لطف فرماتے تھے، ایک دفعہ ایک غزوہ میں چند بچے جھپٹ میں آ کر مارے گئے، آپؐ کو خبر ہوئی تو نہایت آزردہ ہوئے، ایک صاحب نے کہا یا رسول اللہ! وہ مشرکین کے بچے تھے، آپؐ نے فرمایا، مشرکین کے بچے بھی تم سے بہتر ہیں، خبردار! بچوں کو قتل نہ کرو، ہر جان خدا ہی کی فطرت پر پیدا ہوتی ہے[5]۔

معمول تھا کہ جب فصل کا نیا میوہ کوئی خدمتِ اقدس میں پیش کرتا تو حاضرین میں جو سب سے زیادہ کم عمر بچہ ہوتا اس کو عنایت فرماتے[6]۔ بچوں کو چومتے اور ان کو پیار کرتے تھے، ایک دفعہ آپؐ اسی طرح بچوں کو پیار کر رہے تھے کہ ایک بدوی آیا، اس نے کہا، تم لوگ بچوں کو پیار کرتے ہو، میرے دس بچے ہیں، مگر اب تک میں نے کسی کو پیار نہیں کیا، آپؐ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ اگر تمہارے دل سے محبت کو چھین لے تو میں کیا کروں[7]۔

جابرؓ بن سمرہ صحابی تھے، وہ اپنے بچپن کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی، نماز سے فارغ ہو کر آپؐ اپنے گھر کی طرف چلے، میں بھی ساتھ ہو لیا کہ ادھر سے چند اور لڑکے نکل آئے، آپؐ نے سب کو پیار کیا اور مجھے بھی پیار کیا[8]۔

ہجرت کے موقع پر جب مدینہ میں آپؐ کا داخلہ ہو رہا تھا، انصار کی چھوٹی چھوٹی لڑکیاں خوشی سے دروازوں سے نکل نکل کر گیت گا رہی تھیں جب آپؐ کا ادھر گزر ہوا، فرمایا، اے لڑکیو! تم مجھے پیار کرتی ہو؟ سب نے کہا، ہاں

[1] بخاری کتاب اللباس سنہ حبشی میں حسن کو کہتے ہیں [2] ابو داؤد کتاب الجہاد [3] صحیح بخاری [4] بخاری کتاب الصلوٰۃ [5] مسند ابن حنبل ج ۳ ص ۴۳۵ [6] معجم صغیر طبرانی باب المیم محمد [7] صحیح بخاری و مسلم کتاب الادب [8] صحیح مسلم باب طیب رائحۃ النبیؐ۔

یا رسول اللہ! فرمایا، میں بھی تمہیں پیار کرتا ہوں[1]۔

حضرت عائشہؓ کم سنی میں بیاہ کر آئی تھیں، محلہ کی لڑکیوں کے ساتھ وہ کھیلا کرتی تھیں، آپؐ جب گھر میں تشریف لاتے تو لڑکیاں آپؐ کا لحاظ کر کے ادھر ادھر چھپ جاتیں، آپؐ انھیں تسکین دیتے اور کھیلنے کو کہتے[2]۔

غلاموں پر شفقت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غلاموں پر خصوصیت کے ساتھ شفقت فرماتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ یہ تمہارے بھائی ہیں جو خود کھاتے ہو، وہ ان کو کھلاؤ اور جو خود پہنتے ہو وہ ان کو پہناؤ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت میں جو غلام آتے ان کو ہمیشہ آپؐ آزاد فرما دیتے تھے، لیکن وہ حضورؐ کے احسان و کرم کی زنجیر سے آزاد نہیں ہو سکتے تھے۔ ماں باپ، قبیلہ، رشتہ کو چھوڑ کر عمر بھر آپؐ کی غلامی کو شرف جانتے تھے، زید بن حارثہ غلام تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو آزاد کر دیا، ان کے باپ ان کو لینے آئے، لیکن وہ آستانۂ رحمت پر باپ کے ظلِ عاطفت کو ترجیح نہ دے سکے اور اپنے جانے سے قطعاً انکار کر دیا۔ زیدؓ کے بیٹے اسامہؓ سے آپؐ اس قدر محبت کرتے تھے کہ آپؐ فرمایا کرتے تھے۔ اگر اسامہ بیٹی ہوتی تو میں اس کو زیور پہناتا، خود اپنے دستِ مبارک سے ان کی ناک صاف کرتے تھے۔

غلاموں کو لفظ "غلام" کا سن کر اپنی نظر میں اپنی آپ ذلت محسوس ہوتی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی یہ تکلیف بھی گوارا نہ تھی۔ فرمایا کوئی "میرا غلام" "میری لونڈی" نہ کہے، "میرا بچہ" یا "میری بچی" کہے اور غلام بھی اپنے آقا کو خداوند نہ کہیں، خداوند خدا ہے، آقا کہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو غلاموں پر شفقت اتنی ملحوظ تھی کہ مرض الموت میں سب سے آخری یہ وصیت فرمائی کہ غلاموں کے معاملہ میں خدا سے ڈرا کرنا۔

حضرت ابوذرؓ بہت قدیم الاسلام صحابی تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی راست گوئی کی مدح فرماتے تھے، ایک دفعہ انھوں نے ایک عجمی آزاد غلام کو برا بھلا کہا، غلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر شکایت کی آپؐ نے ابوذرؓ کو زجر فرمایا کہ تم میں اب تک جہالت باقی ہے، یہ غلام تمہارے بھائی ہیں، خدا نے تم کو ان پر فضیلت عطا کی ہے، اگر وہ تمہارے مزاج کے موافق نہ ہوں تو ان کو فروخت کر ڈالو، خدا کی مخلوق کو ستایا نہ کرو، جو خود کھاؤ وہ ان کو کھلاؤ، جو خود پہنو وہ ان کو پہناؤ، ان کو اتنا کام نہ دو جو وہ نہ کر سکیں اور اتنا کام دو تو خود بھی انکی اعانت کرو۔

ایک دفعہ ابومسعود انصاریؓ اپنے غلام کو مار رہے تھے کہ پیچھے سے آواز آئی، ابومسعود! تم کو جس قدر اس غلام پر اختیار ہے، خدا کو اس سے زیادہ تم پر اختیار ہے۔ ابومسعودؓ نے مڑ کر دیکھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے، عرض کی یا رسول اللہ! میں نے لوجہ اللہ اس غلام کو آزاد کیا، فرمایا اگر تم ایسا نہ کرتے تو آتشِ دوزخ تم کو چھو لیتی۔

ایک شخص خدمتِ نبوی میں حاضر ہوا، عرض کی یا رسول اللہ! میں غلاموں کا قصور کتنی دفعہ معاف کروں؟ آپؐ خاموش رہے، اس نے پھر عرض کی، آپؐ نے پھر خاموشی اختیار کی، اس نے تیسری بار عرض کی، آپؐ نے فرمایا ہر روز ستر بار معاف کیا کرو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایک خاندان میں سات آدمی تھے اور سات آدمیوں کے بیچ میں ایک

[1] سیرت ج ۱ اول ہجرت [2] ابو داؤد کتاب الادب باب اللعب [3] بخاری باب المعاصی من امر الجاہلیہ و ابو داؤد کتاب الادب۔

ہی لونڈی تھی۔ ایک دفعہ ان میں سے ایک نے اس لونڈی کو تھپڑ مارا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ اس کو آزاد کر دو۔ لوگوں نے کہا یا رسول اللہ! ہم سات آدمیوں کے بیچ میں یہی ایک خادم ہے۔ آپ نے فرمایا، اچھا اس وقت تک خدمت گزاری کرے، جب تک تم اس سے بے نیاز نہ ہو جاؤ جب حاجت نہ رہے تو وہ آزاد ہے۔[1]

ایک صاحب کے پاس دو غلام تھے جن کے وہ بہت شاکی تھے، وہ ان کو مارتے تھے، برا بھلا کہتے تھے، لیکن وہ دونوں باز نہ آتے تھے، انہوں نے آ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی اور اس کا علاج پوچھا۔ آپ نے فرمایا، تمہاری سزا اگر ان کے قصور کے برابر ہوگی تو خیر ورنہ سزا کی جو مقدار زائد ہوگی اس کے برابر تمہیں بھی خدا سزا دے گا۔ یہ سن کر وہ بے قرار ہو گئے اور گریہ وزاری شروع کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یہ شخص قرآن نہیں پڑھتا ونضع الموازین القسط؛ یہ سن کر انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ بہتر ہے کہ میں ان کو اپنے سے جدا کر دوں، آپ گواہ رہیں کہ اب وہ آزاد ہیں۔[2] غلاموں کا لوگ بیاہ کر دیتے تھے اور پھر جب چاہتے تھے جبراً ان میں تفریق کر دیتے تھے۔ چنانچہ ایک شخص نے اپنی لونڈی سے اپنے غلام کا عقد کر دیا اور پھر دونوں میں علیحدگی کرنی چاہی، غلام نے خدمتِ نبویؐ میں آ کر شکایت کی، آپ نے منبر پر خطبہ دیا کہ لوگ کیوں غلاموں کا نکاح کر کے پھر تفریق کرانا چاہتے ہیں، نکاح و طلاق کا حق صرف شوہر کو ہے۔[3]

اسی رحم و شفقت کا اثر تھا کہ اکثر کافروں کے غلام بھاگ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور آپ انہیں آزاد فرما دیتے تھے۔[4] مالِ غنیمت جب تقسیم ہوتا تو آپ اس میں سے غلاموں کو بھی حصہ دیتے تھے۔[5] جو غلام نئے آزاد ہوتے تھے، چونکہ ان کے پاس کوئی مالی سرمایہ نہیں ہوتا تھا اس لئے جو آمدنی وصول ہوتی تھی، اس میں سب سے پہلے آپ انہی کو عنایت فرماتے تھے۔

مستورات کے ساتھ برتاؤ

دنیا میں یہ صنفِ ضعیف (عورتیں) چونکہ ہمیشہ ذلیل رہی ہیں، اس لئے کسی نامور شخص کے حالات میں یہ پہلو کبھی پیشِ نظر نہیں رہا کہ اس مظلوم گروہ کے ساتھ اس کا طریقِ معاشرت کیا تھا، اسلام دنیا کا سب سے پہلا مذہب ہے جس نے عورتوں کی حق رسی کی اور عزت و منزلت کے دربار میں ان کو مردوں کے برابر جگہ دی، اس لئے شارعِ اسلام کے واقعاتِ زندگی میں ہم کو یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ مستورات کے ساتھ اُن کا طرزِ عمل کیا تھا۔

صحیح بخاری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایلاء (ازواجِ مطہراتؓ سے چند روز علیحدگی) کی جو روایت مذکور ہے اس میں حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ مکہ میں ہم لوگ عورتوں کو بالکل ناقابلِ التفات سمجھتے تھے، مدینہ میں نسبتاً عورتوں کی قدر تھی، لیکن نہ اس قدر جس کی وہ مستحق تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح اپنے ارشاد و احکام سے اُن کے حقوق قائم کئے، آپ کے برتاؤ نے اور زیادہ اس کو قوی اور نمایاں کر دیا، ازواجِ مطہرات کے

[1] یہ تمام واقعات ابوداؤد کتاب الادب باب حق المملوک میں مذکور ہیں۔ [2] مسند ابن حنبل ج ۶ صفحہ ۲۸۰ [3] سنن ابن ماجہ کتاب الطلاق [4] ابوداؤد کتاب الجہاد و مسند ابن حنبل ج ۱ صفحہ ۲۴۳ [5] ابوداؤد باب قسمۃ الفئی۔

واقعات مستقلاً مذکور ہیں، یہاں ہم عام واقعات لکھتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں چونکہ ہر وقت مردوں کا ہجوم رہتا تھا، عورتوں کو وعظ و پند سننے اور مسائل دریافت کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا، مستورات نے آ کر درخواست کی کہ مردوں سے ہم عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ہمارے لئے ایک دن خاص مقرر کر دیا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی درخواست قبول فرمائی اور ان کے دربار کا ایک خاص دن مقرر ہو گیا۔[1]

جن لوگوں نے آغازِ اسلام میں حبش کو ہجرت کی تھی ان میں اسماء بنت عمیس بھی تھیں، خیبر کی فتح کے زمانہ میں مہاجرینِ حبش مدینہ میں آئے تو وہ بھی آئیں۔ ایک دن وہ حضرت حفصہؓ سے ملنے گئیں، اتفاق یہ کہ اس وقت حضرت عمرؓ بھی موجود تھے، ان کو دیکھ کر پوچھا یہ کون ہیں؟ حضرت حفصہؓ نے نام بتایا، حضرت عمرؓ نے کہا، ہاں وہ حبش والی، وہ سمندر والی۔ اسماءؓ بنت عمیس نے کہا ہاں! وہی۔ حضرت عمرؓ نے کہا ہم لوگوں نے تم سے پہلے ہجرت کی اور اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر زیادہ حق ہے۔ اسماءؓ کو سخت غصہ آیا، بولیں ہرگز نہیں، تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتے تھے، وہ بھوکوں کو کھلاتے تھے، ہمارا یہ حال تھا کہ گھر سے دُور بیگانے حبشیوں میں رہتے تھے لوگ ہم کو ستاتے تھے اور ہر وقت جان کا ڈر لگا رہتا تھا۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آ گئے۔ اسماءؓ نے کہا یا رسول اللہ! عمرؓ نے یہ یہ کہا۔ آپ نے فرمایا تم نے کیا جواب دیا۔ انہوں نے ماجرا سنایا، آپ نے فرمایا، عمر کا حق مجھ پر تم سے زیادہ نہیں، عمر اور اس کے ساتھیوں نے صرف ایک ہجرت کی اور تم لوگوں نے دو ہجرتیں کیں۔

اس واقعہ کا چرچا پھیلا تو مہاجرینِ حبش جوق در جوق اسماءؓ کے پاس آتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ان سے بار بار دہرا کر سنتے، حضرت اسماءؓ کا بیان ہے کہ مہاجرینِ حبش کے لئے دنیا میں کوئی چیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ سے زیادہ مسرت انگیز نہ تھی۔[2]

حضرت انسؓ بن مالک جو خادمِ خاص تھے ان کی خالہ کا نام ام حرام تھا (جو رضاعت کے رشتہ سے آپ کی بھی خالہ تھیں) معمول تھا جب آپ قبا تشریف لے جاتے تو اُن کے پاس ضرور جاتے، وہ اکثر کھانا لا کر پیش کرتیں اور آپ نوش فرماتے، آپ سو جاتے تو بالوں میں سے جوئیں نکالتیں۔[3]

حضرت انسؓ کی والدہ ام سلیمؓ سے آپ کو نہایت محبت تھی، آپ اکثر ان کے گھر تشریف لے جاتے، وہ بچھونا بچھا دیتیں، آپ آرام فرماتے، جب سو کر اٹھتے تو وہ آپ کا پسینہ ایک شیشی میں جمع کر لیتیں، مرتے وقت وصیت کی کہ کفن میں حنوط ملایا جائے تو عرقِ مبارک کے ساتھ ملایا جائے۔

ایک دفعہ حضرت انسؓ کی والدہ ملیکہ نے آپ کی دعوت کی، کھانا خود تیار کیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانا نوش فرما کر فرمایا، آؤ میں تمہیں نماز پڑھاؤں، گھر میں صرف ایک چٹائی تھی اور وہ بھی پرانی ہو کر سیاہ ہو گئی تھی حضرت انسؓ نے پہلے اس کو پانی سے دھویا اور پھر نماز کے لئے بچھایا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امامت کی حضرت انسؓ اور

[1] صحیح بخاری کتاب العلم باب یجعل للنساء یوماً علی حدة۔ [2] صحیح بخاری غزوہ خیبر۔ [3] بخاری کتاب الجہاد صفحہ ۳۹۱ [4] بخاری کتاب الاستیذان۔

ان کی دادی اور یتیم (غلام) صف باندھ کر کھڑے ہوتے، آپؐ نے دو رکعت نماز ادا کی اور واپس آئے۔[1]

حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی (اسماءؓ) جو حضرت عائشہؓ کی علاتی بہن تھیں، حضرت زبیرؓ سے بیاہی تھیں، مدینہ میں آئیں تو اس وقت حضرت زبیرؓ کی یہ حالت تھی کہ ایک گھوڑے کے سوا اور کچھ نہ تھا، حضرت اسماءؓ خود ہی گھوڑے کے لئے جنگل سے گھاس لاتیں اور کھانا پکاتیں، حضرت زبیرؓ کو جو زمین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمائی تھی اور جو مدینہ سے دو میل پر تھی، وہاں سے کھجور کی گٹھلیاں سر پر لاد کر لاتیں، ایک دن وہ گٹھلیاں لئے ہوئے آرہی تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا، آپؐ اس وقت اونٹ پر سوار تھے، اونٹ کو بٹھا دیا کہ وہ سوار ہولیں، حضرت اسماءؓ شرمائیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر کہ وہ حجاب کرتی ہیں کچھ نہیں فرمایا اور ان کو چھوڑ کر آگے بڑھ گئے، حضرت اسماءؓ کا بیان ہے کہ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے ایک خادم بھیجا جو گھوڑے کی خدمت کرتا تھا مجھ کو اس قدر غنیمت معلوم ہوا گویا میں غلامی سے آزاد ہو گئی۔[2]

ایک بار قرابت کی بہت سی بیبیاں بیٹھی ہوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ بڑھ کر باتیں کر رہی تھیں، حضرت عمرؓ آئے تو سب اٹھ کر چل دیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہنس پڑے، حضرت عمرؓ نے کہا خدا آپؐ کو خنداں رکھے کیوں ہنسے، فرمایا ان عورتوں پر تعجب ہوا کہ وہ تمہاری آواز سنتے ہی سب آڑ میں چھپ گئیں، حضرت عمرؓ نے ان کی طرف مخاطب ہو کر کہا، اے اپنی جان کی دشمنو! مجھ سے ڈرتی ہو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ڈرتیں، سب نے کہا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سخت مزاج ہو۔[3]

ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کے گھر میں آپؐ منہ ڈھانک کر سوئے ہوئے تھے، عید کا دن تھا، چھوکریاں گا بجا رہی تھیں، حضرت ابوبکرؓ آئے تو ان کو ڈانٹا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ان کو گانے دو، ان کی عید کا دن ہے۔[4]

عورتیں نہایت دلیری کے ساتھ آپؐ سے بے محابا مسائل دریافت کرتی تھیں اور صحابہ کو ان کی اس جرأت پر حیرت ہوتی تھی، لیکن آپؐ کسی قسم کی ناگواری نہیں ظاہر فرماتے تھے، چونکہ عورتیں عموماً نازک طبع اور ضعیف القلب ہوتی ہیں، ان کی خاطرداری کا نہایت خیال رکھتے تھے، انجشہ نام ایک حبشی غلام حدی خواں تھے، یعنی اونٹ کے آگے حدی پڑھتے جاتے تھے، ایک دفعہ سفر میں ازواج مطہرات ساتھ تھیں، انجشہ حدی پڑھتے جاتے تھے، اونٹ زیادہ تیز چلنے لگے تو آپؐ نے فرمایا، انجشہ! دیکھنا شیشے (عورتیں) ٹوٹنے نہ پائیں۔[5]

حیوانات پر رحم

حیوانات پر نہایت رحم فرماتے تھے، ان بے زبانوں پر جو ظلم مدت سے عرب میں چلے آتے تھے موقوف کرا دیئے، اونٹ کے گلے میں قلادہ لٹکانے کا عام دستور تھا اس کو روک دیا، زندہ جانور کے بدن سے گوشت کا لوتھڑا کاٹ لیتے تھے اور اس کو پکا کر کھاتے تھے، اس کو منع کر دیا، جانور کی دم اور ایال کاٹنے سے بھی منع کیا اور فرمایا کہ دم ان کا مورچھل ہے اور ایال ان کا لحاف ہے، جانوروں کو دیر تک ساز میں باندھ کر کھڑا رکھنے کی بھی ممانعت کی اور فرمایا کہ جانوروں کی پیٹھوں کو اپنی نشست گاہ اور کرسی نہ بناؤ، اسی طرح جانوروں کو باہم لڑانا بھی ناجائز بتایا۔ ایک بے رحمی کا دستور یہ تھا کہ کسی جانور کو باندھ کر اس کا نشانہ بناتے تھے اور مشق تیراندازی کرتے

[1] بخاری باب الصلوٰۃ علی الحصیر، بخاری صفحہ ۸۶، کتاب النکاح [2] صحیح بخاری مناقب عمر بن خطاب [3] مسلم کتاب العیدین [4] صحیح مسلم باب اللباس والزینۃ۔

تھے، اس سنگدلی کی بھی قطعاً ممانعت کر دی۔

ایک دفعہ ایک گدھا راہ میں نظر پڑا جس کا چہرہ داغا گیا تھا، فرمایا کہ جس نے اس کا چہرہ داغا ہے اس پر خدا کی لعنت ہے، علامت یا بعض دیگر ضرورتوں کی وجہ سے اونٹوں اور بکریوں کو داغنا پڑتا تھا، ایسی حالت میں آپؐ ان اعضاء کو داغتے جو زیادہ نازک نہیں ہوتے، حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ بکریوں کے ریوڑ میں گیا تو دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بکریوں کے کان داغ رہے ہیں۔[1]

ایک بار آپؐ کسی سفر میں جا رہے تھے لوگوں نے مقام پر منزل کیا، وہاں ایک پرندہ نے انڈہ دیا ہوا تھا ایک شخص نے وہ انڈہ اٹھا لیا، چڑیا بے قرار ہو کر پر مار رہی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا کہ اس کا انڈہ چھین کر کس نے اس کو اذیت پہنچائی؟ ان صاحب نے کہا یا رسول اللہ! مجھ سے یہ حرکت ہوئی ہے، آپؐ نے فرمایا اسے وہیں رکھ دو۔[2]

ایک صحابی خدمت اقدس میں حاضر ہوتے، ان کے ہاتھوں میں چادر سے چھپے ہوئے کسی پرندہ کے بچے تھے، آپؐ نے دریافت فرمایا تو عرض کی کہ ایک جھاڑی سے آواز آرہی تھی، جا کر دیکھا تو یہ بچے تھے۔ میں نے ان کو نکال لیا، پرندہ نے یعنی ان کی ماں نے یہ دیکھا تو میرے سر پر منڈلانے لگی، آپؐ نے فرمایا، جاؤ اور بچوں کو وہیں پھر رکھ آؤ۔[3]

ایک بار راستہ میں ایک اونٹ نظر سے گزرا جس کے پیٹ اور پیٹھ شدت گرسنگی سے ایک ہو گئے تھے، فرمایا ان بے زبانوں کے متعلق خدا سے ڈرو۔[4] ایک دفعہ ایک انصاری کے باغ میں آپؐ تشریف لے گئے، ایک گرسنہ اونٹ نظر پڑا، آپؐ کو دیکھ کر بلبلایا، آپؐ نے شفقت سے اس پر ہاتھ پھیرا، پھر لوگوں سے اس کے مالک کا نام پوچھا، معلوم ہوا کہ ایک انصاری کا ہے ان سے آپؐ نے فرمایا کہ اس جانور کے معاملہ میں تم خدا سے نہیں ڈرتے۔

رحمت و محبت عام

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک تمام دنیا کے لئے رحمت بن کر آئی تھی، حضرت مسیح نے کہا تھا کہ "میں امن کا شہزادہ ہوں" لیکن شہزادۂ امن کی اخلاقی حکومت کا ایک کارنامہ بھی اس کے ثبوت میں محفوظ نہیں، لیکن امن کے شہنشاہ کو خداوند ازل ہی نے خطاب کیا۔

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ محمدؐ! ہم نے تم کو تمام دنیا کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلم و عفو، مسامحت و درگزر کے سینکڑوں واقعات پڑھ چکے، نظر آیا ہوگا کہ اس خزانہ رحمت میں دوست و دشمن، کافر و مسلم، بوڑھے بچے، عورت، مرد، آقا و غلام، انسان و حیوان ہر ایک صنف ہستی برابر کی حصہ دار تھی، ایک صاحب نے آپؐ سے کسی پر بددعا کرنے کی درخواست کی تو غضب ناک ہو کر فرمایا، میں دنیا میں لعنت کے لئے نہیں آیا ہوں[5]، رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں، آپؐ نے دنیا کو پیغام دیا۔[6]

لا تباغضوا و لا تحاسدوا و لا تدابروا ایک دوسرے پر بغض و حسد نہ کرو، ایک دوسرے سے منہ نہ پھیرو

[1] یہ حدیثیں ترمذی و ابوداؤد وغیرہ میں مذکور ہیں [2] ادب المفرد امام بخاری باب رحمۃ البہائم [3] مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد باب رحمۃ اللہ [4] ابوداؤد کتاب الجہاد [5] ایضاً [6] زرقانی ج ۶ صفحہ ۲۸۹ [7] صحیح بخاری باب الہجرۃ صفحہ ۸۹۶۔

وکونوا عباد اللہ اخوانا۔
اور اے خدا کے بندو سب آپس میں بھائی بن جاؤ۔

ایک اور حدیث میں حکم فرمایا۔

احب للناس ما تحب لنفسک تکن مسلما۔[1]
لوگوں کیلئے وہی چاہو جو اپنے لئے چاہتے ہو تو مسلم ہوگے۔

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا۔

لا یؤمن احدکم حتی یحب للناس ما یحب لنفسہ وحتی یحب المرء لا یحبہ الا للہ عز وجل۔ (مسند احمد ج ۳ صفحہ ۲۷۶)
تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ سب لوگوں کیلئے وہی محبوب نہ رکھے جو اپنے لئے رکھتا ہے جب تک وہ دوسرے کو بے غرض صرف خدا کے لئے پیار نہ کرے۔

ایک شخص نے مسجد نبویؐ میں آکر دعا کی خدایا! مجھ کو اور محمدؐ کو مغفرت عطا کر۔ آپؐ نے فرمایا۔ خدا کی رحمت کو تم نے تنگ کر دیا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ایک اعرابی مسجد نبویؐ میں آیا[2] اور آپؐ کے پیچھے نماز پڑھی، نماز پڑھ کر اپنے اونٹ پر سوار ہوا اور بولا خداوندا! مجھ پر اور محمدؐ پر رحمت بھیج اور ہماری رحمت میں کسی اور کو شریک نہ کر آپؐ نے صحابہ کی طرف خطاب کر کے فرمایا۔ بتاؤ یہ زیادہ راہ بھولا ہوا ہے یا اس کا اونٹ۔ یعنی آپؐ نے اس قسم کی دعا کرنا ناپسند فرمایا۔[3]

رقیق القلبی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہایت رحم دل اور رقیق القلب تھے۔ مالک بن حویرث ایک وفد کے رکن بن کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تھے ان کو بیس دن تک مجلس نبویؐ میں شرکت کا موقع ملا تھا وہ فرماتے تھے۔

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رحیما رقیقا۔[4]
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رحیم المزاج اور رقیق القلب تھے۔

حضرت زینبؓ کا بچہ مرنے لگا تو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا بھیجا اور قسم دلائی کہ ضرور تشریف لائیے مجبوراً آپؐ تشریف لے گئے حضرت سعدؓ بن عبادہ، معاذؓ بن جبل، ابیؓ بن کعب، زیدؓ بن ثابت بھی ساتھ تھے، بچہ کو لوگ ہاتھ میں لے کر سامنے لائے وہ دم توڑ رہا تھا، بے اختیار آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، حضرت سعدؓ کو تعجب ہوا کہ یا رسول اللہ! یہ کیا؟ فرمایا، خدا ان ہی بندوں پر رحم کرتا ہے جو اوروں پر رحم کرتے ہیں۔[5] غزوہ اُحد کے بعد جب آپؐ مدینہ تشریف لائے تو گھر گھر شہیدوں کا ماتم برپا تھا مستورات اپنے اپنے شہیدوں پر نوحہ کر رہی تھیں، یہ دیکھ کر آپؐ کا دل بھر آیا اور فرمایا حمزہ (عم رسول اللہ) کا کوئی نوحہ خواں نہیں۔[6]

ایک بار ایک صحابی جاہلیت کا اپنا ایک قصہ بیان کر رہے تھے کہ میری ایک چھوٹی لڑکی تھی، عرب میں لڑکیوں کے مار ڈالنے کا کہیں کہیں دستور تھا، میں نے بھی اپنی لڑکی کو زندہ زمین میں گاڑ دیا، وہ ابا ابا کہہ کر پکار رہی تھی اور میں اس پر مٹی کے ڈھیلے ڈال رہا تھا، اس بے دردی کو سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوگئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس قصہ کو پھر دہراؤ۔ ان صحابی نے اس دردناک ماجرے کو دوبارہ بیان کیا۔ آپؐ

[1] جامع ترمذی باب الزہد بسند غریب [2] صحیح بخاری کتاب الادب [3] ابوداؤد کتاب الادب۔ شاید یہ دونوں واقعے ایک ہوں [4] بخاری ص۸۸۵ باب رحمت الناس [5] صحیح بخاری باب المرضیٰ ص ۸۴۲ [6] سیرت ج اول اُحد۔

بے اختیار روئے، یہاں تک کہ روتے روتے محاسن مبارک تر ہوگئے۔[1]

حضرت عباسؓ بدر میں گرفتار ہو کر آئے تو لوگوں نے ان کے ہاتھ پاؤں جکڑ کر باندھ دیئے تھے، اور وہ درد سے کراہ رہے تھے، ان کے کراہنے کی آواز گوش مبارک میں بار بار پہنچ رہی تھی، لیکن اس خیال سے ان کے ہاتھ نہیں کھولتے تھے کہ لوگ کہیں گے کہ اپنے عزیز کے ساتھ غیر مساویانہ رحمدلی ہے، تاہم نیند نہیں آتی تھی، آپؐ بے چین ہو ہو کر کروٹیں بدل رہے تھے، لوگوں نے بے قراری کا سبب سمجھ کر گرہیں ڈھیلی کر دیں، حضرت عباسؓ کی کرب اور بے چینی رفع ہوئی تو آپؐ نے استراحت فرمایا۔

مصعبؓ بن عمیر ایک صحابی تھے، جو اسلام سے پہلے بہت ناز و نعمت میں پلے تھے، ان کے والدین بیش قیمت سے بیش قیمت لباس ان کو پہناتے تھے، خدا نے ان کو اسلام کی توفیق عطا فرمائی اور وہ مسلمان ہوگئے، یہ دیکھ کر لڑکے نے اپنے آبائی مذہب کو ترک کر دیا ہے، والدین کی محبت دفعتہً عداوت سے بدل گئی، ایک دفعہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں اس حال میں آئے کہ وہ جسم جو حریر و قاقم میں ملبوس رہتا تھا، اس پر پیوند سے ایک کپڑا سالم نہ تھا، یہ پُر اثر منظر دیکھ کر آپؐ آبدیدہ ہوگئے۔[2]

عیادت و تعزیت و غمخواری بیماروں کی عیادت میں دوست و دشمن، مومن و کافر کسی کی تخصیص نہ تھی (سنن نسائی باب التکبیر علی الجنازہ میں ہے کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم حسن شئ عیادۃ المریض) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیمار کی عیادت کا بہت اچھی طرح خیال رکھا کرتے تھے، بخاری (و ابوداؤد وغیرہ) میں روایت ہے کہ ایک یہودی غلام مرض الموت میں بیمار ہوا تو آپؐ عیادت کو تشریف لے گئے۔[3]

عبداللہؓ بن ثابت جب بیمار ہوئے تو آپؐ عیادت کو گئے تو ان پر غشی طاری تھی، آواز دی وہ خبر نہ ہوئے فرمایا افسوس ابو الربیع تم پر ہمارا زور اب نہیں چلتا۔ یہ سن کر عورتیں بے اختیار چیخ اٹھیں اور رونے لگیں، لوگوں نے روکا، آپؐ نے ارشاد فرمایا، اس وقت رونے دو، مرنے کے بعد البتہ رونا نہیں چاہیئے، عبداللہؓ بن ثابت کی لڑکی نے کہا، مجھ کو ان کی شہادت کی امید تھی، کیونکہ جہاد کے سب سامان تیار کر لئے تھے، آپؐ نے فرمایا، ان کو نیت کا ثواب مل چکا۔[4]

حضرت جابرؓ بیمار ہوئے تو اگرچہ ان کا گھر فاصلہ پر تھا، پیادہ پا ان کی عیادت کو جایا کرتے تھے[5] ایک دفعہ وہ بیمار ہوئے تو آپؐ حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر پیدل ان کی عیادت کو گئے، ان پر غشی طاری تھی، پانی منگوا کر وضو کیا اور بچے ہوئے پانی کو ان کے منہ پر چھڑکا، جابرؓ ہوش میں آگئے اور عرض کی یا رسول اللہ! اپنا ترکہ کس کو دوں اس پر یہ آیت اتری يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِي أَوْلَادِكُمْ۔[6]

ایک صاحب بیمار ہوئے، آپؐ چند دفعہ ان کی عیادت کو گئے، جب انہوں نے انتقال کیا تو لوگوں نے اس خیال سے کہ اندھیری رات ہے آپؐ کو تکلیف ہوگی، خبر نہ کی اور دفن کر دیا، صبح کو معلوم ہوا تو آپؐ نے شکایت

[1] مسند دارمی ص اول [2] ترغیب وترہیب ج ۲ ص ۲۴۳ بحوالہ ترمذی و مسند ابو یعلیٰ [3] صحیح بخاری باب عیادۃ المشرک [4] ابوداؤد باب [illegible] [5] ایضاً [6] صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۵۸ تفسیر آیت مذکور

کی اور قبر پر جا کر نماز جنازہ پڑھی۔[1]

عبداللہؓ بن عمرو نے غزوہ اُحد میں شہادت پائی تھی اور کافروں نے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے تھے، ان کی لاش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لا کر رکھی گئی اور اس پر چادر ڈال دی گئی، ان کے صاحبزادے (جابرؓ) آئے اور جوشِ محبت میں چاہا کہ کپڑا اٹھا کر دیکھیں، حاضرین نے روکا، انھوں نے دوبارہ ہاتھ بڑھایا، لوگوں نے پھر روک دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دردپدری کے خیال سے حکم دیا کہ چادر اٹھا دی جائے، چادر کا اٹھانا تھا کہ عبداللہ کی بہن بے اختیار چلا اٹھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رونے کی بات نہیں، فرشتے ان کو اپنے پروں کے سایہ میں لے گئے۔[2]

ایک دفعہ حضرت سعدؓ بن عبادہ بیمار ہوئے، آپ عیادت کو تشریف لے گئے، ان کو دیکھ کر آپ پر رقت طاری ہوئی اور آنکھوں سے آنسو نکل آئے، آپ کو روتا دیکھ کر سب رو پڑے۔[3]

ایک حبشی مسجد میں جھاڑو دیا کرتا تھا،[4] مر گیا تو لوگوں نے آپ کو خبر نہ کی، ایک دن آپ نے ان کا حال دریافت فرمایا، لوگوں نے کہا وہ انتقال کر گیا، ارشاد فرمایا کہ تم نے مجھ کو خبر نہ کی، لوگوں نے اس کی تحقیر کی (یعنی وہ اس قابل نہ تھا کہ آپ کو اس کے مرنے کی خبر کی جاتی) آپ نے لوگوں سے اس کی قبر دریافت کی اور جا کر جنازہ کی نماز پڑھی۔[5]

جنازہ جاتا تو آپ کھڑے ہو جاتے، بخاری میں روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جنازہ جاتا ہو تو اس کے ساتھ جاؤ ورنہ کم از کم کھڑے ہو جاؤ اور اس وقت تک کھڑے رہو کہ سامنے سے نکل جائے۔[6] اگرچہ آپ نہایت رقیق القلب اور متاثر الطبع تھے، خصوصاً اعزہ کی وفات کا آپ کو سخت صدمہ ہوتا تھا تاہم نوحہ اور ماتم کو نہایت ناپسند فرماتے تھے، حضرت جعفرؓ (حضرت علیؓ کے بھائی تھے) سے آپ کو نہایت محبت تھی، جب ان کی شہادت کی خبر آئی تو آپ مجلس ماتم میں بیٹھے، اسی حالت میں کسی نے آکر کہا کہ جعفرؓ کی عورتیں رو رہی ہیں، آپ نے فرمایا جا کر منع کر دو، وہ گئے اور واپس آکر کہا کہ میں نے منع کیا لیکن وہ باز نہیں آئیں، آپ نے دوبارہ منع کرا بھیجا، پھر بھی وہ باز نہ آئیں سہ بارہ منع کرنے پر بھی جب وہ باز نہ آئیں تو فرمایا کہ جا کر ان کے منہ میں خاک ڈال دو۔[7]

لطفِ طبع

کبھی کبھی ظرافت کی باتیں فرماتے، ایک دفعہ حضرت انسؓ کو پکارا تو فرمایا "او دو کان والے۔"[8] اس میں یہ نکتہ بھی تھا کہ حضرت انسؓ نہایت اطاعت شعار تھے اور ہر وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر کان لگائے رکھتے تھے، حضرت انسؓ کے چھوٹے بھائی کا نام ابو عمیر تھا وہ کم سن تھے اور ایک ممولا پال رکھا تھا کہ اتفاق سے وہ مر گیا، ابو عمیر کو بہت رنج ہوا، آپ نے ان کو غمزدہ دیکھا تو فرمایا یا اباعمیر ما فعل النغیر۔[9] یعنی ابو عمیر! تمہارے ممولے نے کیا کیا۔

ایک شخص نے خدمتِ اقدس میں آکر عرض کی کہ مجھ کو کوئی سواری عنایت ہو، ارشاد ہوا کہ میں تم کو اونٹنی

[1] بخاری کتاب الجنائز [2] بخاری جنائز ص ۱۶۶ [3] ایضاً ص ۱۷۴ [4] بخاری باب الصلوٰۃ علی القبر میں ابوہریرہؓ کی روایت کے راوی نے شک کیا کہ یہ مرد تھا یا عورت، لیکن دوسری روایتوں میں اس کا عورت ہونا بہ تحقیق ذکر ہے ام محجن اس کا نام تھا [5] بخاری ص ۱۷۸ کتاب الجنائز [6] بخاری ص ۱۷۵ ج اول کتاب الجنائز [7] بخاری کتاب الجنائز باب الجلوس عند المصیبۃ [8] شمائل ترمذی [9] صحیح بخاری۔

کا بچہ دوں گا، انھوں نے کہا یا رسول اللہ! میں اونٹنی کا بچہ لے کر کیا کروں گا؟ آپ نے فرمایا کہ کوئی اونٹ ایسا بھی ہوتا ہے جو اونٹنی کا بچہ نہ ہو۔[1]

ایک بڑھیا خدمتِ اقدس میں آئی کہ حضورؐ! میرے لئے دعا فرمائیں کہ مجھ کو بہشت نصیب ہو، آپ نے فرمایا، بڑھیاں بہشت میں نہ جائیں گی۔ اس کو بہت صدمہ ہوا اور روتی ہوئی واپس چلی۔ آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ اسے کہہ دو کہ بڑھیاں جنت میں جائیں گی لیکن جوان ہو کر جائیں گی۔[2]

ایک بدوی صحابی تھے جن کا نام زاہرؓ تھا، وہ دہات کی چیزیں آپ کی خدمت میں ہدیہ بھیجا کرتے تھے ایک دفعہ وہ شہر میں آئے، گاؤں سے جو چیزیں لائے تھے ان کو بازار میں فروخت کر رہے تھے، اتفاقاً آپ ادھر سے گزرے، زاہرؓ کے پیچھے جا کر ان کو گود میں دبا لیا، انھوں نے کہا کون ہے چھوڑ دو، مڑ کر دیکھا تو سرورِ عالم تھے، اپنی پیٹھ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ سے لپٹا دی، آپ نے فرمایا کوئی اس غلام کو خریدتا ہے؟ بولے کہ یا رسول اللہ مجھ جیسے غلام کو جو شخص خریدے گا نقصان اٹھائے گا، آپ نے فرمایا، لیکن خدا کے نزدیک تمہارے دام زیادہ ہیں۔[3]

ایک شخص نے آکر شکایت کی کہ میرے بھائی کے شکم میں گرانی ہے، فرمایا شہد پلاؤ، وہ دوبارہ آئے کہ شہد پلایا لیکن شکایت اب بھی باقی ہے، آپ نے پھر شہد پلانے کی ہدایت کی، سہ بارہ آئے، پھر وہی جواب ملا، چوتھی بار آئے تو فرمایا کہ خدا سچا ہے (کہ شہد میں شفا ہے) لیکن تمہارے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے، جا کر شہد پلاؤ۔ اب کی بار پلایا تو شفا ہو گئی۔[4] معدہ میں مادۂ فاسد کثرت سے موجود تھا جب پورا تنقیہ ہو گیا تو گرانی جاتی رہی۔

اولاد سے محبت

اولاد سے نہایت محبت تھی، معمول تھا کہ جب کبھی سفر فرماتے تو سب سے آخر میں حضرت فاطمہؓ کے پاس جاتے اور سفر سے واپس آتے تو جو شخص سب سے پہلے باریابِ خدمت ہوتا وہ بھی حضرت فاطمہؓ ہی ہوتیں، ایک دفعہ کسی غزوہ میں گئے، اسی اثنا میں حضرت فاطمہؓ نے دونوں صاحبزادوں (حسنین علیہما السلام) کے لئے چاندی کے کنگن بنوائے اور دروازے پر پردے لٹکائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لائے تو خلافِ معمول حضرت فاطمہؓ کے گھر نہیں گئے وہ سمجھ گئیں، فوراً پردوں کو چاک کر ڈالا اور صاحبزادوں کے ہاتھ سے کنگن اتار لئے، صاحبزادے روتے ہوئے خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے، آپ نے کنگن لے کر بازار میں بھیج دیئے کہ ان کے بدلے ہاتھی دانت کے کنگن لا دو۔

حضرت فاطمہؓ جب آپ کی خدمت میں تشریف لاتیں تو آپ کھڑے ہو جاتے، ان کی پیشانی چومتے اور اپنی نشست گاہ سے ہٹ کر اپنی جگہ بٹھاتے۔

ابوقتادہؓ کا بیان ہے کہ ہم لوگ مسجد نبویؐ میں حاضر تھے کہ دفعۃً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امامہؓ (آنحضرتؐ کی نواسی تھیں) کو کندھے پر چڑھائے ہوئے تشریف لائے اور اسی حالت میں نماز پڑھائی، جب رکوع میں جاتے تو

[1] شمائل ترمذی [2] شمائل ترمذی [3] صحیح بخاری صفحہ ۸۴۹ باب الدوا بالعسل۔

ان کو اتار دیتے، پھر کھڑے ہوتے تو چڑھا لیتے، اسی طرح پوری نماز ادا کی[1]۔

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نے کسی کو اپنے خاندان سے اتنی محبت کرتے نہیں دیکھا جس قدر آپؐ کرتے تھے، آپؐ کے صاحبزادے حضرت ابراہیمؑ عوالی میں پرورش پاتے تھے جو مدینہ سے تین چار میل ہے ان کے دیکھنے کے لئے مدینہ سے پیادہ پا جاتے، گھر میں دھواں ہوتا رہتا تھا، گھر میں جاتے، بچہ کو انا کے ہاتھ سے لیتے اور منہ چومتے، پھر مدینہ کو واپس آتے[2]۔

ایک دفعہ اقرع بن حابس عرب کے ایک رئیس خدمتِ اقدس میں آئے، آپؐ حضرت امام حسینؓ کا منہ چوم رہے تھے، عرض کی کہ میرے دس بچے ہیں، میں نے کبھی کسی کو بوسہ نہیں دیا، ارشاد فرمایا کہ جو اوروں پر رحم نہیں کرتا اس پر بھی رحم نہیں کیا جاتا (یعنی خدا اس پر رحم نہیں کرتا)

حسنین رضی اللہ عنہما سے بے انتہا محبت تھی، فرماتے تھے کہ میرے گلدستے ہیں، حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لے جاتے تو فرماتے کہ میرے بچوں کو لانا، وہ صاحبزادوں کو لاتیں، آپؐ ان کو چومتے اور سینہ سے لپٹاتے۔

ایک دفعہ مسجد میں خطبہ فرما رہے تھے، اتفاق سے حسنین رضی اللہ عنہما سرخ کپڑے پہنے ہوئے آئے کم سنی کی وجہ سے ہر قدم پر لڑکھڑاتے جاتے تھے، آپؐ ضبط نہ کر سکے، منبر سے اتر کر گود میں اٹھا لیا اور اپنے سامنے بٹھا لیا، پھر فرمایا خدا نے سچ کہا ہے إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ۔ فرمایا کرتے تھے حسینؓ میرا ہے اور میں حسینؓ کا ہوں، خدا اس سے محبت رکھے جو حسین سے محبت رکھتا ہے۔

ایک دفعہ امام حسنؓ یا امام حسینؓ دوشِ مبارک پر سوار تھے، کسی نے کہا کیا سواری ہاتھ آئی ہے، آپؐ نے فرمایا سوار بھی کیسا ہے[3]؟

ایک دفعہ امام حسنؓ یا امام حسینؓ (راوی کو بہ تعیین یاد نہیں رہا) آپؐ کے قدم پر قدم رکھ کر کھڑے تھے، آپؐ نے فرمایا اوپر چڑھ آؤ، انھوں نے آپؐ کے سینہ پر قدم رکھ دیئے، آپؐ نے منہ چوم کر فرمایا، اے خدا! میں اس سے محبت رکھتا ہوں تو بھی رکھ[4]۔

ایک دفعہ آپؐ کہیں دعوت میں جا رہے تھے، امام حسین رضی اللہ عنہ راہ میں کھیل رہے تھے، آپؐ نے آگے بڑھ کر ہاتھ پھیلا دیئے، وہ ہنستے ہوئے پاس آ آ کر نکل جاتے تھے، بالآخر آپؐ نے ان کو پکڑ لیا، ایک ہاتھ ان کی ٹھوڑی پر اور ایک سر پر رکھ کر سینے سے لپٹا لیا، پھر فرمایا، حسین میرا ہے اور میں اس کا ہوں[5]۔

اکثر امام حسین رضی اللہ عنہ کو گود میں لیتے اور ان کے منہ میں منہ ڈالتے اور فرماتے کہ خدایا میں اس کو چاہتا ہوں اور اس کو بھی چاہتا ہوں جو اس کو چاہے۔

آپؐ کے داماد حضرت زینبؓ کے شوہر جب بدر سے قید ہو کر آئے تو فدیہ کی رقم ادا نہ کر سکے تو گھر کہلا بھیجا،

لہ نسائی ص ۱۲۰ باب ادخال الصبیان فی المساجد، صحیح بخاری میں بھی یہ حدیث مذکور ہے تہ صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۹۱ تہ یہ تمام روایتیں شمائل ترمذی میں مذکور ہیں، اخیر حدیث کے ایک راوی کی نسبت ترمذی نے لکھا ہے کہ بعض اہل علم نے اس کو ضعیف الحافظ کہا ہے ۵ه ادب المفرد بخاری ص ۸۵ ته ایضاً ص ۲۳۔

حضرت زینبؓ نے اپنے گلے کا ہار بھیج دیا، یہ وہ ہار تھا کہ حضرت زینبؓ کے جہیز میں حضرت خدیجہؓ نے ان کو دیا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہار دیکھا تو بے تاب ہو گئے اور آنکھوں سے آنسو نکل آئے، پھر صحابہ سے فرمایا کہ اگر تمہاری مرضی ہو تو ہار زینبؓ کو بھیج دوں، سب نے بسر و چشم منظور کیا۔

حضرت زینبؓ کی کم سن صاحبزادی کا نام امامہ تھا، ان سے آپؐ کو بہت محبت تھی، آپؐ نماز پڑھتے ہوتے بھی ان کو ساتھ رکھتے، جب آپؐ نماز پڑھتے تو وہ دوشِ مبارک پر سوار ہو جاتیں، رکوع کے وقت آپؐ ان کو کاندھے سے اتار دیتے تھے، پھر کھڑے ہوتے تو وہ پھر سوار ہو جاتیں، روایتوں کے الفاظ سے مفہوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کو کاندھوں پر بٹھا لیتے اور اتار دیتے تھے لیکن ابن القیم نے لکھا ہے کہ یہ عمل کثیر ہے وہ خود سوار ہو جاتی ہوں گی، اور منع نہ فرماتے ہوں گے۔

آپؐ کی ایک نواسی حالتِ نزع میں تھیں، صاحبزادی نے بلا بھیجا، آپؐ تشریف لے گئے تو لڑکی اسی حالت میں آغوشِ مبارک میں رکھ دی گئی، آپؐ نے اس کی حالت دیکھی تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، حضرت سعدؓ نے کہا یا رسول اللہ! آپ یہ کیا کر رہے ہیں! آپؐ نے فرمایا یہ رحم ہے جس کو خدا نے اپنے بندوں کے دلوں میں ڈال دیا ہے[1]۔

حضرت ابراہیمؑ کی وفات میں بھی آپؐ نے آب دیدہ ہو کر فرمایا تھا، آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں، دل غمزدہ ہوتا ہے، لیکن منہ سے ہم وہی باتیں کہیں گے جن کو خدا پسند کرتا ہے[2]۔ لیکن یہ محبت صرف اپنے ہی آل و اولاد کے ساتھ مخصوص نہ تھی، بلکہ عموماً بچوں سے آپؐ کو انس تھا۔

★

لہ بخاری، [illegible] صہ ۸۴۴ تہ بخاری کتاب الجنائز صہ ۱۷۳

ازواجِ مطہراتؓ کے ساتھ معاشرت

حضرت خدیجہؓ

سلسلۂ نسب یہ ہے، خدیجہؓ بنت خویلد بن اسعد بن عبد العزیٰ بن قصی، قصی پر پہنچ کر ان کا خاندان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے مل جاتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے وہ طاہرہ کے لقب سے مشہور تھیں، ان کی والدہ فاطمہ بنت زاہدہ تھیں، ان کے والد اپنے قبیلہ میں ممتاز تھے، مکہ میں اگر سکونت اختیار کی اور بنو عبد الدار کے حلیف بنے، عامر بن لوی کے خاندان میں فاطمہ بنت زائدہ سے نکاح کیا، ان کے بطن سے حضرت خدیجہؓ پیدا ہوئیں، ان کی پہلی شادی ابوہالہ بن زرارہ تمیمی سے ہوئی، ان سے دو لڑکے پیدا ہوئے ایک کا نام ہندؓ تھا اور دوسرے کا حارث۔ ابوہالہ کے انتقال کے بعد عتیق بن عابد مخزومی کے عقدِ نکاح میں آئیں ان سے ایک لڑکی پیدا ہوئی، اس کا نام بھی ہند تھا، اسی بنا پر حضرت خدیجہؓ ام ہند کے نام سے پکاری جاتی تھیں، ہند نے اول اسلام قبول کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مفصل حلیہ ان ہی کی روایت سے منقول ہے، نہایت فصیح و بلیغ تھے، حضرت علیؓ کے ساتھ جنگِ جمل میں شریک تھے اور شہید ہوئے[1]۔

عتیق کے انتقال کے بعد حضرت خدیجہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عقدِ نکاح میں آئیں جس کے مفصل حالات گزر چکے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے چھ اولادیں ہوئیں، دو صاحبزادے کہ دونوں بچپن میں انتقال کر گئے اور چار صاحبزادیاں حضرت فاطمہ زہراؓ، حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ، حضرت ام کلثومؓ۔ ان سب کے حالات آگے آئیں گے، حضرت خدیجہؓ کی ایک بہن ہالہ تھیں وہ اسلام لائیں اور حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد تک زندہ رہیں۔

حضرت خدیجہؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بے انتہا محبت تھی، جب وہ عقدِ نکاح میں آئیں تو ان کی عمر چالیس برس کی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پچیس سال کے تھے، نکاح کے بعد وہ پچیس برس تک زندہ رہیں ان کی زندگی تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری شادی نہیں کی، حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد آپؐ کا معمول تھا کہ جب کبھی گھر میں کوئی جانور ذبح ہوتا تو آپؐ ڈھونڈ ڈھونڈ کر حضرت خدیجہؓ کی ہم نشین عورتوں کے پاس گوشت بھجواتے تھے، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ گو میں نے خدیجہؓ کو نہیں دیکھا لیکن مجھ کو جس قدر ان پر رشک آتا تھا کسی اور پر نہیں آتا تھا، جس کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ ان کا ذکر کیا کرتے تھے، ایک دفعہ میں نے اس پر آپؐ کو رنجیدہ کیا، لیکن آپؐ نے فرمایا کہ خدا نے مجھ کو ان کی محبت دی ہے[2]۔

ایک دفعہ ان کے انتقال کے بعد ان کی بہن ہالہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے آئیں اور استیذان کے قاعدہ سے اندر آنے کی اجازت مانگی، ان کی آواز حضرت خدیجہؓ سے ملتی تھی، آپؐ کے کانوں میں آواز پڑی تو حضرت

[1] طبقات ابن سعد ذکر خدیجہ کتاب النساء۔ [2] طبقات ابن سعد۔ [3] اصابہ ذکر ہند۔ [4] صحیح مسلم فضائل خدیجہؓ۔

خدیجہؓ یاد آگئیں اور آپؐ بے تاب ہو کر اٹھے اور فرمایا کہ "ہالہ ہوں گی" حضرت عائشہؓ بھی موجود تھیں ان کو رشک ہوا بولیں کہ آپؐ ایک بڑھیا کو یاد کرتے ہیں جو مر چکیں اور خدا نے ان سے اچھی بیویاں دیں، صحیح بخاری میں یہ روایت یہیں تک ہے لیکن استیعاب میں ہے کہ جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہرگز نہیں، جب لوگوں نے میری تکذیب کی تو انہوں نے تصدیق کی، جب لوگ کافر تھے تو وہ اسلام لائیں، جب میرا کوئی معین نہ تھا تو انہوں نے میری مدد کی

حضرت سودہؓ بنت زمعہ

ازواجِ مطہراتؓ میں یہ فضیلت صرف حضرت سودہؓ کو حاصل ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد سب سے پہلے وہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عقدِ نکاح میں آئیں، وہ ابتدائے نبوت میں مشرف باسلام ہو چکی تھیں، اس بنا پر ان کو قدیم الاسلام ہونے کا شرف بھی حاصل ہے، ان کی شادی پہلے سکرانؓ بن عمرو سے ہوئی تھی، حضرت سودہؓ انہی کے ساتھ اسلام لائیں اور انہی کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت (ہجرت ثانیہ) کی، حبشہ سے مکہ کو واپس آئیں، سکران نے کچھ دن کے بعد وفات پائی اور ایک لڑکا یادگار چھوڑا جس کا نام عبد الرحمٰن تھا، انہوں نے جنگ جلولا میں شہادت حاصل کی۔

حضرت خدیجہؓ کے انتقال سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہایت پریشان و غمگین تھے، یہ حالت دیکھ کر خولہ بنت حکیم نے عرض کی کہ آپؐ کو ایک مونس و رفیق کی ضرورت ہے، آپؐ نے فرمایا ہاں! گھر بار، بال بچوں کا انتظام سب خدیجہؓ کے متعلق تھا، آپؐ کے ایماء سے وہ حضرت سودہؓ کے والد کے پاس گئیں اور جاہلیت کے طریقہ پر سلام کیا، انعم صباحاً پھر نکاح کا پیغام سنایا، انہوں نے کہا ہاں محمدؐ شریف کفو ہیں، لیکن سودہ سے بھی تو دریافت کرو، غرض سب مراتب طے ہو گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود تشریف لے گئے اور سودہؓ کے والد نے نکاح پڑھایا[1]، چار سو درہم مہر قرار پایا، نکاح کے بعد عبد اللہ بن زمعہ (حضرت سودہؓ کے بھائی) جو اس وقت کافر تھے آئے، ان کو یہ حال معلوم ہوا تو سر پر خاک ڈال لی کہ کیا غضب ہو گیا، چنانچہ اسلام لانے کے بعد اپنی اس حماقت پر ہمیشہ ان کو افسوس آتا تھا، حضرت عائشہؓ اور سودہؓ کا خطبہ اور نکاح چونکہ قریب قریب ایک ہی زمانہ میں ہوا، اس لئے مؤرخین میں اختلاف ہے کہ کس کو تقدم حاصل ہے ابن اسحاق کی روایت ہے کہ سودہؓ کو تقدم ہے، عبد اللہ بن محمد بن عقیل کا قول ہے کہ وہ حضرت عائشہؓ کے بعد نکاح میں آئیں۔

شکل و شباہت حضرت سودہؓ بلند بالا اور فربہ اندام تھیں اور اس وجہ سے تیزی کے ساتھ چل پھر نہیں سکتی تھیں، حجۃ الوداع میں جب مزدلفہ سے روانہ ہونے کا وقت آیا تو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی بنا پر سب سے پہلے چلنے کی اجازت مانگی کہ ان کو بھیڑ بھاڑ میں چلنے سے تکلیف ہو گی۔

آیتِ حجاب سے پہلے عرب کے قدیم طرز پر ازواج مطہراتؓ قضائے حاجت کے لئے صحرا کو جایا کرتی تھیں حضرت عمرؓ کو یہ ناگوار ہوتا تھا، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پردہ کی تحریک کرتے رہتے تھے، لیکن ابھی استدعا قبول نہیں ہوئی تھی کہ حضرت سودہؓ رات کے وقت قضائے حاجت کے لئے نکلیں، چونکہ ان کا قد نمایاں

[1] طبقات ابن سعد میں ہے کہ رمضان ۱۰ھ میں ان کا نکاح ہوا، زرقانی نے ۸ھ بھی لکھا ہے، یہ اختلاف اس بنا پر ہے کہ خود حضرت خدیجہؓ کے وفات کے سنہ میں اختلاف ہے۔

تھا، حضرت عمرؓ نے کہا، سودہؓ! تم کو ہم نے پہچان لیا، اسی واقعہ کے بعد آیتِ حجاب نازل ہوئی۔

اخلاق و عادات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات میں سخاوت و فیاضی ایک نمایاں وصف تھا، اس بناء پر صحابہ میں جس کو آپؐ سے جس قدر تقرب حاصل تھا اسی قدر اس پر اس وصفِ خاص کا زیادہ اثر پڑتا تھا، ازواجِ مطہرات کو آپؐ کے اخلاق و عادات و فیضِ صحبت سے متمتع ہونے کا سب سے زیادہ موقع حاصل تھا، اس لئے یہ وصف ان میں عموماً نظر آتا ہے، حضرت سودہؓ اس وصف میں باستثنائے حضرت عائشہؓ سب سے ممتاز تھیں، ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے ان کی خدمت میں ایک تھیلی بھیجی، لانے والے سے پوچھا اس میں کیا ہے؟ بولا درہم، بولیں کھجور کی تھیلی میں درہم بھیجے جاتے ہیں، یہ کہہ کر اسی وقت سب کو تقسیم کر دیا، اطاعت اور فرمانبرداری بھی ان کا خاص وصف ہے اور اس وصف میں وہ تمام ازواجِ مطہرات سے ممتاز تھیں۔

روایتِ حدیث ان کے ذریعہ سے صرف پانچ حدیثیں مروی ہیں، جن میں سے بخاری میں صرف ایک ہے، صحابہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور یحییٰ بن عبدالرحمٰن بن اسعد بن زرارہ نے ان سے روایت کی ہے۔

وفات حضرت سودہؓ کے سنہ وفات میں اختلاف ہے، واقدی کے نزدیک انہوں نے امیر معاویہؓ کے زمانہ خلافت ۵۴ھ میں وفات پائی، حافظ ابن حجر ان کا سالِ وفات ۵۵ھ قرار دیتے ہیں، امام بخاری نے تاریخ میں بسندِ صحیح روایت کی ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں انتقال کیا، ذہبی نے تاریخ کبیر میں اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کی خلافت کے آخری زمانہ میں وفات کی، حضرت عمرؓ نے ۲۳ھ میں وفات پائی ہے اس لئے ان کا زمانہ وفات ۲۳ھ ہوگا، خمیس میں ہے کہ یہی روایت سب سے زیادہ صحیح ہے۔[1]

حضرت عائشہؓ[2]

عائشہؓ نام تھا، اگرچہ اُن سے کوئی اولاد نہیں ہوئی، تاہم اپنے بھانجے عبداللہ بن زبیرؓ کے تعلق سے ام عبداللہ کنیت کرتی تھیں، ماں کا نام زینب اور ام رومان کنیت تھی، بعثت کے چار برس بعد پیدا ہوئیں، ۱۰ نبوی میں آنحضرت کے ساتھ نکاح ہوا، اس وقت شش سالہ تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جبیر بن مطعم کے صاحبزادے سے منسوب تھیں، حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد خولہ بنت حکیم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کی تحریک کی، آپؐ نے رضامندی

---

[1] بخاری ج ۲ ص ۳۴۰ آیت حجاب کے شان نزول میں سخت اختلاف ہے، ایک روایت تو یہی ہے، دوسری روایت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپؐ کے یہاں نیک و بد ہر قسم کے لوگ آتے ہیں کاش آپؐ ان کو پردے کا حکم دیتے، ابن جریر نے اپنی تفسیر میں مجاہد سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے حضرت عائشہؓ بھی شریکِ طعام تھیں، ایک آدمی کا ہاتھ حضرت عائشہؓ سے چھو گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگوار گزرا، اس پر یہ آیت حجاب اتری، عام طور سے مشہور ہے کہ حضرت زینبؓ کے دعوت ولیمہ میں آیت حجاب نازل ہوئی، چنانچہ صحاح میں یہ واقعہ بتفصیل موجود ہے، حافظ ابن حجر نے ان روایتوں میں یہ تطبیق دی ہے کہ آیت حجاب کے نزول کے متعدد اسباب تھے جن میں آخری سبب حضرت زینبؓ کا واقعہ تھا اور وہی آیت کا شان نزول ہے کیونکہ خود آیت میں واقعہ کی طرف اشارے پائے جاتے ہیں (فتح الباری ج ۸ ص ۴۱۹) [2] زرقانی ج ۳ ص ۲۶۲ میں بتفصیل مذکور ہے، طبقات ابن سعد میں صرف پہلی روایت نقل کی ہے۔ [2] حضرت عائشہؓ کے حالات اور خصوصاً ان کے علمی کمالات کیلئے الگ مستقل تصنیف درکار ہے یہاں صرف ضروری سوانح زندگی لکھ دیئے گئے ہیں، حضرت مصنف نے اپنا یہ وعدہ پورا کر کے سیرت عائشہؓ کے نام سے ایک کتاب لکھ دی ہے جو مکتبہ مدنیہ لاہور سے ملتی ہے۔

ظاہر کی، خولہ نے ام رومان سے کہا، انہوں نے حضرت ابوبکرؓ سے مذکور کیا، بولے کہ جبیر بن مطعم سے وعدہ کر چکا ہوں اور میں نے کبھی وعدہ خلافی نہیں کی، لیکن مطعم نے خود اس بنا پر انکار کر دیا کہ اگر حضرت عائشہؓ ان کے گھر آگئیں تو گھر میں اسلام کا قدم آجائے گا، بہر حال حضرت ابوبکرؓ نے خولہ کے ذریعہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عقد کر دیا، چار سو درہم مہر قرار پایا لیکن مسلم میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ازواجِ مطہراتؓ کا مہر پانچسو درہم ہوتا تھا۔

نکاح کے بعد مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام تین سال تک رہا، ۱۳ھ میں آپؐ نے ہجرت کی تو حضرت ابوبکرؓ ساتھ تھے، اہل و عیال کو مکہ چھوڑ آئے تھے، جب مدینہ میں اطمینان ہوا تو حضرت ابوبکرؓ نے عبداللہ بن اریقط کو بھیجا کہ ام رومان، اسماء، اور عائشہ کو لے آئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی زید بن حارثہؓ اور ابورافع کو حضرت فاطمہؓ، ام کلثومؓ اور حضرت سودہؓ وغیرہ کے لانے کے لئے روانہ فرمایا، مدینہ میں آکر حضرت عائشہؓ سخت بخار میں مبتلا ہوئیں، اشتداد مرض سے سر کے بال تک جھڑ گئے، صحت ہوئی تو ام رومان کو رسم عروسی ادا کرنے کا خیال آیا، اس وقت حضرت عائشہؓ کی عمر ۹ سال کی تھی، سہیلیوں کے ساتھ جھولا جھول رہی تھیں کہ ام رومان نے حضرت عائشہؓ کو آواز دی، ان کو اس واقعہ کی خبر تک نہ تھی، ماں کے پاس آئیں، انہوں نے منہ دھویا بال درست کئے، گھر میں لے گئیں، انصار کی عورتیں انتظار میں تھیں، یہ گھر میں داخل ہوگئیں تو سب نے مبارک باد دی، چاشت کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور رسم عروسی ادا ہوئی، شوال میں نکاح ہوا تھا اور شوال ہی میں یہ رسم بھی ادا کی گئی، زمانہ قدیم میں اس مہینہ میں طاعون آیا تھا، اس بنا پر اہل عرب اس مہینہ کو اس تقریب کے لئے مکروہ خیال کرتے تھے، اس خیال کے مٹانے کے لئے غالباً یہ مہینہ انتخاب کیا گیا تھا۔

وفات حضرت عائشہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نو برس تک زندگی بسر کی، نو سال کی عمر میں وہ آپؐ کے پاس آئیں اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال فرمایا تو ان کی عمر ۱۸ سال کی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت عائشہؓ تقریباً ۴۸ سال تک زندہ رہیں، ۵۸ھ میں وفات پائی، اس وقت ان کی عمر ۶۶ سال کی تھی، وصیت کے مطابق جنۃ البقیع میں رات کے وقت دفن ہوئیں، قاسم بن محمد، عبداللہ بن عبدالرحمٰن، عبداللہ بن ابی عتیق، عروہ بن زبیرؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ نے قبر میں اتارا، اس وقت حضرت ابوہریرہؓ مروان بن الحکم کی طرف سے مدینہ کے حاکم تھے، اسلئے انہوں نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عائشہؓ سے بہت محبت تھی، اسی محبت سے آپؐ نے مرض الموت میں تمام ازواجِ مطہرات سے اجازت لی اور اپنی زندگی کے آخری دن حضرت عائشہؓ کے حجرے میں بسر کئے، اس محبت کا اظہار جن طریقوں سے ہوتا تھا ان کے متعلق احادیث و سیر میں نہایت کثرت سے واقعات درج ہیں۔

علمی زندگی حضرت عائشہؓ کی علمی زندگی بھی نمایاں حیثیت رکھتی ہے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں فتوی دیتی تھیں، اکابر صحابہ پر انہوں نے دقیق اعتراضات کئے ہیں جن کو علامہ سیوطیؒ نے ایک رسالہ[1] میں جمع کر دیا ہے ان سے ۲۲۱۰ حدیثیں مروی ہیں جن میں ۱۷۴ حدیثوں پر شیخین نے اتفاق کیا ہے، بخاری نے منفرداً ان سے ۵۴ حدیثیں روایت کی ہیں، ۶۸ حدیثوں میں امام مسلم منفرد ہیں، بعض لوگوں کا قول ہے کہ احکام شرعیہ میں سے ایک چوتھائی ان سے منقول ہے، ترمذی میں ہے کہ صحابہ کے سامنے جب کوئی مشکل سوال آجاتا تھا تو اس کو حضرت عائشہؓ ہی حل کرتی تھیں،[1]

---

[1] یہ رسالہ بھی سیرت عائشہؓ کے اخیر میں شامل ہے۔ ۱۲

کے شاگردوں کا بیان ہے کہ ہم نے ان سے زیادہ خوش تقریر نہیں دیکھا، تفسیر، حدیث، اسرار شریعت، خطابت اور ادب و انساب میں انکو کمال تھا، شعراء کے بڑے بڑے قصیدے ان کو زبانی یاد تھے، حاکم نے مستدرک میں اور ابن سعد نے طبقات میں بہ تفصیل ان واقعات کو لکھا ہے اور مسند ابن حنبل وغیرہ میں بھی جستہ جستہ ان کے فضل و کمال کے دلائل و شواہد ملتے ہیں۔

حضرت حفصہؓ

حضرت حفصہؓ، حضرت عمرؓ کی صاحبزادی تھیں، ماں کا نام زینب بنت مظعون تھا، بعثت سے پانچ برس پہلے جبکہ اس سال جب قریش خانہ کعبہ کو تعمیر کر رہے تھے پیدا ہوئیں، ان کی شادی خنیسؓ بن حذافہ سے ہوئی اور انہی کے ساتھ مدینہ کو ہجرت کی، خنیسؓ نے غزوۂ بدر میں زخم کھائے اور واپس آ کر انہی زخموں کی وجہ سے شہادت[1] پائی خنیسؓ نے اپنی یادگار میں حضرت حفصہؓ کے بطن سے کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ حضرت حفصہؓ کے بیوہ ہو جانے کے بعد حضرت عمرؓ کو ان کے نکاح کی فکر ہوئی، سوء اتفاق سے اسی زمانہ میں حضرت رقیہ کا انتقال ہو چکا تھا اس بنا پر سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے ان کے نکاح کی خواہش حضرت عثمانؓ سے کی، انہوں نے کہا میں اس معاملہ میں غور کروں گا، حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے ذکر کیا، انہوں نے خاموشی اختیار کی، حضرت عمرؓ کو ان کی بے التفاتی سے رنج ہوا، اس کے بعد خود جناب رسالت پناہؐ نے حضرت حفصہؓ سے نکاح کی خواہش کی، نکاح ہو گیا تو حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ سے ملے اور کہا کہ جب تم نے مجھ سے حفصہؓ کے نکاح کی درخواست کی اور میں خاموش رہا تو تم کو ناگوار گزرا لیکن میں نے اسی بنا پر کچھ جواب نہیں دیا کہ رسول اللہ نے انکا ذکر کیا تھا اور میں آپ کا راز فاش کرنا نہیں چاہتا تھا، اگر رسول اللہ نے ان سے نکاح نہ کر لیا ہوتا تو میں اس کے لئے آمادہ[2] تھا۔ حضرت حفصہؓ آخر حضرت عمرؓ کی بیٹی تھیں اس لئے مزاج میں ذرا تیزی تھی، صحیح بخاری میں واقعہ ایلاء کے متعلق خود حضرت عمرؓ کا بیان ہے کہ ہم لوگ زمانہ جاہلیت میں عورتوں کو کوئی چیز نہیں سمجھتے تھے، میں ایک دن کسی معاملہ میں غور کر رہا تھا، اتفاق سے میری بی بی نے مجھ کو مشورہ دیا، میں نے کہا تم کو ان معاملات میں کیا دخل ہے، بولیں کہ تم میری بات پسند نہیں کرتے، حالانکہ تمہاری بیٹی رسول اللہ کو برابر کا جواب دیتی ہیں، میں اٹھا اور حفصہؓ کے پاس آیا، میں نے کہا بیٹی! تم رسول اللہ کو جواب دیتی ہو، یہاں تک کہ آپ دن بھر رنجیدہ رہتے ہیں، بولیں ہاں ہم ایسا کرتے ہیں، میں نے کہا خبردار! میں تمہیں عذاب الٰہی سے ڈراتا ہوں، تم اس کے گھمنڈ میں نہ آ جانا جس کے حسن نے رسول اللہ کو فریفتہ کر لیا ہے[3] (یعنی عائشہؓ)۔ ترمذی میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت صفیہؓ رو رہی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور رونے کی وجہ پوچھی، انہوں نے کہا مجھ کو حفصہؓ نے کہا ہے کہ تم یہودی کی بیٹی ہو، آپ نے فرمایا، تم نبی کی بیٹی ہو، تمہارا چچا پیغمبر ہے اور پیغمبر کے نکاح میں ہو، حفصہؓ تم پر کس بات میں فخر کر سکتی ہیں[4]۔

---

[1] زرقانی ج ۳ ص ۲۲۰ عام طور پر یہی مشہور ہے لیکن اصابہ میں ہے کہ غزوۂ احد میں شہید ہوئے، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے رقیہؓ کے انتقال کے بعد حضرت عثمانؓ سے ان کے نکاح کی خواہش کی تھی اور یہ مسلم ہے کہ حضرت رقیہؓ کا انتقال غزوۂ بدر کے بعد ہوا اور اسی وجہ سے حضرت عثمانؓ شریک غزوۂ بدر نہ ہو سکے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خنیسؓ نے غزوۂ بدر کے بعد وفات پائی، دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عثمانؓ غمگین بیٹھے تھے حضرت عمرؓ ادھر سے گزرے اور پوچھا حفصہؓ سے نکاح کرتے ہو؟ اس کی عدت گزر گئی۔ اگر خنیسؓ نے احد میں شہادت پائی ہوتی تو ان کی عدت کا زمانہ ۳ھ میں ختم ہوتا حالانکہ نکاح ۳ھ میں ہوا (فتح الباری ج ۹ ص ۱۵۱) [2] طبری ج ۳ ص ۲۰۹ [3] بخاری ج ۲ ص ۴۶۹ [4] صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۳۰ [5] ترمذی ص ۶۴۲ کتاب المناقب۔

ایک بار حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ نے حضرت صفیہؓ سے کہا کہ ہم رسول اللہ کے نزدیک تم سے زیادہ معزز ہیں، ہم آپ کی بیوی بھی ہیں اور چچا زاد بہن بھی، حضرت صفیہؓ کو ناگوار گزرا، انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی شکایت کی، آپ نے فرمایا کہ تم نے یہ کیوں نہیں کہا کہ تم مجھ سے زیادہ کیونکر معزز ہو سکتی ہو، میرے شوہر محمدؐ، میرے باپ ہارونؑ اور میرے چچا موسیٰؑ ہیں۔

حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی بیٹی تھیں جو تقرب نبوی میں دوش بدوش تھے اس بنا پر حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ دیگر ازواج کے مقابلہ میں باہم ایک تھیں لیکن کبھی کبھی خود بھی باہم رشک و رقابت کا اظہار ہو جایا کرتا تھا، ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ دونوں آنحضرتؐ کے ساتھ سفر میں تھیں رسول اللہ راتوں کو حضرت عائشہؓ کے اونٹ پر چلتے تھے اور ان سے باتیں کرتے تھے، ایک دن حضرت حفصہؓ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ آج رات کو تم میرے اونٹ پر اور میں تمہارے اونٹ پر سوار ہوں تاکہ مختلف مناظر دیکھنے میں آئیں حضرت عائشہؓ راضی ہو گئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہؓ کے اونٹ کے پاس آئے جس پر حفصہؓ سوار تھیں جب منزل پر پہنچے اور حضرت عائشہؓ نے آپ کو نہیں پایا تو اپنے پاؤں کو اذخر (ایک گھاس ہے جس میں سانپ بچھو رہتے ہیں) کے درمیان لٹکا کر کہنے لگیں، خداوندا! کسی بچھو یا سانپ کو متعین کر جو مجھے ڈس جائے[1]۔

وفات حضرت حفصہؓ نے ۴۵ھ میں جو امیر معاویہؓ کی خلافت کا زمانہ تھا وفات پائی، وفات سے پیشتر اپنے بھائی عبداللہ بن عمرؓ سے اس وصیت کی تجدید کی جو حضرت عمرؓ نے ان کو کی تھی، کچھ جائیداد بھی وقف کی اور کچھ مال صدقہ میں دیا، مروان بن حکم نے جو اس وقت مدینہ کا گورنر تھا، نماز جنازہ پڑھائی اور بنی حزم کے گھر سے مغیرہ بن شعبہ کے گھر تک جنازہ کو کاندھا دیا، یہاں سے قبر تک حضرت ابوہریرہؓ جنازہ کو لے گئے، ان کے بھائی عبداللہ عاصم، سالم، عبداللہ، حمزہ، عبداللہ بن عمرؓ کے لڑکوں نے قبر میں اتارا۔

حضرت زینب امّ المساکینؓ

زینب نام تھا چونکہ فقراء و مساکین کو نہایت فیاضی کے ساتھ کھانا کھلاتی تھیں اس لئے امّ المساکینؓ کی کنیت کے ساتھ مشہور ہو گئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عبداللہؓ بن جحش کے نکاح میں تھیں، عبداللہ بن جحش نے جنگ احد ۳ھ میں شہادت پائی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی سال ان سے نکاح کر لیا، نکاح کے بعد آنحضرتؐ کے پاس صرف دو مہینے

---

[1] اس امر کا خاص طور پر لحاظ رکھنا چاہیئے کہ ازواج مطہراتؓ میں اس قسم کی روایتیں صرف صفیہؓ و حضرت عائشہؓ کے متعلق مذکور ہیں اس کے اسباب کی تلاش کرنی چاہیئے، حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کے ساتھ منافقین کو جو عداوت تھی وہ قابل لحاظ ہے۔ حضرت حفصہؓ کے بھی سن وفات میں اختلاف ہے ایک روایت ہے کہ انہوں نے جمادی الاول ۴۱ھ میں وفات پائی اس وقت ان کا سن ۵۹ سال کا تھا لیکن اگر سن وفات ۴۵ھ قرار دیا جائے تو ان کی عمر ۶۳ سال کی ہوگی، ایک روایت ہے کہ انہوں نے حضرت عثمانؓ کی خلافت میں ۲۷ھ میں انتقال کیا، یہ روایت اس بنا پر کی گئی کہ وہب نے ابن مالک سے روایت کی کہ جس سال افریقہ فتح ہوا حفصہؓ نے اسی سال وفات پائی اور افریقہ حضرت عثمانؓ کی خلافت میں ۲۷ھ میں فتح ہوا لیکن یہ سخت غلطی ہے، افریقہ دو دفعہ فتح ہوا ہے اس دوسری فتح کا فخر حضرت معاویہ بن خدیج کو حاصل ہے اور یہ فتح ۴۵ھ میں ہوئی، وہب بن مالک نے حفصہؓ کا سال وفات اسی فتح کے سنہ کو قرار دیا ہے۔

مہینے رہنے پائی تھیں کہ ان کا انتقال ہوگیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں حضرت خدیجہؓ کے بعد صرف یہی ایک بی بی تھیں جنھوں نے وفات پائی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود نمازِ جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئیں، وفات کے وقت ان کی عمر ۳۰ سال کی تھی۔

حضرت اُمِّ سلمہؓ

ہند نام، ام سلمہ کنیت تھی، باپ کا نام سہیل اور ماں کا عاتکہ تھا، پہلے عبداللہ بن عبدالاسد کے نکاح میں جو زیادہ تر ابو سلمہ کے نام سے مشہور ہیں اور جو اُن کے چچا زاد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی تھے، اپنے شوہر ہی کے ساتھ اسلام لائیں اور ان ہی کے ساتھ سب سے پہلے حبشہ کی طرف ہجرت کی، چنانچہ سلمہ ان کے بیٹے حبشہ ہی میں پیدا ہوتے، حبشہ سے مکہ میں آئیں اور یہاں سے مدینہ کو ہجرت کی، ہجرت میں ان کو یہ فضیلت حاصل ہوئی کہ اہلِ سیر کے نزدیک وہ پہلی عورت ہیں جو ہجرت کرکے مدینہ میں آئیں۔ ان کے پہلے شوہر ابو سلمہؓ بڑے شاہسوار تھے، مشہور غزوات بدر و احد میں شریک ہوتے، غزوہ احد میں چند زخم کھائے جن کے صدمہ سے جانبر نہ ہوسکے اور جمادی الثانی ۴ھ میں وفات پائی، ان کے جنازہ کی نماز نہایت اہتمام سے پڑھی گئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۹ تکبیریں کہیں، لوگوں نے نماز کے بعد پوچھا یا رسول اللہ آپ کو سہو تو نہیں ہوا، فرمایا یہ ہزار تکبیر کے مستحق تھے، ابو سلمہؓ کی وفات کے وقت ام سلمہؓ حاملہ تھیں۔ وضعِ حمل کے بعد جب عدت گزر گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کرنا چاہا تو انھوں نے چند عذر پیش کئے۔

(۱) میں سخت غیور عورت ہوں (۲) صاحبِ عیال ہوں (۳) میرا سن زیادہ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب زحمتوں کو گوارا کیا۔

وفات اہلِ سیر متفق اللفظ ہیں کہ ازواجِ مطہراتؓ میں سب کے بعد حضرت ام سلمہؓ نے وفات پائی، لیکن انکے سنہ وفات میں نہایت اختلاف ہے، واقدی نے ۵۹ھ بتایا ہے، ابراہیم حربی کے نزدیک ۶۲ھ ہے اور تقریب میں اسی کو صحیح کہا ہے، امام بخاری نے تاریخ کبیر میں لکھا ہے کہ ۵۸ھ میں وفات پائی، بعض روایتوں میں ہے کہ ۶۱ھ میں جب امام حسینؓ کی شہادت کی خبر آئی اس وقت ان کا انتقال ہوا ہے، ابن عبداللہ نے اس روایت کی تصحیح کی ہے۔

اس اختلافِ روایت کی حالت میں سنہ وفات کی تعیین مشکل ہے تاہم یہ یقینی ہے کہ وہ واقعہ حرہ تک زندہ تھیں، مسلم میں ہے کہ حارث بن عبداللہ بن ابی ربیعہ اور عبداللہ بن صفوان ام سلمہؓ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اس لشکر کا حال پوچھا جو زمین میں دھنس جائے گا، یہ سوال اس وقت کیا گیا تھا جب یزید نے مسلم بن عقبہ کو لشکرِ شام کے ساتھ مدینہ کی طرف بھیجا تھا اور واقعہ حرہ پیش آیا تھا، واقعہ حرہ ۶۳ھ میں پیش آیا ہے، اس لئے اس سے پہلے ان کی وفات کی تمام روایتیں صحیح نہیں۔ ابن عبدالبر نے لکھا ہے کہ حضرت ام سلمہؓ کی وصیت کی بنا پر سعید بن زید نے نمازِ جنازہ پڑھائی، لیکن اس روایت کی صحت میں کلام ہے، سعید بن زید نے باختلافِ روایت ۵۱ھ یا ۵۲ھ یا ۵۸ھ میں انتقال کیا ہے اور یہ یقینی طور پر ثابت ہے کہ اس وقت ام سلمہؓ زندہ تھیں، واقدی نے لکھا ہے کہ ابوہریرہؓ نے ان کا جنازہ پڑھایا مگر ان کی وفات کے وقت سعید بن زید زندہ ہوتے تو حضرت ابوہریرہؓ خلافِ وصیت کیونکر نمازِ جنازہ پڑھ سکتے تھے، بہر حال ازواجِ مطہرات میں

سب کے بعد حضرت ام سلمہؓ نے وفات پائی اور وفات کے وقت ان کی عمر ۸۴ سال کی تھی۔

فضل و کمال ازواجِ مطہرات میں حضرت عائشہؓ کے بعد فضل و کمال میں انہی کا درجہ ہے ابن سعد نے طبقات میں اس کی تصریح کی ہے، روایتِ حدیث اور نقلِ احکام میں حضرت عائشہؓ کے سوا اور تمام بیبیوں پر ان کو فضیلت حاصل ہے، صلح حدیبیہ میں جب صحابہ کو مکہ سے باہر حلق اور قربانی میں تامل تھا تو حضرت ام سلمہؓ ہی کی تدبیر سے یہ مشکل حل ہوئی اور ان کی یہ دانشمندی اور عقل و ذہانت کی سب سے بہتر مثال ہے، یہ واقعہ صحیح بخاری میں بہ تفصیل موجود ہے۔

حضرت زینبؓ

ازواجِ مطہرات میں جو بیبیاں حضرت عائشہؓ کی ہمسری کا دعویٰ رکھتی تھیں ان میں حضرت زینبؓ بھی تھیں، خود حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کانت تسامینی یعنی وہ میرا مقابلہ کرتی تھیں اور ان کو اس کا حق بھی تھا، نسبی حیثیت سے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن تھیں، جمال میں بھی ممتاز تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان سے نہایت محبت تھی، زہد و تورع میں یہ حال تھا کہ جب حضرت عائشہؓ پر اتہام لگایا گیا اور اس اتہام میں خود حضرت زینبؓ کی بہن حمنہ شریک تھیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے حضرت عائشہؓ کی اخلاقی حالت دریافت کی تو انہوں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا۔

ما علمت الا خیراً۔ مجھ کو حضرت عائشہؓ کی بھلائی کے سوا کسی چیز کا علم نہیں۔

حضرت عائشہؓ کو ان کے اس صدق و اقرارِ حق کا خود اعتراف کرنا پڑا۔

عبادت میں نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ مشغول رہتی تھیں، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو عقد میں لانا چاہا تو انہوں نے کہا کہ میں بغیر استخارہ کے کوئی رائے قائم نہیں کرتی، ایک دفعہ آپ مہاجرین پر کچھ مال تقسیم کر رہے تھے حضرت زینبؓ اس معاملہ میں کچھ بول اٹھیں، حضرت عمرؓ نے ڈانٹا، آپ نے فرمایا ان سے درگزر کرو، یہ اواہ ہیں (یعنی خاشع و متضرع ہیں)، نہایت قانع اور فیاض طبع تھیں، خود اپنے دست و بازو سے معاش پیدا کرتی تھیں اور اس کو خدا کی راہ میں لٹا دیتی تھیں، ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے ان کا سالانہ نفقہ بھیجا، انہوں نے اس پر ایک کپڑا ڈال دیا اور برزہ بنت رافع کو حکم دیا کہ میرے خاندانی رشتہ داروں اور یتیموں کو تقسیم کردو، برزہ نے کہا آخر ہمارا بھی کچھ حق ہے انہوں نے کہا کہ کپڑے کے نیچے جو کچھ ہے وہ تمہارا ہے، دیکھا تو پچاس درہم نکلے، جب تمام مال تقسیم ہوچکا تو دعا کی کہ خدایا اس سال کے بعد میں عمرؓ کے عطیہ سے فائدہ نہ اٹھاؤں، یہ دعا مقبول ہوئی اور اسی سال ان کا انتقال ہوگیا۔

وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواجِ مطہرات سے فرمایا تھا۔

اسرعکن لحاقابی اطولکن یداً۔ تم میں مجھ سے جلد وہ ملے گی جس کا ہاتھ لمبا ہوگا۔

یہ استعارۃً فیاضی کی طرف اشارہ تھا لیکن ازواجِ مطہراتؓ اس کو حقیقت سمجھیں، چنانچہ باہم اپنے ہاتھوں کو ناپا کرتی تھیں، حضرت زینبؓ اپنی فیاضی کی بنا پر اس پیشین گوئی کا مصداق ثابت ہوئیں اور ازواجِ مطہراتؓ میں سب سے پہلے انتقال کیا، کفن کا خود سامان کرلیا تھا اور وصیت کی تھی کہ حضرت عمرؓ بھی کفن دیں تو ان میں سے ایک صدقہ کردینا

چنانچہ یہ وصیت پوری کی گئی، حضرت عمرؓ نے نماز جنازہ پڑھائی، اس کے بعد ازواج مطہرات سے دریافت کیا کہ کون قبر میں داخل ہوگا؟ انہوں نے کہا وہ شخص جو ان کے گھر میں داخل ہوا کرتا تھا، چنانچہ اسامہؓ، محمد بن عبداللہ بن جحش، عبداللہ بن ابی احمد بن جحش نے ان کو قبر میں اتارا۔ سنہ ۲۰ھ میں انتقال کیا اور ۵۳ برس کی عمر پائی، واقدی نے لکھا ہے کہ آنحضرتؐ سے جس وقت ان کا نکاح ہوا، اس وقت ۳۵ سال کی تھیں۔

حضرت جویریہؓ

حضرت جویریہؓ حارث بن ضرار کی بیٹی تھیں جو قبیلۂ بنی مصطلق کا سردار تھا، مسافع بن صفوان سے شادی ہوئی تھی جو غزوہ مریسیع میں قتل ہوا، اس لڑائی میں کثرت سے لونڈی غلام مسلمانوں کے ہاتھ آئے، انہی لونڈیوں میں حضرت جویریہؓ بھی تھیں، جب مال غنیمت کی تقسیم ہوئی تو وہ ثابت بن قیس بن شماسؓ انصاری کے حصہ میں آئیں۔

اسلام میں اگر آقا راضی ہو تو لونڈی غلام کچھ رقم ادا کر کے آزاد ہو سکتے ہیں، اس طریقہ کو فقہا کی اصطلاح میں کتابت کہتے ہیں، اسی اصول کے موافق حضرت جویریہؓ مکاتبہ بن گئیں، ان کو شرط کے موافق ۹ اوقیہ سونا ادا کرنا تھا لیکن رقم ان کی استطاعت سے بہت زیادہ تھی، وہ رسول اللہ کے پاس آئیں اور کہا یا رسول اللہ! میں مسلمان کلمہ گو عورت اور جویریہ حارث کی بیٹی ہوں جو اپنی قوم کا سردار ہے مجھ پر جو مصیبتیں آئیں وہ آپ سے مخفی نہیں، میں ثابت بن قیس کے حصہ میں آئی اور ۹ اوقیہ سونے پر ان سے عہد کتابت کیا، یہ رقم میرے امکان سے باہر تھی لیکن میں نے آپ کے بھروسہ پر اس کو منظور کر لیا اور اب آپ سے اس کا سوال کرنے کے لئے آئی ہوں، آپ نے فرمایا تو کیا تم کو اس سے بہتر چیز کی خواہش نہیں؟ انہوں نے کہا وہ کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا میں یہ رقم ادا کر دیتا ہوں اور تم سے نکاح کر لیتا ہوں، وہ راضی ہو گئیں، آپ نے ثابت بن قیس کو بلایا، وہ بھی راضی ہو گئے، آپ نے رقم ادا کی اور ان کو آزاد کر کے نکاح کر لیا، یہ خبر چاہ پھیلا تو لوگوں نے قبیلۂ بنی مصطلق کے تمام لونڈی غلام کو اس بنا پر آزاد کر دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں سے رشتۂ مصاہرت قائم کر لیا، آزاد شدہ غلاموں کی تعداد ایک روایت میں سات سو بتائی گئی ہے، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ جویریہؓ کی برکت سے سینکڑوں گھرانے آزاد کر دیئے گئے، بعض روایتوں میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خود حضرت جویریہؓ نے یہ خواہش ظاہر کی تھی اور آپ نے تمام قیدیوں کو ان پر ہبہ کر دیا تھا۔

حضرت جویریہؓ نے ۵۰ھ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئیں، اس وقت ان کا سن ۶۵ برس کا تھا۔

حضرت اُمّ حبیبہؓ

رملہ نام اور ام حبیبہ کنیت تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے ۱۷ سال پہلے پیدا ہوئیں اور عبیداللہ بن جحش سے عقد ہو گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو دونوں مشرف با سلام ہوئے اور حبشہ کی طرف ہجرت ثانیہ کی، ایک روایت ہے کہ ان کی بیٹی حبیبہ جن کی کنیت کے ساتھ وہ مشہور ہیں، حبشہ ہی میں پیدا ہوئیں، حبشہ میں جا کر عبیداللہ بن جحش نے عیسائیت قبول کر لی لیکن ام حبیبہؓ اسلام پر قائم رہیں، اختلاف مذہب کی بنا پر عبیداللہ ابن

جحش نے ان سے علیحدگی اختیار کر لی، اور اب وہ وقت آ گیا کہ ان کو اسلام اور ہجرت کی فضیلت کے ساتھ ام المومنین بننے کا شرف بھی حاصل ہو، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن امیۃ الضمری کو نجاشی کی خدمت میں بغرض نکاح بھیجا، جب وہ نجاشی کے پاس پہنچے تو نجاشی نے ام حبیبہؓ کو اپنی لونڈی ابرہہ کے ذریعہ سے پیغام دیا کہ آنحضرتؐ نے مجھ کو تمہارے نکاح کے لئے لکھا ہے، انہوں نے خالد بن سعید اموی کو وکیل مقرر کیا اور اس مژدہ کے صلہ میں ابرہہ کو چاندی کے دو کنگن اور انگوٹھیاں دیں، جب شام ہوئی تو نجاشی نے جعفر بن ابی طالب اور وہاں کے مسلمانوں کو جمع کر کے خود نکاح پڑھایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے چار سو مہر ادا کیا[2]

تمام لوگوں کے سامنے خالد بن سعید کو یہ رقم دی گئی، لوگوں نے بعد نکاح اٹھنا چاہا لیکن نجاشی نے کہا دعوت ولیمہ تمام پیغمبروں کی سنت ہے، ابھی بیٹھنا چاہیئے، چنانچہ کھانا آیا، لوگ دعوت کھا کے رخصت ہوتے، جب مہر کی رقم ام حبیبہؓ کو ملی تو انہوں نے پچاس دینار ابرہہ کو دیئے لیکن اس نے اس رقم کو اس کنگن کے ساتھ جو پہلے دیئے گئے تھے، یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ بادشاہ نے مجھ کو منع کر دیا ہے، دوسرے دن ان کی خدمت میں عود، زعفران، عنبر وغیرہ لے کر آئی جن کو وہ اپنے ساتھ رسول اللہ کی خدمت میں لائیں، جب نکاح کے تمام رسومات ادا ہو گئے تو نجاشی نے ان کو شرجیلؓ بن حسنہ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں روانہ کیا۔

ام حبیبہؓ نے ۴۴ھ میں وفات[3] پائی اور مدینہ میں دفن ہوئیں۔

حضرت میمونہؓ

میمونہ نام، باپ کا نام حارث اور ماں کا نام ہند تھا، پہلے مسعود بن عمرو بن عمیر الثقفی کے نکاح میں تھیں مسعود نے طلاق دے دی تو ابورہم بن عبدالعزیٰ نے نکاح کر لیا، ابورہم کے انتقال کے بعد رسول اللہ کے نکاح میں آئیں، نکاح کے متعلق مختلف روایتیں ہیں، ایک روایت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو ہبہ کیا، دوسری روایت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے اپنے غلام ابورافع کو اوس بن خولی کے ساتھ وکیل بنا کر بھیجا اور انہوں نے ایجاب و قبول کیا، لیکن صحیح روایت یہ ہے کہ حضرت عباسؓ نے اس نکاح کی تحریک کی اور انہی نے نکاح پڑھایا۔

وفات یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ مقام سرف میں اُن کا نکاح ہوا تھا اور سرف ہی میں انہوں نے انتقال بھی کیا، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور قبر میں اتارا صحاح میں ہے کہ جب اُن کا جنازہ

---

[1] سال نکاح میں اختلاف ہے مشہور یہ ہے کہ ۶ھ میں نکاح ہوا لیکن بعض روایتوں میں ۷ھ بھی بیان کیا گیا ہے ممکن ہے کہ آنحضرتؐ نے عمرو بن امیہ الضمری کو بغرض نکاح بھیجا ہو اور ۷ھ میں نکاح پڑھایا گیا ہو اس میں بھی اختلاف ہے کہ نکاح کہاں ہوا اور کس نے پڑھایا لیکن صحیح یہ ہے کہ حبشہ میں نکاح ہوا اور نجاشی نے نکاح پڑھایا۔ [2] صحیح روایت یہی ہے لیکن اور بھی مختلف تعداد بیان کی گئی ہے بعض روایتوں میں نو سو دینار ہے بعضوں کے نزدیک چار ہزار دینار ہے ابوداؤد میں دینار کے بجائے چار ہزار درہم ہے زہری کی روایت میں چالیس اوقیہ کی تعداد کا ذکر ہے اس لئے اگر چاندی ہوگی تو اس کے سولہ سو درہم ہوتے ہیں۔ [3] بعضوں نے سال وفات ۴۲ھ لکھا ہے، ابن ابی خیثمہ کے نزدیک ان کا سال وفات ۵۹ھ ہے بعض لوگوں نے ۵۰ھ اور بعضوں نے ۵۵ھ بیان کیا ہے ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ دمشق میں مدفون ہوئیں۔

اٹھایا گیا تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کہا یہ رسول اللہ کی بی بی ہیں، جنازہ کو زیادہ حرکت نہ دو، باادب آہستہ لے چلو، سالِ وفات کے متعلق اگرچہ اختلاف ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ انہوں نے ۵۱ھ میں وفات پائی۔

حضرت صفیہؓ

صفیہ اصل نام نہ تھا، زرقانی نے لکھا ہے کہ عرب میں مالِ غنیمت کا جو بہترین حصہ امام یا بادشاہ کے لئے مخصوص ہو جاتا تھا اس کو صفیہ کہتے تھے، چونکہ جنگِ خیبر میں اسی طریقہ کے موافق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئی تھیں اس لئے صفیہ کے نام سے مشہور ہو گئیں ورنہ اصلی نام زینبؓ تھا، باپ کا نام حیی بن اخطب اور ماں کا نام ضرہ تھا، حضرت صفیہؓ کو باپ اور ماں دونوں کی جانب سے سیادت حاصل تھی، باپ قبیلہ بنو النضیر کا سردار اور ماں قریظہ کے رئیس کی بیٹی تھیں، حضرت صفیہؓ کی شادی پہلے سلام بن مشکم القرظی سے ہوئی تھی، ابن مشکم نے طلاق دی تو کنانہ بن ابی الحقیق کے نکاح میں آئیں، کنانہ جنگِ خیبر میں مقتول ہوا، حضرت صفیہؓ کے باپ اور بھائی بھی کام آئے اور خود بھی گرفتار ہوئیں، جب خیبر کے تمام قیدی جمع کئے گئے تو دحیہ کلبیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک لونڈی کی درخواست کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انتخاب کرنے کی اجازت دی، انہوں نے حضرت صفیہ کو منتخب کیا، لیکن ایک صحابی نے آپ کی خدمت میں آکر عرض کی کہ آپ نے رئیسہ بنو نضیر و قریظہ کو دحیہ کو دے دیا، وہ تو صرف آپ کے قابل ہے، آپ نے حکم دیا کہ دحیہؓ اس عورت کے ساتھ حاضر ہوں، وہ صفیہؓ کو لے کر آئے تو آپ نے ان کو دوسری لونڈی عنایت فرمائی اور صفیہؓ کو آزاد کر کے نکاح کر لیا، خیبر سے روانہ ہوتے تو مقام صہبا میں رسمِ عروسی ادا کی اور جو کچھ سامان لوگوں کے پاس تھا اس کو جمع کر کے دعوتِ ولیمہ فرمائی، وہاں سے روانہ ہوتے تو آپ نے ان کو خود اپنے اونٹ پر سوار کر لیا اور اپنے عبا سے ان پر پردہ کیا، یہ گویا اس بات کا اعلان تھا کہ وہ ازواجِ مطہراتؓ میں داخل ہو گئیں۔

حضرت صفیہؓ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت محبت تھی اور ہر موقع پر ان کی دلجوئی فرماتے تھے، ایک بار آپ سفر میں تھے، ازواجِ مطہراتؓ بھی ساتھ تھیں، حضرت صفیہؓ کا اونٹ سوء اتفاق سے بیمار ہو گیا، حضرت زینبؓ کے پاس ضرورت سے زیادہ اونٹ تھے، آپ نے ان سے کہا کہ ایک اونٹ صفیہؓ کو دے دو، انہوں نے کہا کہ کیا میں اس یہودیہ کو اپنا اونٹ دوں؟ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے اس قدر ناراض ہوئے کہ دو مہینے تک اُن کے پاس نہ گئے۔ ایک بار آپ حضرت صفیہؓ کے پاس تشریف لے گئے، دیکھا کہ وہ رو رہی ہیں آپ نے رونے کی وجہ پوچھی۔ انہوں نے کہا کہ عائشہؓ اور زینبؓ کہتی ہیں کہ ہم تمام ازواج میں افضل ہیں، ہم آپ کی زوجہ ہونے کے ساتھ آپ کی چچازاد بہن بھی ہیں، آپ نے فرمایا، تم نے یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ ہارونؑ میرے باپ، موسیٰؑ میرے چچا اور محمدؐ میرے شوہر ہیں، اس لئے تم لوگ کیونکر مجھ سے افضل ہو سکتی ہو؟

حضرت صفیہؓ نے ۵۰ھ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئیں۔

*

اولاد

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کی تعداد میں سخت اختلاف ہے، متفق علیہ روایت یہ ہے کہ آپ کے چھ اولادیں تھیں، قاسمؓ، ابراہیمؓ، زینبؓ، رقیہؓ، ام کلثومؓ، فاطمہؓ۔ ان تمام لڑکیوں نے اسلام کا زمانہ پایا اور ہجرت سے شرف اندوز ہوئیں۔ لیکن ابن اسحاق نے دو صاحبزادوں کا نام اور لیا ہے، طاہر، طیب۔ اس بنا پر اولاد مذکور کی تعداد لڑکیوں کے برابر ہو جاتی ہے۔ اس بارہ میں تمام اقوال کے جمع کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کے بارہ ۱۲ اولادیں تھیں جن میں آٹھ لڑکے اور چار لڑکیاں تھیں، لڑکیوں کی تعداد میں کسی قسم کا اختلاف نہیں البتہ صاحبزادوں کی تعداد میں سخت اختلاف ہے، مجموعی تعداد آٹھ تک پہنچتی ہے، جن میں قاسم اور ابراہیم پر تمام راویوں کا اتفاق ہے، حضرت ابراہیمؑ ماریہ قبطیہؓ سے اور بقیہ حضرت خدیجہؓ سے تھیں[1]۔

حضرت قاسمؓ

آپ کی اولاد میں سب سے پہلے حضرت قاسم پیدا ہوئے اور غالباً نبوت سے گیارہ برس پہلے پیدا ہوئے ہوں گے، مجاہد کے نزدیک یہ صرف سات دن زندہ رہے، ابن سعدؒ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دو سال تک زندہ رہے، ابن فارس نے لکھا ہے کہ فن تمیز کو پہنچ گئے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں جس طرح یہ سب سے پہلے پیدا ہوئے تھے اسی طرح سب سے پہلے انتقال بھی کیا۔ عام روایت یہ ہے کہ قبل بعثت وفات پائی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کنیت ابوالقاسم انہی کے انتساب سے ہے، آپ اس کنیت کو بہت پسند فرماتے تھے، صحابہ بھی جب آپ کا محبت سے نام لیتے تو ابوالقاسم ہی کہتے، ایک دن آپ بازار سے گزر رہے تھے کہ پیچھے سے کسی نے یا اباالقاسم کہہ کر آواز دی، آپ نے مڑ کر دیکھا تو اس نے کہا یا رسول اللہ میں اسی نام کے ایک اور شخص کو پکار رہا ہوں، رفعِ اشتباہ کے لئے پھر آپ نے منع فرمایا کہ کوئی یہ کنیت نہ رکھے۔

حضرت زینبؓ

اہل سیر کا اتفاق ہے کہ لڑکیوں میں سب سے بڑی تھیں، زبیر بن بکار کا قول ہے کہ حضرت قاسمؓ کے بعد پیدا ہوئیں، لیکن ابن کلبی کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے پہلی اولاد حضرت زینبؓ ہی ہیں، بعثت سے دس برس پہلے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۳۰ سال کی تھی پیدا ہوئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ معظمہ سے ہجرت فرمائی تو اہل و عیال مکہ میں رہ گئے تھے، حضرت زینبؓ کی شادی ان کے خالہ زاد بھائی ابوالعاص بن ربیع بن لقیط سے ہوئی، غزوۂ بدر میں ابوالعاص گرفتار ہو گئے، جب یہ رہا کئے گئے تو ان سے وعدہ لیا گیا کہ مکہ جا کر حضرت زینبؓ کو بھیج دیں گے، ابوالعاص نے مکہ جا کر اپنے بھائی کنانہ کے ساتھ ان کو مدینہ کی طرف روانہ کیا، چونکہ کفار کے تعرض کا خوف تھا، کنانہ نے ہتھیار ساتھ لے لئے تھے، مقام ذی طوی میں پہنچے تو کفار قریش کے چند آدمیوں نے تعاقب

[1] زرقانی ج ۳ ص ۲۳

کیا، ہبار بن اسود نے حضرت زینبؓ کو نیزے سے زمین پر گرادیا، وہ حاملہ تھیں، حمل ساقط ہوگیا، کنانہ نے ترکش سے تیر نکالے اور کہا کہ اب اگر کوئی قریب آیا تو ان تیروں کا نشانہ ہوگا، لوگ ہٹ گئے تو ابوسفیان سردارانِ قریش کے ساتھ آیا اور کہا، تیر روک لو ہم کو کچھ گفتگو کرنی ہے، انہوں نے تیر ترکش میں ڈال دیئے، ابوسفیان نے کہا محمدؐ کے ہاتھ سے جو مصیبتیں پہنچی ہیں تم کو معلوم ہیں، اب اگر تم علانیہ ان کی لڑکی کو ہمارے قبضہ سے نکال لے گئے تو لوگ کہیں گے کہ ہماری کمزوری ہے، ہم کو زینبؓ کے روکنے کی ضرورت نہیں، جب شور و ہنگامہ کم ہوجائے اس وقت چوری چھپے لے جانا، کنانہ نے یہ رائے تسلیم کی اور چند روز کے بعد ان کو رات کے وقت لے کر روانہ ہوئے، زیدؓ بن حارثہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے بھیج دیا تھا وہ بطن یاجج میں تھے، کنانہ نے زینبؓ کو ان کے حوالہ کیا وہ ان کو لے کر روانہ ہوگئے۔

حضرت زینبؓ مدینہ میں آئیں اپنے شوہر ابوالعاص کو حالتِ شرک میں چھوڑا، ابوالعاص دوبارہ ایک سریہ میں گرفتار ہوئے، اس وقت بھی حضرت زینبؓ نے ان کو پناہ دی، مکہ جاکر انہوں نے لوگوں کی امانتیں حوالہ کیں اور اسلام لائے، اسلام لانے کے بعد ہجرت کرکے مدینہ آئے، حضرت زینبؓ نے ان کو حالتِ شرک میں چھوڑا تھا، اس لئے دونوں میں باہم تفریق ہوگئی تھی، وہ مدینہ آئے تو حضرت زینبؓ دوبارہ ان کے نکاح میں آئیں۔ ترمذی وغیرہ میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ کوئی جدید نکاح نہیں ہوا، لیکن دوسری روایت میں جدید نکاح کی تصریح ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ اگرچہ اسناد کے لحاظ سے دوسری روایت پر ترجیح ہے لیکن فقہا نے دوسری روایت پر عمل کیا ہے اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی یہ تاویل کی ہے کہ نکاح جدید کے مہر اور شرائط وغیرہ میں کسی قسم کا تغیر نہ ہوا ہوگا، اس لئے حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس کو نکاح اول سے تعبیر کیا ورنہ بعد تفریق نکاح ثانی ضروری ہے۔

ابوالعاص نے حضرت زینبؓ کے ساتھ نہایت شریفانہ برتاؤ کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے شریفانہ تعلقات کی تعریف کی، نکاح جدید کے بعد حضرت زینبؓ بہت کم زندہ رہیں، ۸ھ یا ۷ھ (باختلاف روایت) ابوالعاص اسلام لائے تھے اور اس لئے ۸ھ میں حضرت زینبؓ نے انتقال کیا۔ ام ایمنؓ، حضرت سودہؓ بنت زمعہ اور ام سلمہؓ نے غسل دیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ جنازہ پڑھائی، ابوالعاصؓ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر میں اتارا، حضرت زینبؓ نے دو اولاد چھوڑی امامہ اور علی۔ علی کی نسبت ایک روایت ہے کہ بچپن میں وفات پائی لیکن عام روایت یہ ہے کہ سن رشد کو پہنچے، ابن عساکر نے لکھا ہے کہ یرموک کے معرکہ میں شہادت پائی۔

امامہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت محبت تھی، آپؐ ان کو اوقاتِ نماز میں بھی جدا نہیں کرتے تھے، صحاح میں ہے کہ آپؐ ان کو کاندھے پر رکھ کر نماز پڑھتے تھے، جب رکوع میں جاتے تو دوش مبارک سے اتار دیتے جب سجدہ سے سر اٹھاتے تو پھر سوار کرلیتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک مرتبہ کسی نے کچھ چیزیں

۱؎ اصابہ میں ہے کہ ابوالعاص قریش کے ایک قافلہ کے ساتھ جمادی الاول ۶ھ میں روانہ ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید ابن حارثہ کو، سواروں کے ساتھ بھیجا، مقام عیص میں قافلہ ملا، کچھ لوگ گرفتار کئے گئے اور اسباب لوٹ میں آیا ان ہی میں ابوالعاص تھے، ابوالعاص آئے تو حضرت زینبؓ نے ان کو پناہ دی اور ان کی سفارش سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا مال واپس کردیا۔

ہدیے میں بھیجیں، جن میں ایک زریں ہار بھی تھا، امامہ ایک گوشہ میں کھیل رہی تھیں، آپؐ نے فرمایا، میں اس کو اپنی محبوب ترین اہل کو دوں گا۔ ازواج نے سمجھا کہ یہ شرف حضرت عائشہؓ کو حاصل ہوگا، لیکن آپؐ نے امامہ کو بلا کر وہ ہار خود ان کے گلے میں ڈال دیا۔ ابوالعاصؓ نے حضرت زبیرؓ بن عوام کو امامہ کے نکاح کی وصیت کی تھی، حضرت فاطمہؓ کا انتقال ہوا تو انھوں نے حضرت علیؓ سے ان کا نکاح کر دیا، حضرت علیؓ نے شہادت پائی تو مغیرہ کو وصیت کر گئے کہ امامہ سے نکاح کرلیں، مغیرہ نے نکاح کیا اور ان سے ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام یحییٰ تھا، لیکن بعض روایتوں میں ہے کہ امامہ کے کوئی اولاد نہیں ہوئی، امامہ نے مغیرہ کے یہاں وفات پائی۔

حضرت رقیہؓ

جرجانی نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لڑکیوں میں سب سے چھوٹی تھیں، لیکن مشہور روایت یہ ہے کہ حضرت زینبؓ کے بعد ۳۳ سنہ قبل نبوت میں پیدا ہوئیں، پہلے ابولہب کے بیٹے عتبہ سے شادی ہوئی۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ یہ شادی قبل نبوت ہوئی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری صاحبزادی ام کلثومؓ کی شادی بھی ابولہب کے دوسرے لڑکے عتیبہ سے ہوئی تھی، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور آپؐ نے دعوتِ اسلام کا اظہار کیا، ابولہب نے بیٹوں کو جمع کرکے کہا اگر تم محمدؐ کی بیٹیوں سے علیحدگی اختیار نہیں کرتے تو تمہارے ساتھ میرا سونا بیٹھنا حرام ہے، دونوں فرزندوں نے باپ کے حکم کی تعمیل کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت رقیہؓ کی شادی حضرت عثمانؓ سے کردی۔

دولابی نے لکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے ساتھ ان کا نکاح زمانہ جاہلیت میں ہوا، لیکن خود ایک روایت حضرت عثمانؓ سے مروی ہے جس میں زمانۂ اسلام کی تصریح ہے، نکاح کے بعد حضرت عثمانؓ نے حبش کی طرف ہجرت کی، حضرت رقیہؓ بھی ساتھ گئیں، مدت تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا کچھ حال معلوم نہ ہوا، ایک عورت نے آکر خبر دی کہ میں نے ان دونوں کو دیکھا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا دی اور فرمایا کہ ابراہیمؑ اور لوطؑ کے بعد عثمانؓ پہلے شخص ہیں جنھوں نے بی بی کو لے کر ہجرت کی ہے۔

حبش میں حضرت رقیہؓ کے ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام عبداللہ تھا لیکن صرف ۲ سال زندہ رہا، حضرت عثمانؓ حبش سے مکہ کو واپس آئے اور وہاں سے مدینہ کی طرف ہجرت کی، حضرت رقیہؓ مدینہ میں آکر بیمار ہوئیں، یہ غزوۂ بدر کا زمانہ تھا حضرت عثمانؓ ان کی تیمارداری کی وجہ سے شریک جہاد نہ ہوسکے، عین اسی دن جس روز زیدؓ بن حارثہ نے مدینہ آکر فتح کا مژدہ سنایا وفات پائی، غزوۂ بدر کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے جنازہ میں شریک نہ ہوسکے۔

حضرت اُمِ کلثومؓ

کنیت ہی کے نام سے مشہور ہیں، ۳ھ میں جو غزوۂ بدر کا سال تھا جب حضرت رقیہؓ کا انتقال ہوا تو ربیع الاول میں حضرت عثمانؓ نے حضرت ام کلثومؓ کے ساتھ نکاح کرلیا، بخاری میں ہے کہ جب حضرت حفصہؓ بیوہ

ہوئیں تو حضرت عمرؓ نے حضرت عثمانؓ کے ساتھ نکاح کا پیغام دیا، حضرت عثمانؓ نے تامل کیا، لیکن دوسری روایتوں میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر ہوئی تو آپ نے حضرت عمرؓ سے کہا میں تم کو عثمانؓ سے بہتر شخص کا پتہ دیتا ہوں اور عثمانؓ کے لئے تم سے بہتر شخص ڈھونڈتا ہوں، تم اپنی لڑکی کی شادی مجھ سے کر دو اور میں اپنی لڑکی کی شادی عثمانؓ سے کر دیتا ہوں۔ بہرحال نکاح ہوا اور نکاح کے بعد حضرت ام کلثومؓ چھ برس تک حضرت عثمانؓ کے ساتھ رہیں، شعبان ۹؁ھ میں انتقال کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جنازہ پڑھائی، اور حضرت علیؓ، حضرت فضل بن عباسؓ، حضرت اسامہ بن زیدؓ نے قبر میں اتارا۔

حضرت فاطمہ زہراؓ

فاطمہ نام، زہرا لقب، سن ولادت میں اختلاف ہے، ایک روایت ہے کہ ۱؁ بعثت میں پیدا ہوئیں، ابن اسحٰق نے لکھا ہے کہ ابراہیم کے علاوہ آپ کی تمام اولاد قبل نبوت پیدا ہوئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت چالیس سال کی عمر میں ہوئی تھی، اس بنا پر بعضوں نے دونوں روایتوں میں تطبیق دی ہے کہ ۱؁ بعثت کے آغاز میں حضرت فاطمہؓ پیدا ہوئی ہوں گی اور چونکہ دونوں کی مدت میں بہت فاصلہ ہے اس لئے یہ اختلاف روایت ہو گیا ہوگا۔ ابن جوزی نے لکھا ہے کہ بعثت سے پانچ برس پہلے جب خانہ کعبہ کی تعمیر ہو رہی تھی، پیدا ہوئیں۔ بعض روایتوں میں ہے کہ نبوت سے تقریباً ایک سال پیشتر پیدا ہوئیں،

حضرت فاطمہؓ، اگر ان کا سال ولادت ۱؁ بعثت صحیح تسلیم کر لیا جائے، جب پندرہ سال ساڑھے پانچ مہینے کی ہوئی تو ۲؁ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کے ساتھ نکاح کر دیا۔ اس وقت حضرت علیؓ کا سن ۲۱ برس پانچ مہینے کا تھا[1]، حضرت فاطمہؓ سے عقد کی درخواست سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ اور ان کے بعد حضرت عمرؓ نے کی تھی، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ جواب نہیں دیا، حضرت علیؓ نے خواہش کی تو فرمایا، تمہارے پاس مہر ادا کرنے کو کچھ ہے؟ بولے ایک گھوڑا اور زرہ کے سوا کچھ نہیں، آپ نے فرمایا گھوڑا تو لڑائی کے لئے ضروری ہے، زرہ فروخت کر ڈالو، حضرت عثمانؓ نے ۴۸۰ درہم پر خرید لی اور حضرت علیؓ نے قیمت لاکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ڈال دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بلالؓ کو حکم دیا کہ بازار سے خوشبو لائیں، عقد ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہیز میں ایک پلنگ اور ایک بستر دیا، اصابہ میں لکھا ہے کہ آپ نے ایک چادر، دو چکیاں اور ایک مشک بھی دی اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہی دو چیزیں عمر بھر ان کی رفیق رہیں۔

نکاح کے بعد رسم عروسی کا وقت آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے کہا کہ ایک مکان لے لیں، چنانچہ حارث بن النعمان کا مکان ملا اور حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کے ساتھ اس میں قیام کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے تعلقات میں خوشگواری پیدا کرنے کی کوشش فرماتے تھے، چنانچہ جب حضرت

[1] حضرت علیؓ کے متعلق ایک روایت ہے کہ آٹھ برس کی عمر میں اسلام لائے، اس کی تعیین اس روایت کی بنا پر ہے لیکن قول راجح یہ ہے کہ وہ دس سال کی عمر میں مشرف باسلام ہوئے، اس روایت کی رو سے ان کا سن ۲۴ سال ڈیڑھ مہینہ کا تھا۔

علیؓ اور حضرت فاطمہؓ میں کبھی کبھی خانگی معاملات کے متعلق رنجش ہو جاتی تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دونوں میں صلح کرا دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ آپ گھر میں تشریف لے گئے اور صفائی کرا دی، گھر سے مسرور نکلے لوگوں نے پوچھا آپ گھر میں گئے تھے تو اور حالت تھی، اب آپ اس قدر خوش کیوں ہیں؟ فرمایا۔ میں نے ان دو شخصوں میں مصالحت کرا دی جو مجھ کو محبوب ہیں۔

ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے ان پر کچھ سختی کی، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایت لے کر چلیں پیچھے پیچھے حضرت علیؓ بھی آئے، حضرت فاطمہؓ نے شکایت کی، آپ نے فرمایا بیٹی! تم کو خود سمجھنا چاہیئے کہ کون شوہر اپنی بی بی کے پاس خاموش چلا آتا ہے، حضرت علیؓ پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ انہوں نے حضرت فاطمہؓ سے کہا، اب میں تمہارے خلاف مزاج کوئی بات نہ کروں گا۔

ایک دفعہ حضرت علیؓ نے ایک دوسرا نکاح کرنا چاہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو سخت برہم ہوئے، آپ نے مسجد میں خطبہ دیا، اس میں اپنی ناراضی ظاہر کی۔ فرمایا، میری لڑکی میرا جگر گوشہ ہے جس نے اس کو دکھ پہنچے گا مجھے بھی اذیت ہوگی، چنانچہ حضرت علیؓ اس ارادہ سے باز آگئے۔ اور حضرت فاطمہؓ کی زندگی تک پھر کبھی دوسرا نکاح نہیں کیا[1]۔

حضرت فاطمہؓ کے پانچ اولادیں ہوئیں، حسنؓ، حسینؓ، محسنؓ، ام کلثومؓ، زینبؓ۔ محسنؓ نے بچپن ہی میں انتقال کیا حضرت زینبؓ، امام حسنؓ، امام حسینؓ اور ام کلثومؓ اہم واقعات کے لحاظ سے تاریخ اسلام میں مشہور ہیں۔

حضرت فاطمہؓ نے رمضان ۱۱؁ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے چھ ماہ بعد وفات پائی، اس وقت ان کا سن ۲۹ سال تھا۔ سن کی تعیین میں سخت اختلاف ہے، بعضوں نے ۲۴ سال، بعضوں نے ۲۵ سال اور بعضوں نے ۳۰ سال بتایا ہے لیکن زرقانی نے لکھا ہے کہ پہلی روایت زیادہ صحیح ہے، اگر ۴۱؁ کو سال ولادت قرار دیا جائے تو اس وقت ان کا یہ سن نہیں ہو سکتا تھا، البتہ اگر ۲۴ سال کی عمر تسلیم کی جائے تو اس سن کو سال ولادت قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن اگر یہ روایت صحیح مان لی جائے کہ وہ پانچ برس قبل نبوت میں پیدا ہوئیں تو اس وقت ان کا سن ۲۹ سال کا ہو سکتا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے آخری اولاد ہیں۔ ذی الحجہ ۸؁ھ بمقام عالیہ جہاں ماریہ قبطیہؓ رہتی تھیں پیدا ہوئے، اس بنا پر لوگ عالیہ کو مشربۂ ابراہیم بھی کہنے لگے۔ ابورافع کی بی بی سلمیٰ نے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کی پھوپھی صفیہ کی لونڈی تھیں، دایہ گیری کی خدمت انجام دی، ابورافع نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو

[1] صحیح بخاری ذکر اصہار النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس میں بھی اختلاف ہے بعضوں نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صرف تین دن زندہ رہیں بعضوں نے چار مہینے بتایا ہے بعضوں کے نزدیک دو مہینے کے بعد انتقال ہوا، کسی نے ایک مہینہ کسی نے تین مہینے بعد اور بعضوں نے تین مہینے پانچ دن بعد لکھا ہے لیکن صحاح میں حضرت عائشہؓ کے ذریعہ سے چھ مہینے والی روایت مذکور ہے۔

ان کی ولادت کا مژدہ سنایا تو آپ نے اس کے صلہ میں ایک غلام عطا فرمایا، ساتویں دن عقیقہ ہوا، آپ نے بال کے برابر چاندی خیرات کی اور حضرت ابراہیمؑ کے نام پر نام رکھا، دودھ پلانے کے لئے تمام انصار نے خواہش کی لیکن آپ نے ان کو ام بردہ خولہ بنت زید الانصاری کے حوالہ کیا اور اس کے معاوضہ میں کھجور کے چند درخت دیئے، بخاری میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آپ نے یہ خدمت ام سیف کے متعلق کی، قاضی عیاضؒ نے لکھا ہے کہ ام سیف اور ام بردہ ایک ہی ہیں، یہ تاویل کچھ مستبعد نہیں، لیکن ان کے شوہر کا نام براء بن اوس بتایا جاتا ہے اور وہ ابوسیف کی کنیت کے ساتھ مشہور نہیں، ام سیف حوالی مدینہ میں رہتی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرطِ محبت سے وہاں جاتے، حضرت ابراہیمؑ کو گود میں لیتے اور چومتے، ام سیف کے شوہر لوہار تھے، اس لئے گھر دھوئیں سے بھرا رہتا تھا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باوجود نظافتِ طبع گوارا فرماتے۔

ابراہیمؑ نے ام سیف ہی کے یہاں انتقال کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے ساتھ تشریف لائے، نزع کی حالت تھی، گود میں اٹھا لیا، آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے کہا، یا رسول اللہ! آپ کی یہ حالت ہے، آپ نے فرمایا، یہ رحمت ہے۔

عرب کا خیال تھا کہ جب کوئی بڑا شخص مرجاتا ہے تو چاند میں گہن لگ جاتا ہے، اتفاق سے جس روز حضرت ابراہیمؑ نے وفات پائی، سورج میں گہن لگ گیا تھا، عام طور پر مشہور ہو گیا کہ یہ ان کی موت کا اثر ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو فرمایا، چاند اور سورج خدا کی نشانیاں ہیں، کسی کی موت سے ان میں گہن نہیں لگتا۔

چھوٹی سی چارپائی پر جنازہ اٹھایا گیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود نماز جنازہ پڑھائی، عثمانؓ بن مظعون کی قبر کے متصل دفن ہوئے، قبر میں فضل بن عباسؓ اور اسامہؓ نے اتارا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبر کے کنارے کھڑے تھے، قبر پر پانی چھڑکا گیا اور اس پر ایک امتیازی علامت قائم کی گئی۔

ابوداؤد اور بیہقی کی روایت کے موافق دو مہینے دس دن کی عمر پائی، ذی الحجہ ۸ھ میں پیدا ہوئے تھے اس روایت کی بنا پر ۹ھ میں انتقال ہوا۔ واقدی کے نزدیک ماہ ربیع الاول ۱۰ھ میں وفات کی، اس لحاظ سے تقریباً پندرہ مہینے زندہ رہے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ سولہ مہینے آٹھ دن کی عمر پائی۔ بعض لوگوں نے مدتِ حیات ایک برس دس ماہ چھ دن لکھی ہے لیکن صحاح میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ابراہیمؑ ۱۷ یا ۱۸ مہینے تک زندہ رہے۔



ازواجِ مطہرات کے ساتھ معاشرت

ازواجِ مطہراتؓ کی تعداد نو تک پہنچی تھی، ان میں عام اصولِ فطرت کے موافق ہر مزاج اور ہر طبیعت کی عورتیں تھیں باہم رشک اور منافست بھی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ ہمیشہ فقر و فاقہ سے بسر کرتے تھے، ان کی خورد و پوشش کا انتظام بھی خاطر خواہ نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے ان کو شکایت کا موقع ملتا تھا، ان تمام حالات کے باوجود آپ کی جبینِ خلق پر کبھی شکن نہیں پڑتی تھی، حضرت خدیجہؓ کے ساتھ آپ کو بے انتہا محبت تھی، جب وہ عقدِ نکاح میں آئیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ریعانِ شباب اور ان کا بڑھاپا تھا، تاہم آپ نے ان کی وفات تک کوئی شادی نہیں کی، وفات کے بعد بھی جب کبھی ان کا ذکر آجاتا تو جوشِ محبت سے بے تاب ہو جاتے تھے (تفصیل اوپر گزر چکی ہے)

حضرت خدیجہؓ کے بعد حضرت عائشہؓ ازواجِ مطہرات میں سب سے محبوب تر تھیں، لیکن محبت کے اسباب وہ نہ تھے جو عام انسانوں میں پائے جاتے ہیں، حسن صورت میں حضرت صفیہؓ ان سے بڑھ کر تھیں اور کم سن بھی تھیں دیگر ظاہری محاسن میں بھی دیگر ازواج ان سے کم نہ تھیں، لیکن حضرت عائشہؓ کی قابلیت، ذہانت، قوتِ اجتہاد، دقتِ نظر اور وسعتِ معلومات ایسے اوصاف تھے جو ان کی ترجیح کا اصلی سبب تھے۔

ایک دفعہ چند ازواجِ مطہراتؓ نے حضرت فاطمہ زہراؓ کو سفیر بنا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا جنابِ سیدہؓ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئیں، دستور کے موافق پہلے اذن طلب کیا، اجازت ملی تو سامنے آئیں اور عرض کی کہ ازواجِ مطہرات نے مجھ کو وکیل بنا کر بھیجا ہے کہ آپ ابوبکرؓ کی بیٹی کو ہم پر کیوں ترجیح دیتے ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، جانِ پدر! کیا تم اس کو نہیں چاہتیں جس کو میں چاہتا ہوں۔ جنابِ سیدہؓ کے لئے اتنا کافی تھا، واپس جا کر ازواجِ مطہرات سے کہا میں اس معاملہ میں دخل نہ دوں گی۔

اب اس خدمت (سفارت) کے لئے حضرت زینبؓ انتخاب کی گئیں، کیونکہ ازواج میں سے حضرت زینبؓ کو خصوصیت کے ساتھ حضرت عائشہؓ کی ہمسری کا دعویٰ تھا اس لئے وہی اس خدمت کے لئے زیادہ موزوں تھیں، انہوں نے یہ پیغام بڑی دلیری سے ادا کیا اور بڑے زور کے ساتھ یہ ثابت کرنا چاہا کہ حضرت عائشہؓ اس رتبہ کی مستحق نہیں ہیں، حضرت عائشہؓ چپ سن رہی تھیں اور رسول اللہ کے چہرہ کی طرف دیکھتی جاتی تھیں، حضرت زینبؓ جب تقریر کر چکیں تو مرضی پا کر کھڑی ہوئیں اور اس زور شور کے ساتھ تقریر کی کہ حضرت زینبؓ لاجواب ہو کر رہ گئیں، آنحضرتؐ نے فرمایا، کیوں نہ ہو ابوبکر کی بیٹی ہے۔[۱]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ شادی کرنے کے لئے عورت کا انتخاب چار اوصاف کی بنا پر ہو سکتا ہے، مال، نسب، حسن، دینداری، سو تم دیندار عورت[۲] تلاش کرو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر کام میں سب سے

---

[۱] یہ واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ بخاری اور دیگر احادیث کی کتابوں میں ہے، الفاظِ روایت سے بظاہر قیاس ہوتا ہے کہ دونوں فریق نے غرض نکتہ چینی اور ایک دوسرے کی کسرِ شان کی تھی، جیسا کہ عام طور پر سوکنیں باہم خانگی جھگڑوں میں کرتی ہیں لیکن یہ کم تر ہے حضرت عائشہؓ نے اپنی ترجیح کی وہ مسکت دلیلیں بیان کی ہوں گی جن کا جواب سکوت کے سوا کچھ نہ ہو سکتا ہوگا۔ [۲] کتاب النکاح بخاری شریف۔

مقدم جو چیز پیشِ نظر ہوتی تھی وہ دین ہوتا تھا اس لئے ازواج میں بھی وہی زیادہ منظورِ نظر ہوتی تھیں جن سے دین کی خدمت زیادہ ادا ہوسکتی تھی۔ ازواجِ مطہراتؓ کو باریابی کا زیادہ موقع ملتا تھا، وہ خلوت و جلوت کی شریکِ صحبت تھیں، اس لئے مذہبی احکام و مسائل کے علم و اطلاع کا بھی ان کو سب سے زیادہ موقع مل سکتا تھا لیکن ساتھ ہی اس کی ضرورت تھی کہ مسائل کے سمجھنے اور نکاتِ شریعت کی تہہ تک پہنچنے کی قابلیت جس قدر زیادہ ہوتی اسی قدر زیادہ تمتع اٹھا سکتا تھا، حضرت عائشہؓ مجتہدانہ دل و دماغ رکھتی تھیں اس لئے قربِ صحبت سے اس قدر فائدہ اٹھا سکیں کہ بڑے بڑے نازک اور دقیق مسائل میں وہ اکابر صحابہ سے مخالفت کرتی تھیں اور انصاف یہ ہے کہ طاعت است، اکثر مسئلوں میں ان کی فہم و دقتِ نظر کا پلہ بھاری نظر آتا ہے، چنانچہ اس کی کسی قدر تفصیل حضرت عائشہؓ کے حالات میں گزر چکی ہے۔

معمول تھا کہ ہر روز آپ تمام ازواجِ مطہرات کے گھروں میں جو پاس پاس تھے، تشریف لے جاتے ایک ایک کے پاس تھوڑی تھوڑی دیر ٹھہرتے، جب ان کا گھر آجاتا، جن کی باری ہوتی تو شب کو وہیں قیام فرماتے یہ ابوداؤد کی روایت ہے، زرقانی نے حضرت ام سلمہؓ کے حال میں لکھا ہے کہ عصر کا وقت ہوتا تھا اور ابتدا حضرت ام سلمہؓ سے ہوتی تھی، بعض روایتوں میں ہے کہ جن کی باری ہوتی تھی انہی کے گھر پر تمام ازواجِ مطہرات آجاتی تھیں اور دیر تک صحبت رہتی تھی، کچھ رات گئے سب رخصت ہوجاتی تھیں۔ اس سے ظاہر ہوگا کہ گو ازواج میں کبھی کبھی منافست کا اظہار ہوتا تھا لیکن دل صاف تھے اور باہم مل کر لطفِ صحبت اٹھاتی تھیں، آنحضرت کے شرفِ صحبت نے جس طرح ان آئینوں کو جلا دی تھی اس کا اندازہ افک کے واقعہ سے ہوسکتا ہے جس میں جناب عائشہؓ کو منافقین نے متہم کیا تھا، اس سے بڑھ کر حریفوں کے لئے انتقام کا کیا موقع مل سکتا تھا لیکن باوجود اس کے کہ غیر متعلق لوگ تہمت لگانے میں آلودہ ہوگئے تھے تاہم ازواجِ مطہرات کا دامن صاف رہا، حضرت عائشہؓ کی بڑی حریف حضرت زینبؓ تھیں لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے استفسار فرمایا تو انہوں نے کانوں پر ہاتھ رکھا کہ حاشا یہ محض تہمت ہے، حضرت عائشہؓ جب واقعہ افک کا ذکر کرتی تھیں تو ہمیشہ حضرت زینبؓ کی پاک باطنی کی شکر گزاری ظاہر کرتی تھیں، چنانچہ بخاری کی متعدد روایتوں میں تفصیلاً مذکور ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح ازواجِ مطہرات کی خاطر داری فرماتے اور ان کی نازک مزاجیاں برداشت کرتے تھے اس کا اندازہ ذیل کے واقعات سے ہوگا۔

ایک دفعہ ازواجِ مطہرات سفر میں تھیں، ساربان اونٹ کو تیز ہانکنے لگے۔ آپ نے فرمایا، دیکھنا یہ آبگینے (شیشے) ہیں۔

حضرت صفیہؓ کھانا نہایت عمدہ پکاتی تھیں، ایک دن انہوں نے کھانا پکا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا، آپ اس وقت حضرت عائشہؓ کے گھر میں تشریف رکھتے تھے، حضرت عائشہؓ نے خادم کے ہاتھ سے پیالہ چھین کر زمین پر دے مارا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیالے کے ٹکڑے چن چن کر یکجا کئے اور ان کو جوڑا پھر

دوسرا پیالہ منگوا کر واپس کیا۔

ایک دفعہ حضرت عائشہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے برہم ہوکر بلند آواز سے باتیں کر رہی تھیں، اتفاقاً حضرت ابوبکرؓ آگئے اور حضرت عائشہؓ کو پکڑ کر تھپڑ مارنا چاہا کہ تو رسول اللہ سے چلا کر بولتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیچ میں آگئے اور حضرت عائشہؓ کے آڑے آگئے، حضرت ابوبکرؓ غصہ میں بھرے ہوئے باہر چلے گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے کہا کیوں؟ کس طرح تم کو بچا لیا۔ چند روز کے بعد حضرت ابوبکرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے تو وہ حالت بدل چکی تھی، بولے کہ مجھ کو بھی صلح میں شریک کیجئے جیسا کہ اس موقع پر میں نے جنگ میں شرکت کی تھی، آپ نے فرمایا ہاں اور ہاں۔

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ تو مجھ سے جب ناراض ہوتی ہے تو میں سمجھ جاتا ہوں، بولیں کیونکر؟ ارشاد ہوا جب تو خوش رہتی ہے اور کسی بات پر قسم کھاتی ہوتی ہے تو یوں قسم کھاتی ہے محمد کے خدا کی قسم! اور جب ناراض ہوجاتی ہے تو کہتی ہے، ابراہیم کے خدا کی قسم! حضرت عائشہؓ نے کہا ہاں یا رسول اللہ میں صرف آپ کا نام چھوڑ دیتی ہوں۔

حضرت عائشہؓ شادی کے وقت بہت کم سن تھیں اور لڑکیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اتفاقاً آجاتے تو لڑکیاں بھاگ جاتیں، آپ ان کو بلا کر حضرت عائشہؓ کے پاس بھیج دیا کرتے۔

حبشی ایک چھوٹا سا نیزہ رکھتے ہیں جس کو حراب کہتے ہیں اور جس طرح ہمارے ملک میں پٹہ ہلاتے ہیں حبشی اس سے کھیلتے ہیں، ایک دفعہ عید کے دن حبشی یہ تماشا دکھا رہے تھے، حضرت عائشہؓ نے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آگے کھڑے ہوگئے، حضرت عائشہؓ دوش مبارک پر رخسارے رکھ کر تماشہ دیکھنے لگیں اور دیر تک دیکھتی رہیں، یہاں تک کہ آپ نے فرمایا کیوں ابھی تک تم سیر نہیں ہوئیں، بولیں نہیں، آپ چپ رہے، یہاں تک کہ خود تھک کر ہٹ گئیں۔

ایک دفعہ حضرت عائشہؓ گڑیوں سے کھیل رہی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باہر سے تشریف لاتے، گڑیوں میں ایک گھوڑا بھی تھا جس کے پر بھی تھے، آپ نے فرمایا یہ کیا ہے؟ بولیں کہ حضرت سلیمانؑ کے گھوڑوں کے پر بھی تھے آپ نے تبسم فرمایا۔ عوام میں مشہور ہے کہ پہلے گھوڑوں کے پر ہوتے تھے، حضرت سلیمانؑ نے اس بنا پر کہ گھوڑوں کی سیر میں ان کی نماز قضا ہوگئی تھی، پر کٹوا دیئے، اس وقت سے پر جاتے رہے لیکن نشان اب بھی باقی ہے حضرت عائشہؓ نے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

ایک دفعہ آپ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ آؤ تیز قدمی میں مقابلہ کریں، حضرت عائشہؓ اس وقت تک دبلی پتلی تھیں، آگے نکل گئیں جب سن زیادہ ہوا اور پرُ اندام ہوگئیں تو پھر مسابقت کی نوبت آئی، اب کے وہ پیچھے رہ گئیں آپ نے فرمایا یہ اس دن کا جواب ہے۔

---

۱ بخاری میں یہ روایت کتاب النکاح کے ذیل میں ہے لیکن ازواج کے نام نہیں، نسائی میں نام کی تصریح ہے لیکن روایت میں کسی قدر اختلاف ہے۔ ۲ ابوداؤد کتاب الادب باب ماجاء فی المزاح۔ ۳ صحیح مسلم۔ ۴ ایضاً۔ ۵ ابوداؤد کتاب الادب۔ ۶ ابوداؤد۔

ازواج مطہرات اور اہل وعیال کی سادہ زندگی

انسان بذاتِ خود فاقہ کشی کرسکتا ہے سخت سے سخت تکلیفیں اٹھا سکتا ہے، زخارفِ دنیوی کو کلیۃً چھوڑ سکتا ہے لیکن وہ اپنے اعزہ و اقربا بالخصوص عزیز ترین اولاد کو اس قسم کی سادہ اور متقشفانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور نہیں کرسکتا ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا میں جن لوگوں نے راہبانہ زندگی بسر کی ہے، انہوں نے اپنے آپ کو ہمیشہ اہل وعیال کے جھگڑوں سے الگ رکھا ہے، دنیا کی مذہبی تاریخ میں صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اس کلیہ کی ایک مستثنیٰ مثال ہے آپ کے ۹ بیبیاں تھیں جن میں بعض ناز و نعمت میں پلی تھیں، اکثر معزز گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں، اس لئے ان کا قدرتی میلان غذا ہائے لطیف اور لباس ہائے فاخرہ کی طرف ہوسکتا تھا، متعدد صغیر السن بچے تھے جن کو کھانے پہننے کی ہر خوشگوار اور خوشنما چیز اپنی طرف مائل کرسکتی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسا کہ اوپر کے واقعات سے معلوم ہوا ہوگا، اعزہ اولاد ازواج مطہرات کے ساتھ سخت محبت تھی، آپ نے رہبانیت کا بھی قلع قمع کردیا تھا اور فتوحات کی کثرت مدینہ میں مال و زر کے خزانے لٹا رہی تھی لیکن بایں ہمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کی طرح اُن کو بھی زخارفِ دنیوی کا خوگر نہیں بنایا، بلکہ ہر موقع پر روک ٹوک کی، اس بنا پر آپؐ کے تمام خاندان کی زندگی آپؐ کے اسوۂ حسنہ کا اعلیٰ ترین مظہر بن گئی۔

حضرت فاطمہؓ آپؐ کی محبوب ترین اولاد تھیں، لیکن انہوں نے آپؐ کی محبت سے کوئی دنیوی فائدہ نہیں اٹھایا ان کی عام خانگی زندگی یہ تھی کہ اس قدر چکی پیستی تھیں کہ ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے تھے، بار بار مشک میں پانی بھر بھر کر لانے سے سینے پر گٹے پڑ گئے تھے، گھر میں جھاڑو دیتے دیتے کپڑے چکٹ ہوجاتے تھے، چولہے کے پاس بیٹھتے بیٹھتے کپڑے دھوئیں سے سیاہ ہوجاتے تھے لیکن بایں ہمہ جب انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بار گھر کے کاروبار کیلئے ایک لونڈی مانگی اور ہاتھ کے چھالے دکھاتے تو آپؐ نے صاف انکار کردیا کہ یہ غرباء و یتامیٰ کا حق ہے[1]

ایک دفعہ حضرت فاطمہؓ کے پاس آتے، دیکھا کہ انہوں نے ناداری سے اس قدر چھوٹا دوپٹہ اوڑھا ہے کہ سر ڈھانکتی ہیں تو پاؤں کھل جاتے ہیں اور پاؤں چھپاتی ہیں تو سر برہنہ رہ جاتا ہے[2]۔

صرف یہی نہیں کہ خود عام طریقہ اظہار محبت کے خلاف ان کو آرائش و زیب و زینت کی کوئی چیز نہیں دیتے تھے بلکہ اس قسم کی جو چیزیں ان کو دوسرے ذرائع سے ملتی تھیں، ان کو بھی ناپسند فرماتے تھے، چنانچہ ایک دفعہ حضرت علیؓ نے ان کو سونے کا ایک ہار دیا، آپؐ کو معلوم ہوا تو فرمایا کیوں فاطمہؓ! کیا لوگوں سے یہ کہلوانا چاہتی ہو کہ رسول اللہ کی لڑکی آگ کا ہار پہنتی ہے، چنانچہ حضرت فاطمہؓ نے اس کو فوراً بیچ کر اس کی قیمت سے ایک غلام خرید لیا[3]۔

ایک دفعہ آپؐ کسی غزوہ سے تشریف لائے، حضرت فاطمہؓ نے بطور خیر مقدم کے گھر کے دروازوں پر پردہ لگایا اور امام حسن و امام حسین علیہما السلام کو چاندی کے کنگن پہنائے، آپؐ حسب معمول حضرت فاطمہؓ کے یہاں آئے تو اس دنیوی سازوسامان کو دیکھ کر واپس گئے، حضرت فاطمہؓ کو آپؐ کی ناپسندیدگی کا حال معلوم ہوا تو پردہ چاک کردیا اور بچوں کے ہاتھ سے کنگن نکال ڈالے، بچے آپؐ کی خدمت میں روتے ہوئے آئے۔ آپؐ نے فرمایا، یہ میرے اہل بیت ہیں، میں یہ نہیں چاہتا کہ

---

[1] ابوداؤد [2] ایضاً [3] نسائی کتاب الزینۃ۔

وہ ان زخارفِ دنیا سے آلودہ ہوں، اس کے بدلے فاطمہ کے لئے ایک عصب کا ہار اور ہاتھی دانت کے دو کنگن خرید لاؤ[1]۔ ازواجِ مطہرات کے ساتھ آپؐ کو جو محبت تھی اس کا اظہار کبھی دنیادارانہ طریقہ سے نہیں ہوتا تھا، چنانچہ ازواجِ مطہرات نے جب اچھے کھانے اور اچھے لباس کی خواہش ظاہر کی تو آپؐ نے ان سے ایلا کرلیا۔ تمام ازواج میں آپؐ کو حضرت عائشہؓ سب سے زیادہ محبوب تھیں، لیکن یہ محبت رنگین لباسوں اور سنہرے زیوروں کی صورت میں کبھی نہیں ظاہر ہوتی۔ تمام بیبیوں کا جو لباس تھا وہی حضرت عائشہؓ کا تھا چنانچہ وہ خود فرماتی ہیں۔

ما کانت لاحد انا الا ثوب واحد (بخاری ج۱ ص۴۵) ہم تمام بیبیوں کے پاس صرف ایک ایک جوڑا کپڑا تھا۔

اگر کبھی اس کے خلاف ان کے بدن پر دنیوی آرائش کے سروسامان نظر آتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو منع فرماتے۔ ایک مرتبہ انہوں نے سونے کے کنگن (دسکہ) پہنے، آپؐ نے فرمایا، اگر ورس کے کنگن زعفران سے رنگ کر پہنتیں تو بہتر ہوتا[2] تمام اہل وعیال وخانوادۂ نبوت کو ممانعت تھی کہ وہ پرتکلف و ریشمی لباس اور سونے کے زیور استعمال نہ کریں، آپ اُن سے فرمایا کرتے تھے کہ اگر تم کو اس کی تمنا ہے کہ یہ چیزیں جنت میں ملیں تو دنیا میں اُن کے پہننے سے پرہیز کرو۔

انتظام خانگی

اگرچہ ازواجِ مطہراتؓ کی تعداد ایک زمانہ میں ۹ تک پہنچ گئی تھی اور اس وجہ سے خانہ داری کے بہت سے بکھیڑے تھے تاہم آپؐ کو خود بہ نفس نفیس ان چیزوں سے سروکار نہ تھا، اپنی ذات کی نسبت تو التزام تھا کہ جو کچھ آتا دن کے دن صرف ہوجاتا، یہاں تک کہ اگر دے دلا کر کچھ باقی رہ جاتا تو آپؐ اس وقت تک گھر میں نہ جاتے جب تک وہ بھی کار خیر میں صرف نہ ہوجاتا، لیکن ازواجِ مطہراتؓ اور مہمانوں کے کھانے پینے اور رہنے سہنے کا انتظام حضرت بلالؓ کے متعلق تھا، ابوداؤد میں عبداللہ ہوزنی سے روایت ہے کہ میں نے حضرت بلالؓ سے پوچھا کہ رسول اللہ کے خانگی انتظام کا کیا حال تھا؟ انہوں نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام کاروبار میرے سپرد تھا اور آغاز سے اخیر زمانۂ وفات تک میرے ہاتھ میں تھا، معمول تھا کہ جب کوئی نادار مسلمان آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو مجھ کو ارشاد ہوتا، میں جا کر کہیں سے قرض لاتا اور اس کے کھانے کپڑے کا انتظام کردیتا۔

اہل وعیال کے مصارف کا انتظام

ازواجِ مطہراتؓ کے لئے یہ انتظام تھا کہ بنو نضیر کے نخلستان میں ان کا حصہ مقرر کردیا گیا تھا، وہ فروخت کردیا جاتا جو سال بھر کے مصارف کے لئے کافی ہوتا[3]۔ خیبر فتح ہوا تو ازواج کے لئے فی کس ۸۰ وسق کھجور اور ۲۰ وسق جو سالانہ مقرر ہوگیا۔ وسق ۶۰ صاع کا ہوتا ہے، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بعض ازواج نے جن میں حضرت عائشہؓ بھی تھیں پیداوار کے بدلے زمین لے لی[4]۔

---

[1] نسائی کتاب الزینۃ [2] جلد دوم باب فی الامام یقبل ہدایا المشرکین [3] بخاری ص۸۰۶ [4] بخاری کتاب المزارعہ جلد اول ص۳۱۳۔

★

تم المجلد الثانی من السیرۃ النبویۃ علی صاحبہا والصلوٰۃ والتحیۃ

اعلام بہ حیاۃ وسعی فی تنقیحہ شبہ نجم الدین السوانحی اذ لاح اراد العلوم